1

سالنامہ ۱۹۶۲ء

بیادگار چودھری برکت علی مرحوم

۱۹ ع ۶۲

سالنامے

ماہنامہ

ادبِ لطیف

مکتبہ اردو پبلشنگ ہاؤس

جلد: ۵۰
شمارہ: ۱

زرِ سالانہ دس روپے
بیرونِ ملک بارہ روپے

سالنامے کی قیمت: تین روپے

مینجنگ ایڈیٹر: چودھری افتخار علی
مرتب: میرزا ادیب

چودھری افتخار علی پرنٹر پبلشر نے اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ادب لطیف سے شائع کیا۔

سالنامہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

نثر

مقالات

افسانے

مزاحیہ

تمثیل

شاعری

غزل

نظم

پیرایۂ آغاز

ادبِ لطیف کے قارئین کرام کو نیا سال مبارک ہو!

ادب جہاں زندگی کی اعلیٰ، پاکیزہ اور سچی اقدار سے محبت کرنی سکھاتا ہے وہاں ذہنی مسرت کا سامان بھی اپنے دامن میں لے کر آتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ سالنامہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی مسرتوں میں اضافہ نہ کرے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری شبانہ روز محنتوں کا یہ حاصل اپنی غرض و غایت ضرور پوری کرے گا اور نتیجۃً ہم اور آپ ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو جائیں گے لیکن دوسرے کے ساتھ زیادہ خلوص، زیادہ تعاون سے پیش آئیں گے اور خوشگوار مستقبل کی تعمیر میں زیادہ سرگرمی سے حصّہ لیں گے!

ہم نئے سال کے آغاز پر اپنے تمام لکھنے والوں کا، اپنے تمام پڑھنے والوں کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان تمام لوگوں کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے ادبِ لطیف کے بنانے سنوارنے، پیش کرنے اور پھیلانے میں کسی نہ کسی حیثیت سے حصہ لیا ہے۔ ادبِ لطیف محض ہماری تگ و دو کا نتیجہ نہیں۔ اسے زندہ رکھنے کی کوششوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے نام پڑھنے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوتے مثلاً کتابت کرنے والے، چھاپنے والے، بلاک بنانے والے۔ اور وہ بھی جو رسالے کی کٹائی اور سلائی کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں اور ہم ان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں!

سالنامہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس کے محاسن و معائب کو خود سمجھ لیں گے۔ ہمیں اس معاملے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ترتیب کے سلسلے میں ایک آدھ بات ضرور عرض کریں گے اور وہ بھی محض اس بنا پر کہ فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے ایک غلط فہمی کا احتمال بروئے کار آسکتا ہے۔ اس لئے پیرایۂ آغاز میں ترتیبی پہلو کی طرف ایک واضح اشارہ کرنا ناگزیر ہے۔

افسانوں کے علاوہ سالنامے کے تمام مندرجات کو ہم نے عام ترتیب سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے وہ یوں کہ اہلِ قلم کے ناموں کو اہمیت دینے کی بجائے مشمولات کے زمانی تسلسل اور نفسیاتی کوائف کو اہمیت دی ہے۔ اور جب ترتیب کی یہ صورت ہوگی۔ تو لازماً بڑے اور چھوٹے کا امتیاز باقی نہیں رہے گا اور یہی چیز یہاں صورت پذیر ہوئی ہے! اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں افسانوں کی ترتیب اس سے مستثنیٰ ہے۔

بہرحال سالنامہ آپ کے پیش خدمت ہے اور ہم نئے خوابوں کی صورت گری میں آپ کے مخلصانہ تعاون کے متوقع ہیں:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم — بلائے گرمیٔ روز از جہاں بگردانیم

(غالبؔ)

مولوی عبدالحقؒ (مرحوم)

محسنِ تہذیبِ اسلامیہ ہند
محمد قلی قطب شاہ

(بابائے اُردو کی ایک غیر مطبوعہ تحریر)

جب سلطنتِ بہمنی میں انتہائی ضعف رونما ہوا اور حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ تو ہر صوبہ خود مختار ہو گیا۔ سلطنتِ بہمنی کی بجائے پانچ نئی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ نظام شاہیہ احمد نگر میں۔ عادل شاہیہ بیجاپور میں۔ عماد شاہیہ برار میں۔ برید شاہیہ بیدر میں اور قطب شاہیہ گولکنڈے میں۔

سلطنتِ بہمنی کے تاجدار محمود شاہ ثانی کے درباری اُمرا میں ایک امیر سلطان قلی تھا۔ جو ترکی شاہی قبیلہ قراقزنیلو کا رکن تھا۔ جب ایک دوسرے ترکی قبیلہ نے اس خاندان کو جو بغداد میں برسرِ حکومت تھا بے دخل کر دیا تو سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ دکن آگیا۔ اور محمود شاہ ثانی کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہو گیا اور شجاعت و ذہانت کی بدولت ابتدائے عمر ہی میں خطابِ قطب الملک اور صوبہ داریٔ تلنگانہ سے سرفراز ہوا۔ محمود شاہ کی وفات کے بعد سلطان قلی نے قطب شاہ کا لقب اختیار کیا اور گولکنڈہ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

محمد قلی بانیٔ سلطنت کا چوتھا جانشین یا قطب شاہی خاندان کا پانچواں فرمانروا تھا۔ اپنے باپ ابراہیم قلی کی وفات کے بعد ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر تخمیناً چودہ سال سات ماہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ ہندوستان میں اکبر کی شاہنشاہی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ محمد قلی کے زمانے میں دکن کی سلطنت کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

تالی کوٹ کی لڑائی کے بعد مسلمان سلطنتوں میں باہمی نفاق و اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ نظام شاہی اور عادل شاہی حکومتیں برسرِ جنگ تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ نے نظام شاہیوں کی مدد کو اپنی فوج بھیجی تھی۔ اسی اثنا میں بیجاپور کے علی عادل شاہ اور گولکنڈے کے ابراہیم قلی کا انتقال ہو گیا۔ محمد قلی کو تخت نشین ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ ابراہیم عادل شاہ اور محمد قلی قطب شاہ میں صلح ہو گئی۔ اور فوجیں اپنے اپنے صدر مقام کو واپس چلی گئیں۔ اس کے چند ہی سال بعد ۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) میں محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند بی بی کا عقد ابراہیم عادل شاہ سے ہو گیا۔ اس سے دونوں خاندانوں کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو گئے اور محمد قلی کو کسی قدر اطمینان سے ملک میں رفاہِ عام کے کاموں کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس نے مال گزاری میں کچھ اصلاحیں کیں اور محصولِ اجناس جو گزشتہ سلاطین کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ معاف کر دیا۔

اُسے عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے جابجا مدرسے مسجدیں عاشور خانے، شفاخانے تعمیر کیے اور مسافروں اور راہ گیروں کی آسائش کے لئے کنوئیں بنوائے اور لنگر خانے جاری کئے۔ لیکن اس کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ شہر حیدر آباد کی بنا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے۔ ان دنوں گولکنڈے کی آب و ہوا کی خرابی سے لوگ متنفر ہو گئے تھے۔ اس لئے قطب شاہ نے بلدۂ مذکور سے چار کوس کے فاصلے پر ایک نہایت شاندار شہر بسایا۔ اس کا نام اس نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر رکھا۔ بعد میں یہ نام بدل کر حیدر آباد کر دیا اور اسی نام سے اب تک مشہور ہے۔" شہر کے وسط میں چار مینار کی بنیاد رکھی۔ بلدۂ حیدر آباد کی یہ عمارت بہت عالیشان اور خوبصورت ہے۔ اس کے علاوہ اس نے متعدد عالی شان محلات تعمیر کئے۔ ان میں

دادمحل (چار منزلہ) دادمحل (ہشت منزلہ) محل کوہ طور، باغ محمد شاہی حیدر محل، جنان محل، صحن محل کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں۔ یہ عمارتیں زیادہ تر موسلندی کے کنارے تعمیر ہوئی تھیں۔ متواتر طغیانیوں نے ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔

اس کے عہد میں علم کا بھی خاصا چرچا تھا خصوصاً شاعروں کی بہت قدر تھی۔ اس کے درباری شاعروں میں وجہی اور غواصی خاص طور پر بہت مشہور ہیں۔ ان کا کلام انجمن ترقی اُردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔ بادشاہ خود بہت بڑا شاعر تھا۔ اس کا کلیات جو میرے زیرِ مطالعہ رہا ہے اور جس پر میں نے تبصرہ لکھا تھا۔ بہت ضخیم ہے۔ اور تقریباً ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ خاص شاہی کتب خانہ کا ہے۔ سرورق پر اس کے جانشین محمد قطب شاہ کی مہر ثبت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ فتح گولکنڈہ کے بعد یہ کلیات بعض دوسرے مالِ غنیمت کے ساتھ دلی چلا گیا اور وہاں داخلِ کتب خانۂ شاہی ہوگیا۔ اول صفحہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: "غزلیات محمد قلی قطب الملک کہ مشتمل بر اشعار فارسی و دکنی از اموال عبداللہ قطب الملک در حیدرآباد داخل کتب خانہ سرکار شد"۔ اس شانِ تحریر سے صاف ٹپکتا ہے۔ کہ یہ ملازمانِ شہنشاہ دہلی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ افسوس یہ نادر اور بے بہا نسخہ اب دسترس سے باہر ہے۔ اسے حضور نظام عثمان خاں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے مع اور نوادر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ جو ان کے محل کے کسی کونے میں پڑا ہوگا۔ محمد قلی نے علاوہ اُردو کے فارسی اور تلنگی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس کلیات پر ایک منظوم دیباچہ لکھا ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ نے پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ اس کی کتابت کا سنہ قطب شاہ نے اپنی تحریر میں ۱۰۲۰ھ بتایا ہے۔ حال میں اس کا ایک اور دیوان نواب سالار جنگ کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ جو اب شائع ہو گیا ہے۔ اس دیوان میں محمد قلی نے اپنا تخلص "معانی" لکھا ہے۔

محمد قلی نے اپنی شاعری کو صرف غزل اور قصیدے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے، مثلاً متعدد مثنویاں پھلوں اور میووں پر ہیں۔ ایک مثنوی سبزی ترکاری پر ہے۔ ایک دوسری شکاری پرندوں کے بیان میں ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی مثنویاں اور غزلیں اور قصیدے شاعر نے اپنے محلات اس وقت کے رسوم و رواج اور تہواروں شادی کی رسوم اپنی سالگرہ، شب برات، میلاد نبی، عید، خم غدیر، برسات۔ ہولی۔ بسنت۔ پان۔ اپنے ہاتھی پر لکھے ہیں۔ ایک مکالمہ صراحی اور پیالے پر اور دو کالی اور گوری پر لکھا ہے۔ اگرچہ یہ نظمیں اور مثنویاں اعلیٰ پائے کی نہیں لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے تنگ کوچے سے نکل کر صنعت و قدرت کی خوبیوں کی داد دے سکتا ہے۔

محمد قلی کا کلام اُردو میں سب سے قدیم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل کی بھی بعض نظمیں ملتی ہیں، مثلاً میراں جی شمس العشاق (وفات ۹۰۲) کی دو ایک نظمیں جو مذہبی یا صوفیانہ رنگ کی ہیں یا نظامی (عہدِ علاؤالدین بہمنی) کی عشقیہ مثنوی، مگر یہ بہت ہی معمولی ہیں۔ اور ادبی اعتبار سے ان کو محمد قلی کے کلام سے کوئی نسبت نہیں۔ محمد قلی کا کلام بہت بلند ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلا کلیات ہے۔ جس کی ترتیب حال کے طرز پر کی گئی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ نے اپنے منظوم دیباچے میں اس کی ترتیب اس طرح بیان کی ہے۔ اول مثنویاں پھر قصیدے اس کے بعد ترجیع بند، ترجیع بند کے بعد فارسی مرثیے اور اس کے بعد دکھنی مرثیے۔ دکھنی مرثیوں کے بعد فارسی غزلیں اور سب سے آخر میں رباعیات۔

یہ جو مشہور ہے۔ کہ شاہ گلشن نے ولی کو یہ ہدایت کی کہ یہ اتنے سارے فارسی مضامین جو بے کار پڑے ہیں، ان کو اپنے ریختے میں کام میں لاؤ، تم سے کون مواخذہ کرے گا۔

ممکن ہے۔ ایسا ہو لیکن محمد قلی کے کلام سے صاف ظاہر ہے۔ کہ فارسی شعر کی تمام خصوصیات قدیم دکنی اُردو میں آ گئی تھیں۔ بحریں تمام فارسی ہیں، تشبیہات۔ استعارات۔ تلمیحات نیز خیالات وہی ہیں جو فارسی شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ عشق و محبت کے معاملے میں ہندی کا رنگ بھی

آگیا ہے۔ ہندی میں عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور وہ مرد کو بے وفائی کے طعنے دیتی ہے۔ مثلاً ؎

پیا کس سوں گمائی رات ساری　　　تمن انکھیاں میں پائی ہیں خماری

یہ بالکل امیر خسروؔ کے اس شعر کا ترجمہ ہے۔

تو شبانہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب　　　کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

زبان کی قدامت بعض خاص ترکیبیں اور کہیں کہیں طرزِ اظہار ایسا ہے۔ کہ اس کے کلام سے پوری طرح لطف اندوز ہونے میں مانع ہوتا ہے۔ اس زبان سے مانوس ہونے کے بعد معلوم ہوگا کہ شاعر کا یہ کچھ کم کمال نہیں کہ اس نے ایک ایسی زبان میں جس کے منہ سے اس وقت تک دودھ کی بو نہیں گئی تھی۔ ان خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ جس کی صلاحیت فارسی میں صدہا سال کے منجھنے کے بعد پیدا ہوئی۔ باوجود اس کے بعض مستثنیات سے قطع نظر جن کا درجہ ہماری شاعری میں بلند ہے۔ محمد قلی کا کلام اُردو کے اکثر شعراء کے کلام سے کسی طرح کم نہیں اور سوائے زبان کے تغیرّا ور شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ اس کے اشعار میں شاعری آمد (یعنی بے تصنع پن) اور محبت میں خلوص پایا جاتا ہے۔ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے قدرتِ اظہار اور حسنِ بیان ظاہر ہوگا۔ ؎　　　کفر دیت کیا ہور اسلام دیت　　　ہر یک دیت میں عشق کا راز ہے

پیا باج پیالا پیا جائے نا　　　پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں　　　کہیا جائے اما کیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دِوانے کوں پند　　　دِوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

عشق و مستی اور تصوف میں اس کا کلام کسی سے پیچھے نہیں۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظؔ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گرما دیا ہے۔ اس نے حافظؔ کی بعض غزلوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

پلا ساقیا منجکوں مستانہ مے　　　کیا ہے بہت گرم چنگ ہور نے
مجے عشق کوچے میں ہے سلطنت　　　نہیں دیکھیا ہے کوئی اس کو کے

---

(۱) سے ۲ ۵ بہت سے　　　زہد دیا تھی بہو[۱][۲] دن بدنام رہیا ہوں
(۲) بہت　　　پیالے پلا پرم[۳] کے کر نیک نام ساقی
(۳) محبت (۴) سے　　　مستی تھی[۴] آپ صراحی کرتی تھی سرکشی نت
　　　کرتی ہے جام کو اب ہر دم سلام ساقی

اب مست اچھے دایم ہمیں مست اچھے کا ہنگام ہے　　　ساقی صراحی نقل ہور پیالے سوں ہمنا کام ہے
۵ و ۱۔ سے　　　عاشق اول تھی[۵] ہیں ہمیں سرمست ازل تھی ہیں ہمیں　　　تا آج کل تھی ہیں ہمیں زاہد کو نہیں یہ خام ہے

غرض اس قسم کے سینکڑوں شعر ہیں۔ جن میں مستی اور سرخوشی صاف بہتی نظر آتی ہے۔ یہ فارسی شاعری کا طفیل ہے۔ جسکا چربہ شاعر نے اپنی زبان میں اتارا ہے۔

محمد قلی نے قصیدے بھی بہت سے لکھے ہیں جو نعت و منقبت، محلات و باغات شاہی، نوروز، بسنت وغیرہ موضوعات پر ہیں۔ ان میں وہی شکوہ اور رفعت پائی جاتی ہے جو ہمارے ادب میں قصیدے کی خصوصیت ہیں۔ جس طرح یہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں غزل کے علاوہ مختلف مضامین عشقیہ و غیر عشقیہ مثنویاں اور قصیدے لکھے ہیں۔ اسی طرح یہ پہلا شاعر ہے جس نے واقعۂ کربلا پر پُر درد نوحے اور مرثیے لکھے۔

محمد قلی نے اپنے کلام میں ہندی کے ساتھ فارسی عربی الفاظ کے میل سے نئے مرکبات بنائے ہیں۔ مثلاً پون بیر، پھل افشانی وغیرہ۔ اسی طرح ہندی الفاظ کے ساتھ اضافت اور واو حروف عطف کا استعمال کیا ہے۔ جیسے نیر زلال، باغ و پھل، دجل ایک دوسری بات اس کے کلام میں یہ پائی جاتی ہے کہ عربی الفاظ کو اسی طرح لکھا ہے، جس طرح اس زمانے میں لوگ عام طور پر بولتے تھے۔ مثلاً قفل کو کلف، منع کو منا، نفع کو نام، وضع کو وضا، شمع کو شما وغیرہ اسی طرح حرکات و سکنات کی صحت کی پابندی نہیں کی۔ مثلاً عرش، تہہ، ظلم کی ل، وقت کے ق، عشق کے ش کو با مفتح استعمال کیا ہے۔ یہ بدعتیں ولی کے زمانے تک دکن دوسرے شاعروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

قطب شاہی بادشاہ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ محمد قلی کو اس مذہب میں غیر معمولی شغف تھا۔ شیعہ مذہب کی تبلیغ کو بھی وہ ایک فرض سمجھتا تھا۔ محرم کا چاند ہوتے ہی سارے ملک کی فضا بدل جاتی تھی۔ ماتم و عزاداری کے رسوم نہایت اہتمام اور شان سے ادا کئے جاتے تھے۔

کثرت مے خواری اور عیاشی کے باعث اس کی صحت کو گھن لگ گیا تھا۔ اس کی تصویر جو برٹش میوزیم میں ہے اس کی شاہد ہے۔ آخر ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) میں کچھ دن بیمار رہ کر ۴۹ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

○

دل مانگ خدا کن کہ خدا کام دوے گا
تمن کی مرادن کے بھرے جام دوے گا

○

کرتے ہیں دعوی شعر کا سب اپنی طبع سوں
بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

○

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ولیؔ

ولیؔ اردو غزل کے پہلے شاعر تو نہیں ہیں۔ لیکن اُن کے تغزل کی انفرادی شان انہیں اُردو غزل کا پہلا شاعر ثابت ضرور کردیتی ہے۔ اُن سے قبل غزل تو موجود تھی لیکن اُس کا رنگ و آہنگ صنفِ غزل کے مخصوص رنگ و آہنگ سے ذرا مختلف تھا۔ وہ غزل کی روایت سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اُس کو تغزل سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ اسی لئے وہ ولیؔ سے قبل ایک مستقل روایت کا روپ اختیار نہیں کرسکی تھی اس میں شبہ نہیں کہ ان سے قبل دکن میں قادر الکلام شاعر گزر چکے تھے۔ لیکن ان شاعروں کی محبوب ترین صنف مثنوی تھی۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے مثنویاں ہی کہی ہیں اور اسی صنف میں کمال حاصل کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے کبھی کبھی غزلیں کہہ لی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی غزل کی طرف باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کرسکا ہے ولیؔ نے اس صنف کی طرف سب سے پہلے باقاعدگی کے ساتھ توجہ کی اور اس کا صحیح ماحول پیدا کیا۔ اسی طرح اردو میں غزل کی روایت سب سے پہلے انہیں کے ہاتھوں قائم ہوئی اس صنف کو تغزل سے آشنا کرنے میں وہ پیش پیش رہے اس لئے بعضوں نے انہیں نہ صرف غزل کا پہلا شاعر بلکہ اردو شاعری کا آدم کہہ دیا ہے حالانکہ یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے

اس خیال کو ظاہر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ ایسا کرنے والوں کے نزدیک اردو شاعری غزل ہی سے عبارت ہے۔ ولیؔ سے قبل چونکہ دکن میں غزل کا باقاعدہ ارتقا نہیں ملتا، اس لئے انہوں نے ولیؔ ہی کو اردو کا پہلا شاعر قرار دے دیا ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ ولیؔ سے قبل دکن میں اردو شاعری کا باقاعدہ ارتقا ملتا ہے۔ اور بعض اصناف تو غیر معمولی طور پر ترقی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثنوی کی صنف نے اس زمانے میں خاص طور پر ترقی کی ہے۔ اور ولی سے قبل دکنی شاعری میں مثنوی ہی کا رواج رہا ہے۔ ولی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مثنوی نگاری کے اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود غزل کی طرف توجہ کی اور اُس میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ انہوں نے مثنویاں نہیں لکھی ہیں لیکن مثنوی کی صنف نے اُس زمانے میں جو فضا قائم کی تھی۔ اس کے اثرات انہوں نے ضرور قبول کئے ہیں۔ اور یہ اثرات ان کی غزل اور تغزل میں ضرور نظر آتے ہیں۔ اُن کے تغزل میں جو خارجیت پسندی ہے وہ مثنوی نگاری کی اس مخصوص فضا ہی کا نتیجہ ہے۔ اس خارجیت پسندی نے انہیں جمال پرست بنایا ہے اور ان کی غزل میں حسیاتی شاعری کی شان پیدا کی ہے۔ اُن کے یہاں غزل میں حُسن کی تفصیل و جزئیات کا جو عشق ہے ... اس کے پیچھے بھی مثنوی کی اسی فضا کا ہاتھ ہے۔ وہ جو غزل میں بیانیہ انداز کی طرف اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت اسی صورت حال کی پیداوار ہے۔ غرض ولیؔ نے اپنے زمانے کی شعری روایت سے اثر قبول کیا ہے اور اس اثر نے اُن کی غزل میں وہ صحت مندی پیدا کی ہے جو واقعیت اور فطرت نگاری کا جوہر ہے۔

ولیؔ کی غزل کا بیشتر حصہ مشاہدہ و محسوسات کی شاعری پر مشتمل ہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اس کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن اُن کے تجربات بہت وسیع متنوع اور ہمہ گیر نہیں ہیں۔ انہوں نے تو اپنے آپ کو حسن کے مشاہدے تک محدود رکھا ہے اور اسی کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔ اور محسوس کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے کلام کا بیشتر حصہ صرف حُسن کے بیانات پر مشتمل ہے اور حُسن کے ان بیانات ہی نے انہیں ایک جمال پرست شاعر بنا دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی یہ جمال پرستی انسانی حُسن کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی تک محدود ہے ——

لیکن چونکہ اس حسن کو انہوں نے ان گنت زاویوں سے دیکھا ہے۔ اس لئے اس کے ان گنت روپ ان کی غزل میں بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اُن کی نظر سراپا کے حسن پر پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ سراپا نگاری کی طرف پوری توجہ کرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے تغزل میں اس سراپا نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایک عضو کے حسن کا بیان تفصیل سے کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انہیں سراپا سے گہری دلچسپی ہے اور وہ اُس میں گم ہو جانے ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سراپا کا بیان انہوں نے ڈوب کر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ان گنت روپ اُن کی غزلوں میں جگہ جگہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے محبوب کے قد اور اُس کے رنگ روپ، اُس کے ناز و ادا، اُس کی آواز، اُس کی خوشبو، اُس کی شرم و حیا سب کی بہت اچھی مصوری کی ہے۔ اس موضوع پر کیسے کیسے حسین اور دل آویز اشعار ولی کے یہاں ملتے ہیں ؎

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا — خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا
جگ کے ادا شناساں ہے جن کی فکر عالی — تجھ قد کوں دیکھ بولے یو ناز ہے سراپا
گا ہے اے عیسوی دم یک بات لطف سوں کہہ — جاں بخش مجھ کوں تیرا آواز ہے سراپا

دل کوں لگتی ہے دلربا کی ادا — جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا
گل ہوئے غرق آبِ شبنم میں — دیکھ اس صاحبِ حیا کی ادا
اشکِ رنگیں میں غرق ہے نس دن — جن نے دیکھا ہے تجھ حنا کی ادا

موجِ دریا کوں دیکھنے مت جا — دیکھ اُس زلفِ عنبریں کی ادا
اے ولی دل کوں آب کرتی ہے
نگہ چشم شرمگیں کی ادا

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا — نہیں دیکھتا سُورج کی جھلکار کا تماشا
بے قصد مجھ زباں پر آتا ہے لفظِ تمکیں — دیکھا ہوں جب سوں تیری رفتار کا تماشا
اُس مکھ کا رنگ اڑ کر قوسِ قزح کو پہنچا — دیکھا جو تجھ بھواں کی تلوار کا تماشا

کرے آزادگی اپنی گرفتاری اُپر قرباں — جو دیکھے یک قدم پھر سروِ گلشن میں خرام اُسکا
نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجکوں — بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا
پری رُخ کوں اُٹھانا نیند سوں برجا نہیں عاشق — عجب کچھ لطف رکھتا ہے زمانہ نیم خوابی کا

اے گُل باغ حُسن مکھ سوں ترے — جلوہ پیرا ہے رنگ و بوئے حیا

اشک سوں تجھ لباں کی سرخی پہ — جگرِ لالہ داغ داغ ہوا

ہے قد ترا سراپا معنیٔ نازک گویا　　پوشیدہ دل میں میرے آتا ہے راز گویا

ترے جلوے سوں اے ماہ جہاں تاب　　ہوا دل سر بسر دریائے سیماب

عجب اُس شوخ چنچل کی انکھاں ہیں شوخ او چنچل　　ہوئے قرباں جس پہ آہوئے صحرا نشیں آکر

لباس اپنا کیا وہ گل بدن سبز　　ہوا سرتا قدم مثلِ چمن سبز

جب لٹک چال سجن کی مجھے یاد آتی ہے　　دل مرا رقص میں آتا ہے مثالِ رقاص

جو ہے تیرے دہن میں رنگ و خوبی　　کہاں یہ رنگ یہ خوبی کلی میں

اے ولی پی کا دہن ہے غنچۂ گلزارِ حسن　　بوئے گل آتی ہے اُس کی شوخیٔ تقریر سوں

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو　　کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن　　باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

ہر ہر نگہ سوں اپنے بے خود کرے ولی کوں　　وہ چشمِ مست سرخوش جب نیم خواب ہووے

یہ چند اشعار یہاں بغیر کسی ترتیب کے نقل کئے گئے ہیں۔ ان سے ولی کی جمال پرستی پر روشنی ضرور پڑتی ہے اور اُن کے تصورِ حسن کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ولی حسن کا شیدائی ہے۔ حسن کہیں بھی ہو اُن کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ اس کے ایک ایک پہلو سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس حسن کو دیکھ کر اُن پر ایک سرخوشی کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس عالمِ سرخوشی میں وہ حسن کی حقیقت تک پہنچتے ہیں کبھی یہ حقیقت انہیں چمن زار جیا میں نظر آتی ہے کبھی وہ اس کو گلزار غنچہ دہن کی انجمن آرائی میں دیکھتے ہیں کبھی قد کے ناز و ادا کے اعجاز میں انہیں اُس کا صحیح رنگ روپ دکھائی دیتا ہے۔ کبھی اُن کے انداز میں اس حسن کی حقیقت نظر آتی ہے۔ کبھی رفتار و خرام میں وہ اس کا تماشا دیکھتے ہیں۔ غرض ولی کے مشاہدے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُن کے محسوسات میں بھی بہت تنوع ہے۔ انہوں نے حسن کو ان گنت روپ میں دیکھا ہے اور ان کی غزل میں بھی، بس حسن کے ان گنت روپ نظر آتے ہیں۔

ولی نے اس حسن کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ اُس سے جی بھر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی اس حسن پرستی میں ایک نشاطیہ رجحان کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن یہ نشاطیہ رجحان کبھی بھی حد سے متجاوز نہیں ہوتا۔ اور بہر صورت اپنے حدود میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کی اس جمال پرستی کی تان جنسی اور جسمانی تسکین ہی پر جا کر نہیں ٹوٹتی۔ بلکہ اس کی نوعیت ذہنی اور روحانی بھی ہو جاتی ہے۔ ولی اس حسن سے ایسی مسرت حاصل کرتے ہیں جو اُن کی روح کو بالیدہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ ان کی غزل میں ان گنت ایسے مقامات آتے ہیں جہاں اُن پر ایک سرخوشی کی سی کیفیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ کیفیت اس وقت چھاتی ہے جب وہ حسن کا بیان کرتے ہیں۔ اور جب یہ بیان اُن کے یہاں [illegible] اختیار کر لیتا ہے۔ ولی کا کمال یہ ہے کہ وہ حسن کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں ہی نہیں کھینچتے، اُس کیفیت کی مصوری بھی کرتے ہیں جو اس حسن سے ان پر طاری ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو انہوں نے انسانی زندگی کے حسین ترین اور لطیف ترین لمحات کا عطر قرار دیا ہے۔ ان لمحات میں انسان آسمانوں پر پرواز کرتا ہے۔ [illegible] اس کی

روح تساروں کو چھوتی ہے۔ یہی ان کے نزدیک حسن وجمال کا اثر ہے۔ ولی کی حسن پرستی کی حدیں اس مسرت اور لطف اندوزی کے پہلو سے ضرور ملی ہوئی ہیں لیکن اس میں کسی ذہنی تعیش کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ احساسِ نشاط کا خیال اس میں موجود ہے لیکن اس احساسِ نشاط میں بڑی صحتمندی ہے۔ یہ ایک صحتمند انسان کا احساسِ نشاط معلوم ہوتا ہے اس میں کسی قسم کی اُلجھن نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ اس سلسلے میں ان کے یہاں توازن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لذت پسندی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ابتذال سے بہت دور ہیں۔ ان کے یہاں تو حسن بہ ذاتِ خود ایک تہذیب ہے۔ اسی لئے اس کا بیان ایک مہذب فضا کو قائم کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ولی کی جمال پرستی اور تصورِ حسن میں بڑی صحت مندی ہے۔ یہ صحت مندی بذاتِ خود بھی حسین ہے۔ حسن کی صحت مندی ان کے یہاں ہمیشہ صحت مندی کے حسن سے گلے ملی ہوئی نظر آتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ولی ایک تندرست ذہن رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انفعالیت پسندی نہیں تھی۔ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آنکھیں باہر کی طرف بھی کھلتی تھیں۔ اس صورتِ حال نے ان کے یہاں ایک خارجی زاویۂ نظر بھی پیدا کیا ہے۔ اسی خارجی زاویۂ نظر نے انہیں حُسن سے قریب کیا ہے اور وہ اس کو صحت مندی کے ساتھ دیکھنے کی طرف کچھ اس طرح متوجہ ہوئے ہیں کہ یہی ان کا مزاج بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ اس حسن کو ایک عام صحت مند انسان کی طرح دیکھتے ہیں — ایک ایسے انسان کی طرح جو زندگی کو بسر کرنا اور برتنا چاہتا ہے۔ اور جس کے پیشِ نظر زندگی مسرت کے مترادف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسرت کو ذہنی تعیش سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ولی کی حسن پرستی میں بھی ذہنی تعیش کا عنصر نہیں ہے۔ برخلاف اس کے اس میں تو ایک صحت مند انسان کی زندگی کا نشاطیہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے وہ تو اس متوازن انسان کا ایک فطری ردِ عمل ہے۔ جس میں جینے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو ہر لمحہ مسرت کی تلاش و جستجو میں سرگرم کار رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کے یہاں زندگی سے بیزاری پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اس سے گھبراتا نہیں۔ وہ تو مختلف زاویوں سے اس کے حسین پہلوؤں کو دیکھتا اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال ہی کا یہ اثر ہے کہ ولی کے یہاں حسن کا بیان کسی مصیبت اور پریشانی کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ان کے یہاں تو حسن کا خیال ہمیشہ مسرت سے ملا جُلا نظر آتا ہے۔ اسی لئے وہ حسن کو دیکھ کر اس کا شکوہ نہیں کرتے۔ انہیں اس کے مظالم کا خیال نہیں آتا — بلکہ وہ تو اس حسن کو اپنے لئے سمجھتے ہیں — اس کا مقصد انہیں مسرت بہم پہنچانا نظر آتا ہے۔ اسی لئے وہ اس کے تاریک پہلوؤں کو نہیں دیکھتے۔ ان کے سامنے تو ہمیشہ اس حسن کے روشن پہلو رہتے ہیں — یہ حسن انہیں کبھی تکلیف نہیں دیتا، دکھ نہیں پہنچاتا۔ اس کے ساتھ ان کے یہاں محرومی اور ناکامی کے خیالات بھی پیدا نہیں ہوتے۔ جب بھی وہ اس حسن کو دیکھتے ہیں یا جب کبھی بھی انہیں اس کا خیال آتا ہے تو وہ ایک بہت ہی حسین اور دل آویز پس منظر قائم کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ حُسن کے خد و خال ان کے یہاں اسی پس منظر میں نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی حسین شخصیت کے ساتھ ان کے یہاں اکثر گلشن کا ذکر آتا ہے جہاں کلیاں چٹکتی ہیں، پھول اٹکھیلیاں کرتے ہیں، سبزہ رقص کرتا ہے۔ ہوا نغمہ بکھیرتی ہے۔ چاندنی مسکراتی ہے۔ تارے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں — اور اس طرح ان کا رچا ہوا احساسِ حسن اور ذوقِ جمال اس حسن کو دیکھنے کے لئے اس حسن سے کچھ زیادہ ہی حسین اور دل آویز سی فضا پیدا کر لیتا ہے۔ اس فضا میں حدِ نظر تک رنگینیاں چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ دور دور تک رعنائیوں کا بسیرا نظر آتا ہے۔ ولی اس عالمِ کیف و مستی میں حسن سے قربت حاصل کرتے ہیں۔ یہ اشعار اسی صورتِ حال کے ترجمان ہیں ؎

اے رشکِ ماہتاب تو دل کے صحن میں آ ۔۔۔ فرصت نہیں ہے دن کوں اگر تو رین میں آ
اے گُل عذار غنچہ دہن ٹک چمن میں آ ۔۔۔ گل سر پہ رکھ کے شمعِ سخن انجمن میں آ

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کوں ۔۔۔ بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

نکل اے دلربا گھر سوں کہ وقتِ بے حجابی ہے ۔۔۔ چمن میں چل بہارِ نسترن ہے ماہتابی ہے

آج ہر گل نور کی فانوس ہے ۔۔۔ کوہ و صحرا صورتِ طاؤس ہے
گر نہ نکلے سیر کوں وہ نوبہار ۔۔۔ ظلم ہے، فریاد ہے، افسوس ہے

آج گل گشتِ چمن کا وقت ہے اے نوبہار ۔۔۔ بادۂ گل رنگ سوں ہر جام گل لب ریز ہے

صنم مجھ دیدۂ و دل میں گذر کر ۔۔۔ ہوا ہے باغ ہے آبِ رواں ہے

آج سرسبز کوہ و صحرا ہے ۔۔۔ ہر طرف سیر ہے تماشا ہے

ولیؔ غنچہ نمن اک رات اس ہستی کے گلشن میں ۔۔۔ اگر تجھ بر میں وہ گل پیرہن ہووے تو کیا ہووے

ولیؔ کا احساسِ حسن اور ذوقِ جمال ان اشعار میں اپنی انتہائی بلندیوں پہ نظر آتا ہے ۔ ان اشعار سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ولیؔ اس حسین اور دل آویز فضا کے شیدائی ہیں ۔ وہ اسی کے لئے جیتے ہیں ۔ اس فضا کا خیال ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا ۔ وہ اس کو پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ انہیں اس کی تلاش و جستجو رہتی ہے ۔ وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں ، اس تک پہنچنے کی آرزو کرتے ہیں ۔ اگر وہ کسی وجہ سے حاصل نہ ہو تو پھر تخیل کی دنیا میں اس کا نظارہ کرتے ہیں ۔ اور اس کا تصور ہی ان کے لئے آرامِ جاں بن جاتا ہے ۔ اس تصور کے سہارے وہ نہ جانے کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں ۔ اس منزل پہ پہنچ کر رومانیت ان کے یہاں اپنی جھلک ضرور دکھاتی ہے ۔ لیکن رومانیت کے ساتھ ناآسودگی کا جو احساس سائے کی طرح چلتا ہے ۔ وہ ولیؔ کے یہاں نظر نہیں آتا ۔ وہ تو اس عالمِ تصور میں بھی زندگی سے ناآسودہ نظر نہیں آتے ۔ محرومی کا خیال اور بیزاری کا احساس ان کے پاس نہیں پھٹکتا ۔ وہ تو اس عالم میں بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور مسرت کا خیال ایک سرخوشی بن کر ان کے حواس پہ چھا جاتا ہے ۔

ولیؔ بنیادی طور پہ حواس کے شاعر ہیں ۔ اسی لئے ان کی جمال پرستی میں فلسفیانہ رنگ و آہنگ نہیں ملتا ۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے کم ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کے یہاں غور و فکر کے عناصر نام کو بھی نظر نہیں آتے ۔ وہ تو صرف اس کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسی لئے حسن کا احساس ان کے یہاں ایک نہایت ہی حسین تجربہ بن جاتا ہے ۔ اس تجربے کی نوعیت ذہنی اور فکری نہیں ہوتی بلکہ حسیاتی ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انبساط و مسرت کا پہلو نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا ہے ۔ وہ حسن کی ماہیت کا سراغ نہیں لگاتے ۔ اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ کہیں کہیں تصوف کے اثر سے جہاں تک حسن کا تعلق ہے ، وہ جُز میں کل کا جلوہ ضرور دیکھتے ہیں ۔ لیکن اس منزل پہ پہنچ کر بھی انبساط و مسرت کے خیال کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ۔ حسن یہاں بھی ان کے لئے ایک سرخوشی کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور جب بھی وہ اس حسن کو بے نقاب کرتے ہیں تو یہ کیفیت اُن پہ برسات کی ہی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے ۔

یہ سوال یہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر ولیؔ کے یہاں حسن و جمال کا یہ احساس کہاں سے آیا اور اس احساس میں اتنی شدت کیوں پیدا ہوئی کہ جس نے جمال پرستی کو ان کے مزاج کا جُز بنا دیا ؟ —— ان کی شخصیت اور ماحول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس سوال کا جواب ایسا کچھ مشکل نظر نہیں آتا —— ولیؔ کی شخصیت کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ہوسِ سیر تماشا رکھتے تھے ۔ انہیں کسی ایک جگہ پہ قرار نہیں تھا ۔ شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں وہ اپنی اس حس کو تسکین پہنچانے کے لئے گھومتے پھرتے تھے ۔ ان کے پاؤں میں چکر

تھا۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہی تلاشِ حسن اور جستجوئے مسرت تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہی ان کا مزاج بنتا گیا۔ انہوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش دو اہم تہذیبوں کا شباب دیکھا ـــــ ایک تو خود دکن کی تہذیب جس کی آغوش میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس کے سائے میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ دوسرے مغلوں کی تہذیب جس کے اثرات مغل فرمانرواؤں کی یورشوں کے ساتھ شمالی ہندوستان سے دکن پہنچے اور جن کی بدولت تاج محل اور لال قلعے کی تہذیب سرزمینِ دکن پر بھی چھا گئی۔ ولی کی شخصیت میں ان دونوں تہذیبوں کا رنگ رچا ہوا نظر آتا ہے ان کا احساسِ حسن اور ذوقِ جمال انہیں تہذیبوں کا مرہونِ منت ہے۔ حسن دوستی اور جمال پرستی ان دونوں تہذیبوں میں مشترک تھی۔ ولی نے بھی غیر شعوری طور پر ان سے اثر قبول کیا اور یہ جمال پرستی ان کے مزاج کا بنیادی جزو بن گئی۔ اس میں ان کے زمانے کے اس سیاسی انتشار کا بھی خاصا ہاتھ ہے جو دکن پر مغلوں کی پیہم یورشوں اور بالآخر ان کی فتح و کامرانی نے پیدا کیا تھا ـــــ ولی نے اس اجتماعی غم کو غلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں حسن و جمال کا سہارا لیا ہے۔ کہ اس وقت اس سے بہتر کوئی اور طریقہ اس غم کو غلط کرنے کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں ان کے یہاں کسی فراری ذہنیت کے اثرات نظر نہیں آتے۔ کیونکہ حسن و جمال سے یہ والہانہ دلچسپی ان کے یہاں انبساط و نشاط کی حدود سے متجاوز ہو کر لذت اور تعیش کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتی۔ اس کی نوعیت بہرصورت صحت مندانہ رہتی ہے۔ تصوف کی روایت نے بھی ان کی اس جمال پرستی کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ولی تصوف کی روایت سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس کا رنگ پوری طرح رچا ہوا نظر آتا ہے۔ تصوف کی منزلِ اولیں یعنی عشقِ مجازی کو انہوں نے بڑی اہمیت دی ہے اور اسی کو عشقِ حقیقی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اس خیال نے بھی انہیں حسن سے قریب کیا ہے۔ اور وہ اس کی طرف ایک والہانہ انداز میں اظہارِ جذب و شوق کے لئے مجبور ہو گئے ہیں ـــــ غرض ولی کی جمال پرستی کے کئی عوامل اور محرکات ہیں۔ اس کی تہہ میں ان کی مخصوص افتادِ طبع اور اس افتادِ طبع کو پیدا کرنے والے اس مخصوص ماحول میں پیوست ہیں۔ جس نے حسن دوستی اور جمال پرستی کو ایک فن کا روپ دے دیا تھا۔ اس لئے وہ زندگی سے اتنی قریب نظر آتی ہے۔ اور اس میں حد درجہ استواری کا احساس ہوتا ہے۔

ولی کے اس رچے ہوئے احساسِ حسن اور ذوقِ جمال نے ان کے تغزل میں محبوب کے ایک واضح تصور کو ابھارا ہے۔ یہ محبوب اُن کی غزلوں میں چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، ناز و انداز دکھاتا، بھاؤ بتاتا شرماتا اور لجاتا نظر آتا ہے۔ ولی نے اس کی اَن گنت تصویریں بنائی ہیں۔ ان تصویروں کے خطوط بڑے ہی تیکھے اور رنگ بہت ہی شوخ ہیں۔ ان میں اُبھار ہے۔ اور اس اُبھار کے باعث وہ زندگی سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ ان میں بڑی جولانی، احساس ہوتا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں جان پڑ گئی ہے اور وہ متحرک ہو گئی ہیں ـــــ ولی کی اس فنکارانہ سحرکاری نے ان کی غزلوں میں محبوب کی شخصیت کو بہت نمایاں کر دیا ہے۔ اس کے کرشمے قدم قدم پر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور وہ مجموعی طور پر خود ایک کرشمہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ولی کی غزلوں میں اس کی تصویر محض خیالی نہیں ہے۔ وہ ایک گوشت پوست کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ اسی دنیا کی مخلوق نظر آتا ہے۔ اسی ماحول کا فرد دکھائی دیتا ہے۔ ولی نے اس کو پردے کے پیچھے رکھنے اور چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کو نمایاں کیا ہے۔ اس کی صورت و سیرت کی تفصیل و جزئیات ان کی غزلوں میں ہر طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ ولی نے اس کو محض ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ محبوب سمجھ کر اس سے قربت حاصل کی ہے۔ اس کے حسن کی رنگینی کو محسوس کیا ہے۔ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے۔ اور وہ ان پر پوری طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ ولی اس کو دیکھتے ہیں۔ اس کے غمزہ و عشوہ و ادا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے قریب ہوتے ہیں اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ان کی ذات کے لئے ایک منبعِ کیف و سرور اور سرچشمۂ نشاط و انبساط بن جاتا ہے۔

اس محبوب پر جب بھی ان کی نظر پڑتی ہے تو شوق و اشتیاق کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے دریاؤں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وؔلی کے شوق و اشتیاق کی یہ کیفیت ان کے اس محبوب کے خد و خال کو کچھ اور بھی نمایاں کرتی ہے اور اس طرح وہ اپنی تمام رنگینیوں و رعنائیوں تمام تابانیوں اور جگمگاہٹوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اس کی انفرادی شان، اس کے ایک ایک انداز سے پھوٹی پڑتی ہے اور وہ حواس پر چھا کر ہر ایک کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ وؔلی تو اس کی ذات میں گم نظر آتے ہیں، اور ڈوب کر اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی مصوّری کرتے ہیں۔ ان کے یہاں غزلیں کی غزلیں ایسی ملتی ہیں جن میں صرف محبوب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی مصوری ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کے تغزل میں اسی مصوری کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ان کی جمال پرستی بھی اسی مصوری کا ایک رُخ ہے۔ وہ اس کی تابع ہے۔ دراصل انھوں نے حسن و جمال کو بھی اپنے محبوب ہی کے روپ میں دیکھا ہے۔ اسی لئے یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جا سکتی ہے کہ وؔلی کا تغزل محبوب کی شخصیت کے اس عمل اور ردِّ عمل کی مصوّری سے عبارت ہے۔

وؔلی ــــ نے اس محبوب کے ظاہری حسن کی تعریف میں قلم توڑ دیا ہے۔ یوں وہ دوسروں کے حسن کو بھی دیکھتا ہے۔ وہ بھی اس کو متاثر کرتے ہیں کیونکہ جمال پرستی تو اس کی گھٹّی میں پڑی ہے۔ لیکن وہ اپنے محبوب کو تمام گل رخوں سے ممتاز سمجھتا ہے۔ دنیا جہان کے دلبر اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے حسن کی تابانیاں اس محبوب کے حسن کی تابانی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔ ان کا محبوب تو ان کے خیال میں جہاں تک حسن و ادا کا تعلق ہے اعجاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اور اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ کسی کو اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ وؔلی نے یہاں اپنے مخصوص انداز میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ہے:-

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا — خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا
کیوں ہو سکیں جگت کے دلبر ترے برابر — تو حُسن اور ادا میں اعجاز ہے سراپا

بے جا ہے بادشاہی ہر خوب رو کوں دینا — خوبی کے تخت اوپر اک بادشاہ بس ہے

بغیر تیرے خیال کے اے شوخ — دل میں میرے دوجا اترتا نہیں

یہ اشعار وؔلی کے محبوب کی انفرادیت اور اہمیت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ ان سے اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ محبوب وؔلی کے لئے ایک معیار کی حیثیت رکھتا ہے وہ اس کی ذات کو ایک انجمن سمجھتے ہیں۔ جہان کا حسن ان کے خیال میں، ان کی ذات میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ اور حسن اور محبوب دونوں ان کے نزدیک لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وؔلی کی غزل میں حسن کے ساتھ محبوب اور محبوب کے ساتھ حسن کا خیال آتا ہے ـــ یہ دونوں آپس میں کچھ اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وؔلی نے غزل کے چند اشعار اپنے اس محبوب کے ظاہری حسن اور اس کے انداز اور اطوار و کردار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:

دلربا آیا نظر میں آج میری خوش ادا — خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہوں دوجا دلبر
بے وفا گر تجھ کوں بولوں ہے بجا لے نازنیں — نازنیں عادت ہتے ہیں اکثر بے وفا
کم نما ہے نوجواں میرا برنگِ ماہِ نو — ماہِ نو ہوتا ہے اکثر لے عزیزاں کم نما

ایک اور غزل میں محبوب کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے؎

مت آتشِ غفلت سوں مرے دل کوں جلا جا — مشتاق درس کا ہوں ٹک یک درس دکھا جا
بے رحم نہ ہو غصہ نہ کر بات مری سُن — ڈرتا نہیں یک بات کی سو بات سُنا جا
جلتا ہوں میں مدت ستی اے حسن کے دریا — ٹک مُکھ کوں دکھا آگ مرے دل کی بجھا جا

ایک اور غزل میں اپنے محبوب کے ناز و انداز کی وضاحت اس طرح کی ہے:

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا — ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سے نہیں دل ہے مرا واقف — اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں — ٹک پاؤں کے بچھوے کی جھنکار سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے — یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بُت کی پجن ہاری ٹک اس کوں پجاتی جا
تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل — یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگاتی جا
تجھ نیہہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت — یک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سُندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

ایک اور غزل میں ولی نے اس محبوب کو اس طرح نمایاں کیا ہے؎

سرو قد تجھ پہ وار کر ڈالا — ہے یو شمشاد تیرا مت والا
چہرۂ سُرخ خالِ مشکیں سوں — نقل اٹھلتے ہیں دیکھ سب لالا
کیوں تماشے چلیا چمن کے توں — سرو قد تجھ انگے ہے کیا بالا
ہنسلی تجھ گل میں دیکھ کہتے ہیں — چاند سیں مُکھ کا ہے کا یہ ہالا
نین مرگوں کی گھانس کھپڑے مُکھ — دیکھ تیری انکھیاں کا دنبالا
جب چلیا وہ کمر میں خنجر رکھ — عاشقاں کا خدا ہے رکھوالا
سحر جادو میں تجھ نین سا نہیں — سب پھرا دیکھ شہر بنگالا

ولی کی ایک اور مشہور غزل ہے جس کے چند اشعار میں ان کے محبوب کی بڑی ہی دلکش اور دل آویز تصویر نظر آتی ہے؎

چلنے میں اے سرو چمن باتی کوں لجاوے توں — بے تاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
یک بارگی ہو ظاہر بے تابیٔ مشتاقاں — جس وقت کر غمزے سوں چھاتی کوں چھپاوے توں
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر — جب اوڑھ میں پٹے کی چہرے کوں چھپاوے توں
لوئے فلک مُکھ میں انگشتِ تحیر سے — جب پاؤں نزاکت سوں مجلس میں نچاوے توں

یک تان سنانے میں جی تان لیا سب کا
اب دل سوں لگے سانے گر بھاؤ بتا دے توں

ایک اور غزل میں انہوں نے محبوب کے ظاہری حسن کے بارے میں چند شعر ایک ایسے اچھوتے انداز میں کہے ہیں جس سے اس کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ؎

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے — ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے
ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر — مجھے تب نرگستاں یاد آوے
ترے زلفاں کی طولانی کوں دیکھے — مجھے لیلِ زمستاں یاد آوے
ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے کوں — مجھے فردوس رضواں یاد آوے
تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے — اُسے شمعِ شبستاں یاد آوے

ولی کی غزلوں کے چند اور متفرق اشعار بھی اس سلسلے میں غور طلب ہیں۔ ان سے بھی محبوب کی صورت، سیرت اور کردار پر روشنی پڑتی ہے ؎

سراپا ناز ہے تو اے پری رو — مجھے تیرے سراپا کی قسم ہے

اے ولی پی کا دہن ہے غنچۂ گلزارِ حسن — بوئے گل آتی ہے اس کی شوخیِ تقریر سے

مجھ سوں کیونکر ملے گا حیراں ہوں — شوخ ہے بے وفا ہے سرکش ہے

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی — مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

ہر چند کہ اس آہوئے وحشی میں بھڑک ہے — بے تاب کے دل لینے کوں لیکن نہ دھڑک ہے

تو ہے سر پاؤں لگ از بس کہ نازک — نگہ کرتی ہے تجھ پگ کوں حنائی

مجھ پہ ولی ہمیشہ دلدار مہرباں ہے — ہر چند حسب ظاہر طناز ہے سراپا

موہن ناز سوں بھلی باتاں — دل میں لاتا نہیں ہزار افسوس

سجن میں ہے شعارِ آشنائی — نہ ہو کیوں دل شکار یہ آشنائی

تری انکھیاں نے مجھ اے شوخِ بدمست — چھکایا ہے چھکایا ہے چھکایا

تا چند کہوں بات تری خوش شکلی کی — اے شوخ ترے غمزے نے جو کی سو بھلی کی

ولی کا دیوان اس قبیل کے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ یہ اشعار یہاں بغیر کسی ترتیب کے نقل کئے گئے ہیں، لیکن ان کو یک جا کر کے دیکھا جائے تو ان میں سے ولی کے محبوب کی ایک واضح تصویر ابھرتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا محبوب حسین ہے، خوش ادا ہے ——— اور اس کی

یہ خوش ادائی ایسی ہے کہ دنیا کا کوئی حسین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کم نمائی اس کے مزاج کی خصوصیت ہے۔ وہ بہت کم رونما ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اس کی ایک ادائے خاص ہے جو اپنے دامن میں ایک اندازِ دلبری اور طرزِ دلربائی رکھتی ہے۔ وہ غفلت شعار بھی ہے۔ وہ غصہ بھی کرتا ہے اس کے مزاج میں بے رحمی بھی ہے۔ وہ بے وفائی سے بھی پیش آتا ہے۔ بے نیازی بھی اس کے مزاج کی خصوصیت۔ لیکن اس کی ایک نگاہِ آشنا ان سب کا خاتمہ کر دیتی ہے اور ان کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جاتی ہے۔ ولی کو اس محبوب کی دلدہی اور دلداری کی دولت بے بہا بھی نصیب ہوتی ہے۔ وہ اس کی شخصیت میں ان کی آنکھوں نے شعارِ آشنائی کی جھلک بھی دیکھی ہے اور وہ بظاہر طناز ہونے کے باوجود ان پر مہربان نظر آتا ہے۔ ایک ایسے حسین، خوبرو اور خوش ادا سے اس بات کی توقع تو نہیں کی جاتی جو سراپا ناز ہے۔ جس میں آہوئے وحشی کی سی دھڑک ہے۔ جو سر سے پاؤں تک نزاکت کا ایک مجسمہ ہے۔ جو شرم و حیا کا پتلا ہے۔ اور جس کی خوش شکلی ہر لحاظ سے مثالی حیثیت رکھتی ہے —— لیکن اس کے باوجود وہ ولی کی دلدہی اور دلداری کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ولی اس یارِ آشنا کے ساتھ رہ و رسمِ آشنائی رکھتے ہیں۔ وہ اس سے بہت دور رہنے کے باوجود بہت قریب ہیں۔ اس کی جگہ ان کے دل میں اور ان کی جگہ اس کے دل میں ہے۔ کاروبارِ شوق میں وہ دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اس لئے ان کا یہ رشتہ واقعیت اور حقیقت پر استوار نظر آتا ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے محبوب کے ایک ایک انداز سے زندگی اور جولانی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ولی نے اپنی غزل میں اپنے محبوب کی جو رنگارنگ تصویریں بنائی ہیں وہ خیالی نہیں ہیں۔ ویسے ان میں تخیل کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ لیکن انہوں نے تخیل کے اس رنگ کو بھی حقیقت و واقعیت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اردو کے عام غزل گو شعراء کی طرح ان کا محبوب محض خیالی نہیں ہے۔ وہ تو ایک مکمل اور بھرپور شخصیت کا مالک ہے۔ اس شخصیت کے نمایاں ترین پہلو یہ ہیں کہ وہ اسی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی اصل ہندی ہے۔ اس کا رنگ روپ، چال ڈھال، طور طریقے، ناز و انداز سب مقامی ہیں۔ وہ دکنی یا گجراتی حسن و شباب کا مجسمہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ان سرزمینوں کے مہ جبینانِ عشوہ کار کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ولی نے اپنی غزل میں اس محبوب سے متعلق جتنے خیالات بھی پیش کئے ہیں ان میں اسی محبوب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہ محبوب پردے کے پیچھے نہیں رہتا۔ یہ تو اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ سامنے آتا ہے۔ کاروبارِ شوق میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اور اگرچہ یہ دادِ عیش نہیں دیتا۔ اس کو کھل کھیلنا بھی نہیں آتا لیکن یہ جذباتی تقاضوں کو پورا کرنے میں پیچھے نہیں رہتا۔ شرم و حیا اس کا زیور ضرور ہے لیکن وہ کوئی انفعالیت پسند مخلوق نہیں ہے۔ وہ زندگی سے محبت کرتا ہے۔ اس کو جینا آتا ہے۔ اس کی زندگی کے افق پر ولولہ و شوق کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ وہ محبت کرتا ہے اور محبت کرنا جانتا ہے۔ اس کو محبت کرنے کے آداب آتے ہیں۔ وہ محبت کرنے والے سے ملتا ہے اور اس کا دل بہاتا ہے۔ اس کو محبت کرنے کے تمام گر معلوم ہیں۔ اسی لئے ولی کی غزل میں کہیں بھی اس کے غیر متوازن ہونے کا احساس نہیں ہوتا —— ولی نے اس کو عام غزل گو شعراء کے محبوب کی طرح ظالم، سفاک، بے رحم اور جفاجو بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔ برخلاف اس کے اس کو مہربان، آشنا اور وفاپرست دکھایا ہے۔ کہیں کہیں وہ اس کی بے وفائی کے شکوہ سنج ضرور نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بھی ان کے ذہن کا پیدا کردہ معلوم ہوتا ہے۔ رہ و رسمِ عاشقی میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جب محبوب کی وفا پر بھی بے وفائی کا گمان ہونے لگتا ہے —— لیکن ولی کے تغزل میں ایسی منزلیں ذرا کم ہی آتی ہیں۔ وہ تو محبوب کو کاروبارِ شوق میں برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔ اس کی ذات میں انہیں وہ حسن نظر آتا ہے جس سے زندگی کی تاریک راہوں میں شمعیں سی فروزاں ہو جاتی ہیں اور ان کی روشنی میں زندگی کا سفر آسان ہو جاتا ہے —— غرض ولی نے اپنی غزلوں میں محبوب کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں بڑی صحت مندی ہے اور اسی صحت مندی نے اس کو دلکش اور دل آویز بنایا ہے۔ یہ تصور ان کے تغزل کی جان ہے۔

اس محبوب کے ساتھ ولی نے اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایسے مقامات بھی کثرت سے آتے ہیں جہاں وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس محبوب سے قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر انہیں عشق و عاشقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہونے کے لئے ایک راستہ مل جاتا ہے، اور وہ اس راستے پر چل دیتے ہیں۔ اس سفر میں انہیں مختلف منزلوں سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور اس طرح وہ عشق کی متنوع واردات و کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ولی ان کی ترجمانی بھی اپنی غزلوں میں بڑی خوبی سے کی ہے۔ اور ان مضامین کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے میں بڑے شوق و انہماک کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تغزل میں عشق و عاشقی کی مختلف واردات و کیفیات کی ترجمانی اور عکاسی نظر آتی ہے۔ اور اس ترجمانی اور عکاسی میں وہ شروع سے آخر تک متوازن رہے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے یہاں انتہا پسندی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ عشق و عاشقی، معاملات، واردات و کیفیات ان کے یہاں زندگی کے بنیادی اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ انہیں زندگی سے الگ کر کے پیش نہیں کرتے بلکہ زندگی کے مختلف مظاہر ہی کی طرح ان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت اس عشق و عاشقی کو ماورائیت اور انفعالیت سے دور رکھتی ہے۔ ان کے یہاں تصوف کے اثرات موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے عشق و عاشقی میں ماورائیت کی طرف اپنا میلان ظاہر نہیں کیا ہے۔ بلکہ عشق حقیقی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ویسے اس میں شبہ نہیں کہ مجموعی طور پر ان کے یہاں عشق مجازی کے اثرات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ اسی لئے وہ عشق و عاشقی کے دنیاوی معاملات کو اپنی غزلوں میں زیادہ جگہ دیتے ہیں۔

یہ عشق و عاشقی ولی کے تغزل میں حواس کے مختلف ارتعاشات کا نام ہے۔ ولی پر محبوب کی رنگینی اور رعنائی کے اثرات سب سے پہلے اس ارتعاش کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت وہ جذباتی ردعمل ہے جس کی نوعیت انسانی ہے۔ انسانی زندگی کے جذباتی نظام میں عمل اور ردعمل کا یہ سلسلہ بہرصورت جاری رہتا ہے۔ ولی اس جذباتی تسکین کے لئے زندگی کے راستوں پر کشاں کشاں گزرتے اور اس کے مختلف میدانوں کی خاک چھانتے ہیں۔ اس طرح مسرت و انبساط کے حصول کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ اور ولی کے نزدیک یہی زندگی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ عشق و عاشقی کے نشاطیہ پہلو کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے تغزل میں عشق و عاشقی کے اس نشاطیہ پہلو کی ترجمانی اتنی شدید نظر آتی ہے کہ اس کے درد و غم کا پہلو بڑی حد تک پس منظر میں جا پڑتا ہے۔ وہ مختلف نشاطیہ معاملات کی ترجمانی بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ لیکن یہ ترجمانی کبھی بھی ان کے یہاں لذت پرستی اور تعیش پسندی کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے ایک تندرست انسان کی مسرت و انبساط تک محدود رہتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ نشاطیہ معاملات کی ترجمانی میں کہیں بھی معاملہ بندی کی طرف اپنا رجحان ظاہر نہیں کرتے۔ چھیڑ چھاڑ اور لاگ ڈانٹ کا پہلو بھی ان کے یہاں نمایاں نہیں ہوتا۔ کھل کھیلنے کی فضا بھی ان کے یہاں نظر نہیں آتی۔ وہ تو ایک معصوم اور متوازن انسان کی ان مسرتوں کو پیش کرتے ہیں جو جذباتی اور جمالیاتی تسکین کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو کر مختلف صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ ولی کے یہ اشعار اسی صورت حال کے عکاس اور ترجمان ہیں ؎

ہر تار میں زلف کے تری سیر جا کروں — بادِ صبا کا ساتھ لیا ہوں چمن میں جا

چاہتا ہے اس جہاں میں گر بہشت — جا تماشا دیکھ اس رخسار کا

ولی دیکھا جو اس انکھیاں کے ساقی کوں دو جام سے — ہوا ہے بے خبر عالم سوں ہو اخوار ان نام اس کا

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کو — بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

دیکھ کر تجھ نگاہ کی شوخی   ہوشِ عاشق رمِ غزال ہوا

ترے جلوے سوں اے ماہِ جہاں تاب   ہوا دل سربسر دریائے سیماب

جب سوں دو نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجیب   دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

آیا توں کمر باندھ کے جب جور و جفا پر   میں جی کوں تصدق کیا تجھ بانکی ادا پر

بزمِ دلبر میں اے ولی جا توں   شوق کا آج ہاتھ لے ساغر

جب سوں وہ گل بدن ہے میرے پاس   گلشنِ دل تمام ہے خوش باس

جب ٹک چال سجن کی مجھے یاد آتی ہے   دل مرا رقص میں آتا ہے مثالِ رقاص

کر مضطرب میں عاشق بے دل عجب نہیں   وحشی ہوئے ہیں تیری انکھاں دیکھ کر غزال

شراب شوق سوں سرشار ہیں ہم   کبھو بے خود کبھو ہشیار ہیں ہم
دو رنگی سوں تری اے سروِ رعنا   کبھو راضی، کبھو بے زار ہیں ہم
ترے تسخیر کرنے میں سری جن   کبھو ناداں کبھو عیار ہیں ہم
ولی وصل و جدائی سوں سجن کی
کبھو صحرا کبھو گلزار ہیں ہم

جیوں نسیم اب لگ سبک روحی مجھے حاصل نہیں   کس طرح اس غنچۂ بند قبا کو وا کروں

اے دل شتاب چل کہ تماشے کی بات ہے   بیٹھا ہے آفتاب نکل ماہتاب میں

خوبرو خوب کام کرتے ہیں   یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دل لجاتے ہیں اے ولی میرا   سروِ قد جب خرام کرتے ہیں

یک بات ہے ولی کی سنو کان دھر سجن   میری انکھاں کے باغ میں دائم رہا کرو

حالِ دل پر ولی کے اے جاناں   نظرِ لطف گاہ گاہ کرو

دل کوں ہوتی ہے سجن بے تابی   زلف کوں ہاتھ لگایا نہ کرو

سجن ٹک ناز سوں مجھ پاس آ آہستہ آہستہ
چھپی باتیں ابس دل کی سنا آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گل رو سوں ۔۔۔ خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا ۔۔۔ کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

کروں کیا اے سجن مجھ پہ ترا افسوں نہیں چلتا ۔۔۔ وگر نہ اک اشارت میں پری مجھ گھر چلی آوے

اگر موہن کرم سوں مجھ طرف آوے تو کیا ہووے ۔۔۔ ادا سوں اس قدِ نازک کوں دکھلاوے تو کیا ہووے

مجھے اس شوخ کے ملنے کا دائم شوق ہے دل میں ۔۔۔ اگر یک بار سوں آ کے گلے مل جاوے تو کیا ہووے

ولی غنچہ نمن اک رات اس ہستی کے گلشن میں ۔۔۔ اگر مجھ بر میں وہ گل پیرہن ہووے تو کیا ہووے

دیکھنے سوں سیر نہیں ہوتا ولی ۔۔۔ مدعا اس کا کنار و بوس ہے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن ۔۔۔ باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

ان اشعار میں زندگی کے نشاطیہ پہلو کا احساس ہے۔ ان میں مسرت و انبساط کے خیالات کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ ان میں حواس کی تشنگی ہے۔ ایک انسان کے حواس کو کاروبارِ شوق میں جن مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی تفصیل و جزئیات ان میں مختلف زاویوں سے اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت انفعالیت پسندانہ نہیں ہے۔ ان میں تو محبوب کے حسن کو دیکھنے، اس سے قربت حاصل کرنے اور اس قربت سے لطف اندوز ہونے کی خواہش اور آرزو نمایاں ہے۔ ولی نے ان اشعار میں مختلف زاویوں سے اسی خواہش اور آرزو کا اظہار کیا ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان میں مسرت کا پہلو نمایاں ہے۔ ولی کاروبارِ شوق میں اس مسرت کے خیال کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہی مسرت حاصلِ عشق اور مقصدِ حیات ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ محبوب کو دیکھتے، اس کی تلاش و جستجو کرتے، اس کو سراہتے، اس کے قریب پہنچتے، اس کے ساتھ تعلقات کو بڑھاتے اور رشتے کو استوار کرتے نظر آتے ہیں ـــ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی کیفیت اور افتادِ طبع کی ضرورت ہے۔ ولی کے پاس یہ مخصوص ذہنی کیفیت اور افتادِ طبع موجود ہے۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں ہیں۔ ان کے پاس زندگی کا ایک رجائی نقطۂ نظر ہے۔ وہ زندگی کی نعمتوں سے محروم رہنا نہیں جانتے۔ اس قسم کے معیار رکھنے والا انسان عشق و عاشقی میں انفعالیت پسندی کا اظہار نہیں کرتا۔ ولی کے عشق میں انفعالیت پسندی نہیں ہے۔ اسی لئے ان کے تغزل میں بھی یہ رجحان نظر نہیں آتا۔ اس میں تو ولولے کی گرمی ہے۔ جوش کی حرارت ہے۔ جذب و شوق کی روشنی ہے وہ تو زندگی اور جولانی سے معمور ہے۔ اور اس میں حدِ نظر تک نشاط و انبساط کی چاندنی سی چھٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔

ولی نے اپنے تغزل میں جہاں بھی عاشق کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔ وہاں اس کی وضاحت ضرور کی ہے کہ وہ شرابِ شوق سے سرشار ہے اس میں بڑی زندگی اور جولانی ہے۔ وہ محبوب کا نظارہ بڑے ذوق و شوق سے کرتا ہے۔ اور اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اس پر ایک سرخوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کا دل سر بسر ایک دریائے سیماب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ شوق کا ساغر ہاتھ میں لے کر بزمِ دلبر میں پہنچتا ہے۔ اس کی بانکی ادا پر دل کو تصدق کرتا ہے۔ لیکن اس کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ محبوب کو بھی اس پہ پیار آئے اور وہ اس پہ فدا ہونے اور جان نثار کرنے کے لئے تیار ہو جائے ـــ یہ کیفیت عاشق میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس کو اپنی اہمیت کا احساس ہو، اور جب وہ یہ خیال نہ قائم کرے کہ وہ محبوب کے مقابلے میں کم حیثیت ہے۔ ولی کے تغزل میں عاشق کے کم حیثیت ہونے کا تصور نہیں ملتا۔ وہ تو عاشق کو ایک جاندار باعمل اور زندگی سے بھرپور شخصیت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں یہ عاشق کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ وہ زندگی سے بیزار نظر نہیں

آتا۔ وہ تو زندگی کو بسر کرنا اور برتنا جانتا ہے — اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے رس نچوڑنا اور اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینا اس کے مزاج میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ولی کی غزل اس عاشق کے مزاج، افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کی بہت اچھی مثالیں پیش کرتی ہے اور ان کا تغزل اس صورتِ حال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مخصوص رنگ و آہنگ سے پہچانا جاتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ولی کا تغزل عشق کی داخلی واردات و کیفیات سے خالی ہے۔ ان کی غزل میں اس نشاطیہ پہلو کے دوش بدوش عشق کی داخلی واردات و کیفیات کی ترجمانی بھی مل جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا پلّہ اس میں بہت بھاری نہیں ہے۔ مجموعی طور پر تو اس پر نشاطیہ پہلو ہی غالب نظر آتا ہے لیکن راہِ عشق کے مسافر کو اپنے سفر میں مختلف منزلوں سے آشنا ہونا پڑتا ہے۔ اس میں کچھ منزلیں ایسی بھی آتی ہیں جب نشاطیہ پہلو پس منظر میں جا پڑتے ہیں اور ناکامی کا خیال اور محرومی کا احساس اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور محسوس کرتا ہے۔ کسی نہ کسی چیز کے حسبِ خواہش نہ ملنے کی خلش اس کے دل میں ضرور باقی رہتی ہے۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں نشاطیہ پہلو کے ساتھ ساتھ رنج و غم کا احساس ہمیشہ سائے کی طرح چلتا ہے انسانی زندگی کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہر نشاطیہ خیال کی منزل رنج و الم اور حزن و یاس ہے —— پھر عشق و عاشقی کی راہ پر چلنے والا تو اپنے اس سفر میں عجیب و غریب نشیب و فراز سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس کو وصل کی لذت نصیب ہوتی ہے۔ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے، لیکن دیکھتے دیکھتے وصل کے یہ لمحے ہجر و فراق کی گھڑیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان کا شکار ہو کر ایک محروم، مایوس، ناکام و نامراد شخص رہ جاتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ عاشق کی حس بہت تیز ہوتی ہے اور اس حس کی تیزی کی وجہ سے بعض اوقات وصل کو بھی ہجر تصور کر لیتا ہے۔ محبوب کی وفا بھی اسے بے وفائی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کے لطف و اعتنا کو بھی جور و جفا تصور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی عالم میں وہ شاعری پیدا ہوتی ہے جس کو داخلی اور غنائی شاعری سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اور جو غزل کی صنف کے لئے ہمیشہ معیار سمجھی جاتی ہے۔ ولی کی غزل میں یہ داخلی اور غنائی شاعری موجود ہے۔ اور اس رجحان نے اس کو صحیح تغزل سے آشنا کر کے بہت بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔

یہ رجحان ولی کے بعض ایسے اشعار میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے جن کی نوعیت تو نشاطیہ ہے لیکن جن میں محبوب کے سامنے سپردگی کا احساس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اس کے مقابلے میں خود عاشق کی ایسی کچھ زیادہ اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ جب وہ محبوب کی ذات سے قربت حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی انفرادیت تک کی بازی لگا دیتا ہے اور سوائے محبوب کی ذات کے اس کو کسی چیز کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی۔ ولی کے تغزل کے یہ وہ مقامات ہیں جہاں ان کی ذات محبوب کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ وہ اُس پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ اس کی ذات میں گم ہو جاتے ہیں۔ اپنے خونِ جگر سے اُس کے حسن میں رنگینی پیدا کرتے ہیں —— اور پھر اس کو دیکھنا، اس کا منہ تکنا، اس کی طرف ٹکٹکی لگائے رکھنا، اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر رقص کرنا ان کے مزاج کا جزو بن جاتا ہے۔ یہ اشعار اسی عالم کی تخلیق ہیں:۔

تن ہیں سرمہ کر کے بسا تجھ نین میں جا　　　ہو بوئے گل بسا ہوں ترے پیرہن میں آ

ٹک ولی کی طرف نگاہ کرو　　　صبح سوں منتظر ہے درشن کا

صورتِ تسکیں نہیں دستی مگر اس حال میں　　　اے ولی جب پیو نہ پوچھے حال مجھ مسکین کا

کہتا ہے ولی پکار یو بات　　بندہ ہے پیا کی دلبری کا

اغماض کیا، جلتا رہا، مجکوں نہ پوچھا　　کیا اس کوں مرے حال پہ کچھ پیار نہ آیا

لے ولی رات دن ہے دل میں مرے　　اُس پری رو کے دیکھنے کی آس

عاشق مدام حال پریشاں سوں شاد ہے　　آشفتگی کے بیچ ہے دائم فراغ دل

اے ولی گر مہرباں ہو وہ چمن آرائے حسن　　خاطرِ ناشاد ہووے رشکِ گلزار جناں

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں　　شہیدِ شاہدِ گل گوں قبا ہوں

ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق　　سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا　　طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

یک بات ہے ولی کی سنو کان دھر سجن　　میری انکھاں کے باغ میں دائم رہا کرو

شرابِ شوق سوں سرشار ہیں ہم　　کبھو بے خود کبھو ہشیار ہیں ہم
دو رنگی سوں تری اے سرو رعنا　　کبھو راضی کبھو بیزار ہیں ہم
ترے تسخیر کرنے میں سری جن　　کبھو ناداں کبھو عیار ہیں ہم
ولی وصل جدائی سوں سجن کی
کبھو صحرا، کبھو گلزار ہیں ہم

ان اشعار میں ایک داخلی آہنگ موجود ہے۔ اور اسی داخلی آہنگ نے ان کو واردات و کیفیات کا روپ دے دیا ہے۔ اور ان میں کسی حد تک ایک غنائی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔ باعتبارِ مضامین یہ اشعار بہت سیدھے سادے ہیں۔ ان میں کوئی بہت پُرپیچ اور تہہ در تہہ جذبہ بھی نہیں ہے یہ سیدھی سادی جذباتی کیفیات کے حامل ہیں۔ لیکن ان میں ایک دلکشی اور دل آویزی نظر آتی ہے۔ یہ دلوں پر اثر کرتے ہیں۔ ان کا تاثر گہرا ہوتا ہے محسوس کرنے والے کو ان میں گہری معنویت کی جھلکیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں اور وہ ان کی سادگی میں پرکاری بھی دیکھنے لگتا ہے۔ تن پیس کر سرمہ کرنا اور نین میں جا بسنا، بوئے گل بن کر پیرہن میں آباد ہونا، صبح سے شام تک دیدار اور درشن کا منتظر نظر آنا، محبوب کے حال نہ پوچھنے کی صورت میں تسکین کا نظر نہ آنا، پیا کی بندگی کا اظہار کرنا، محبوب کو اپنی طرف ملتفت نہ دیکھ کر اس کے اغماض کا شکوہ سنج ہونا، شب و روز محبوب کے دیکھنے کی آس رکھنا، عاشقی کو پریشانی کا مترادف سمجھنا، فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہونا اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر ہم مشربِ رنگِ حنا ہو جانا اور وصل و جدائی کے نتیجے میں کبھی صحرا اور کبھی گلزار ہونے کے خیالات اگرچہ نئے اور اچھوتے نہیں ہیں لیکن ان سب میں مجموعی طور پر ایک جذب و کشش کی کیفیت ضرور نظر آتی ہے ــــ اس کا سبب ان اشعار کا داخلی رجحان ہے جس نے حقیقت اور واقعیت سے ہم آہنگ ہو کر ان کو انسان دوستی اور انسانیت پسندی سے بہت قریب کر دیا ہے ــــ اور اس طرح ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

ولیؔ کے تغزل میں اس رجحان کا شباب تو اس وقت نظر آتا ہے جب بعض مخصوص حالات اور ذہنی کیفیات کے زیر اثر وہ اپنی محرومی اور ناکامی کا بیان کرتے ہیں — جب اُنہیں خیال آتا ہے کہ محبوب ان سے دور ہے اور وہ اس کی نگاہِ التفات سے ناآشنا ہیں۔ جب وہ یہ سوچتے ہیں کہ کسی کی یاد میں تڑپنا ان کا معمول بن گیا ہے اور اسی وجہ سے انہیں رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ بس گریہ وزاری ان کا مشغلہ رہتا ہے۔ جب ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ محبوب سے جدائی ان کا مقدر بن گئی ہے اور وہ برہ کی آگ میں جلنے لگے ہیں۔ جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں کسی بات پر کچھ اختیار نہیں۔ جب انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ عشق نے انہیں بیکار بنا دیا ہے اور وہ کسی کام کے نہیں رہے ہیں۔ جب انہیں اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ عشق زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور اس سے کسی قسم کی توقع بے سود ہے تب وہ بعض ایسی واردات و کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ ان واردات و کیفیات کی ترجمانی میں ان کے یہاں شدید داخلی آہنگ ملتا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ جن جذباتی اور ذہنی تجربات کو پیش کرتے ہیں ان سب میں غنائی کیفیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ولی کے تغزل میں ایسے مقامات ذرا کم ہی آتے ہیں لیکن جہاں آتے ہیں وہاں ان کی غزل اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ اشعار ان کی غزل کے اسی رجحان کے ترجمان ہیں:-

آج کی رین مجھ لوں خواب نہ تھا — دونوں انکھیاں میں غیر آب نہ تھا
آہ پر آہ کھینچتا تھا میں — آج کی رات کچھ حساب نہ تھا
کیا سبب تھا جو تو نہیں آیا — کہ اُسے مجھ ستی حجاب نہ تھا

گلہ شوخ اے ولیؔ کرنا
ہر کسی کن تجھے صواب نہ تھا

عجب نئیں اُٹھ کے بے تابی سوں ہر جائے — سنے گر ماجرا دریا ہمارے اشکِ جاری کا

سجن تجھ انتظاری میں رہیں نس دن کھلی انکھیاں — مثالِ شمع تجھے غم میں رو رو بہہ چلی انکھیاں

تجھ عشق میں دیکھا ہے یہ دل مشرق و مغرب — یہ حالتِ دل دامنِ صحرا پہ لکھا ہوں

طاقت نہیں کسی کو کہ یک حرف سُن سکے — احوال گر کہوں میں دلِ بے قرار کا

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا

اس شوخِ شعلہ رنگ سوں جب سوں لگی لگن — جلتے ہیں تب سوں شعلہ نمن اس لگن میں ہم

کیونکر چھپا سکوں میں تجھ درد کی حقیقت — ہے کام آہِ دل کا افشائے راز کرنا

قرار نہیں ہے مرے دل لے سجن تجھ بن — ہوئی ہے دل میں مرے آہ شعلہ زن تجھ بن

گل کے چراغ گل ہوں یک بار جھڑ پڑیں سب — مجھ آہ کی حکایت بولیں اگر صبا سوں

یہی ہے آرزو دل میں کہ صاحب درد کئی جا کر — ہمارے درد کی باتاں کہے اس پی پیارے کوں

بس کہ رویا ہوں یاد کر کے تجھے — چشم میری ہے دامنِ گُل چیں

اے نورِ جان و دیدہ ترے انتظار میں — مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں

نہ پوچھو آہ و زاری کی حقیقت — عزیزاں عاشقی کا مقتضا ہے

آشنا ہی نہیں تو جاتا ہوں — کیا کروں جی اُداس ہوتا ہے

تجھ جدائی میں نہیں اکیلا میں — درد و غم آس پاس ہوتا ہے

آ اے مہر دو ہفتہ مرے پاس ایک روز — ہر آن تجھ فراق کی بیتنے یہ سال ہے

فیض سوں تجھ فراق کے ساجن — چشم گریاں کا کام جاری ہے

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولی حیران ہے یاراں عجب اپنے تماشے پر — ادھر چشم کی کالی ہے اُدھر لڑکوں کی تالی ہے

اور مجھ پاس کیا ہے دینے کوں — دیکھ کر تجھ کوں روتے دیتا ہوں

ان اشعار میں ہجر و فراق کا جو تذکرہ ہے۔ دلِ بے قرار کی کیفیت کا جو بیان ہے، محبوب کی بے التفاتی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اضطراب کی جو تفصیل ہے، عشق کی آگ میں جلتے رہنے کا جو ذکر ہے، محبوب کی یاد میں خون رونے کا جو بیان ہے اس کے انتظار میں چشم براہ رہنے کی کیفیت کا جو اظہار ہے، عاشق کے اداس رہنے، غم کھانے اور فراقِ یار میں گریہ و زاری کرنے کی جو جزئیات ہے یہ تمام مضامین ولی کی غزل کے داخلی مزاج کو ظاہر کرتے ہیں ان مضامین نے ولی کی غزل میں سوز و گداز کو پیدا کیا ہے اور یہ ایسی خصوصیت ہے جس کے بغیر عشقیہ شاعری میں گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ ولی نے ان مضامین کو پیش کر کے اپنی غزل میں اس گہرائی کو پیدا کیا ہے۔ یہ ولی کے تجربات ہیں —— ان میں صداقت اور اخلاص مندی کا لہو ہے اسی لئے یہ تاثر سے بھرپور نظر آتے ہیں اور ان کا اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ یہ دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

یہ واردات و کیفیات کسی ایسے شخص کے یہاں پیدا نہیں ہوسکتیں جو مزاجِ عشق سے آشنا نہ ہو۔ ولی اس سے پوری طرح آشنا ہیں اور اس کی مزاج دانی کا پورا شعور رکھتے ہیں —— انہوں نے عشقیہ معاملات کی حقیقتوں کو محسوس بھی کیا ہے۔ وہ حواس کے راستے سے بھی ان حقائق تک پہنچے ہیں اور اسی طرح عشق و عاشقی کا ایک پورا نظام ان کے سامنے بے نقاب ہو گیا ہے۔ ان کے بکھرے ہوئے خیالات کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے تو اس کی ایک بہت واضح تصویر بنتی ہے۔ ان کے خیال میں عشق ایک باقاعدہ نظام رکھتا ہے، بلکہ وہ بذاتِ خود ایک نظام ہے۔ وہ زندگی میں اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بغیر زندگی ان کے خیال میں نامکمل رہتی ہے۔ اس سے انسان کو جینے کا مزہ آتا ہے۔ زندگی بسر کرنے کا ایک لائحہ عمل ملتا ہے۔ عشق کو وہ ایک نصب العین، نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات بھی سمجھتے ہیں۔ اس سے زندگی کو ایک راستہ مل جاتا ہے، اور وہ اسی پر گامزن ہو جاتی ہے۔ عشق کا مسرت اور انبساط کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ وہ اس مسرت اور انبساط کو فراہم کرتا ہے۔ اس کا احساس دلاتا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرتا ہے۔ غم بھی اس کا ایک اہم پہلو ہے۔ لیکن عشق اس غم کو بھی مسرت بنا دیتا ہے۔ راہِ عشق کے مسافر اس غم کو بھی مسرت ہی تصور کرتے ہیں، اور اس میں بھی انہیں لطف آتا ہے۔ کیونکہ وہ اس غم کو اپنے لئے گوارا بنا لیتے ہیں۔ اس غم کا عرفان بھی عشق ہی کی بخشی

ہوئی دولت ہے جو کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہوتی۔ غرض عشق ولی کے خیال میں انسان کو جذباتی، ذہنی اور جسمانی اعتبار سے رفعت اور ترفع سے ہمکنار کرتا ہے۔

عشق و عاشقی کے بارے میں یہ خیالات ولی کے یہاں کسی مفکرانہ اور فلسفیانہ انداز میں ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے تغزل میں جن معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی کی ہے انہیں میں اُن کے یہ خیالات و نظریات اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ان کو یکجا کیا جائے تو ان کے تصورِ عشق کا ہیولا تیار ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے سیدھے سادے انداز میں بھی ان خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ مثلاً عشق کے بارے میں ان کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار بھی مل جاتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

مجھے بولا کہ گر عشقِ حقیقی سوں تم واقف نہیں
تو بہتر یو ہے جا دو من پکڑ عشقِ مجازی کا

سنیا ہوں جب سوں نکتہ ولی تفسیرِ سخن سیتی
لگیا ہے تب سوں شیوہ جی کو میرے عشق بازی کا

دل میں جب عشق نے تاثیر کیا
فردِ باطل خطِ تدبیر کیا

نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانا تم
کہ ہے عشاق کا مسکن کبھو صحرا کبھو پربت

ان نے پایا ہے منزلِ مقصود
عشق جس کا ہے ہادی و رہبر

حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشقِ مجازی ہے
وہ پاوے شرح میں مطلب پڑھے جو متن ہرگز

عشق کے ہاتھ سوں ہوئے دل ریش
جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

عاشق مدام حالِ پریشاں سوں شاد ہے
آزردگی کے بیچ ہے دائم فراغِ گل

دروازۂ حقیقت جس نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرناں

گر عشق میں آیا ہے تو لے دل کو بیاں پارہ کر
لیتے ہیں اس بازار میں بے تابیِ سیماب کوں

ہوا معلوم تجھ ملنے سوں لالن
کہ رنگیں ہے بہارِ آشنائی

کیوں نہ آوے نشۂ غم سوں دماغِ عاشقی
بادۂ حیرت سوں ہے لبریز ایاغِ عاشقی

ولی جو عشق بازی میں حقیقت سوں نہیں واقف
سحر اس کا قیامت میں گلِ باغِ ندامت ہے

عشق میں صبر و رضا درکار ہے
فکرِ اسبابِ وفا درکار ہے

عشق کی راہ کے مسافر کوں
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

ایسے اشعار کی تعداد ان کی غزلوں میں ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن جتنے بھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ولی زندگی کے لئے عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ عشقِ مجازی ہو چاہے عشقِ حقیقی دونوں میں انہیں انسانی زندگی کی معراج دکھائی دیتی ہے ۔۔۔ وہ اس بات کے بھی قائل

ہیں کہ اگر کسی کی رسائی عشقِ حقیقی تک نہیں ہے تو اس کو چاہئے کہ عشقِ مجازی کو غنیمت سمجھے۔ کیونکہ اس کے بغیر زندگی کی دشوار گزار منزلیں آسان نہیں ہو سکتیں۔ جب یہ نکتہ انسان کے ہاتھ آ جاتا ہے تب وہ شیوۂ عشق کو اختیار کرکے زندگی کے سفر کے راستے پر گامزن ہوتا ہے۔ اس سفر میں عشق اس کا ہادی و رہبر بن جاتا ہے اور وہ اس کی رہبری میں منزلِ مقصود سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے ہی کے لئے لوگ عشق کی تکلیفوں کو برداشت کرتے اور اس کے غم کو گوارا بناتے ہیں۔ بلکہ یہ غم اور اس کا عرفان تو ان کے لئے ایک دولتِ بے بہا بن جاتا ہے کیونکہ اس طرح انہیں زندگی بسر کرنے اور برتنے کی چیز معلوم ہونے لگتی ہے اور اس کی حقیقت ان پر روشن ہو جاتی ہے۔ صبر و رضا، وقار، رکھ رکھاؤ اور بردباری، ایثار، قربانی، جرأت، ہمدردی غرض اس قسم کی ان گنت خصوصیات اس کے کردار کا جز بن جاتی ہیں —— اور یہی عشق و عاشقی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ولی کے اس تصورِ عشق میں تصوف کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔ ان کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ تصوف سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور انہیں یہ مسلک بہت عزیز تھا۔ اس کے اثرات ان کے تغزل میں بھی موجود ہیں۔ یہ تصوف ہی کا اثر ہے کہ ان کے یہاں عشق و عاشقی کا تصور رفعت اور ترفع سے ہمکنار نظر آتا ہے، اور اس سلسلے میں انھوں نے جتنی باتیں بھی کہی ہیں ان میں پاکیزگی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ولی کا عشق بہت مہذب ہے۔ اس میں بڑی ہی شائستگی ہے۔ بڑا ہی وقار اور رکھ رکھاؤ ہے —— اور اس کا سبب تصوف سے ان کی گہری وابستگی ہے۔ تصوف ہی نے ان میں یہ خصوصیات پیدا کی ہیں۔ اگر ولی کو تصوف سے اتنا لگاؤ نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ان کی خارجیت پسندی نشاطیہ افتادِ طبع کے ساتھ مل کر عشقیہ معاملات کی ترجمانی میں کچھ ایسی صورتیں اختیار کرتی جو عام طور پر معاملہ بند شعرا کے یہاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے شاعر عشق کے اعلیٰ معیار نہیں رکھتے اور عشق سے کہیں زیادہ اپنی شاعری میں ہوس کی باتیں کرتے ہیں۔ ولی کا تغزل اس سے محفوظ رہا ہے کیونکہ تصوف نے اس میں جذباتی اور ذہنی اعتبار سے ایک تہذیب پیدا کر دی ہے۔ ولی کے یہاں عشقِ مجازی کی حدیں عشقِ حقیقی سے اور عشقِ حقیقی کی حدیں عشقِ مجازی سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کا سبب بھی درحقیقت تصوف ہی کی روایت ہے جس کا رنگ اُن کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔

تصوف کے ساتھ اس گہری وابستگی نے ولی کے عشق میں تہذیب و شائستگی ہی پیدا نہیں کی ہے۔ اُن کی غزل کو بعض نئے موضوعات بھی دئے ہیں۔ محبوبِ حقیقی کے خیالات، عشقِ حقیقی کے تصورات، معرفت اور عرفان، معاملات اور حیات و کائنات کے مسائل کو بھی ولی نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ہر چند کہ ان کے یہاں ان موضوعات کا پلّہ حسن و عشق کے مجازی اور دنیاوی تصورات کے مقابلے میں ایسا کچھ بھاری نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ولی نے ان موضوعات کی ترجمانی میں اس انداز و اسلوب کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے جو ان کے تغزل کی بنیاد ہے اور جس نے ان کی غزل میں ایک انفرادی شان پیدا کی ہے۔ تصوف کے اثر سے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کچھ اس قسم کے موضوعات کو پیش کیا ہے ؂

ہر ذرّہ اس کی چشم میں لبریزِ نور ہے — دیکھا ہے جن نے حسنِ تجلّی بہار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہوا ہے مجھ پہ شمعِ بزم یکرنگی سوں یہ روشن — کہ ہر ذرّے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

دل کوں گر مرتبہ ہے درپن کا — مفت ہے دیکھنا سریجن کا

عبث غافل ہوا ہے۔ فکر کر یو کے پانے کا — صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

کیوں ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب — تجھ حسن کی اگن کا ہے یک انگر آفتاب

کرچاک گریباں کوں گلدہ کر کے چمن میں — آئے ہیں ترے شوق میں پڑے سوں نکل کر

اس گل کے گر وصال کی ہے دل میں آرزو — شبنم نمن تمام انکھیاں اپنی تر کرو

کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے — جلوہ گر آفتاب سیا ہے

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے — کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر — مشتاق نہیں سکندری کا

پھیکی لگے اس کوں شانِ دولت — چاکھیا جو مزہ قلندری کا

ازبس کہ زندگی میں یوں محو ہوں ولی میں — مشکل ہوا اجل کوں کرنا سراغ میرا

جب لگ ہے آسمان و زمیں جگ میں برقرار — جیوں پھول اس جہاں کے چمن میں ہنسا کرو

یہ اشعار عرفانِ حق اور عرفانِ حیات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں تغزل کا مخصوص رنگ و آہنگ موجود ہے۔ ان کی مجموعی فضا حسن و عشق کی فضا ہے۔ حالانکہ ان میں زندگی کے حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ ولی ان حقائق کی ترجمانی میں کسی فکری آہنگ کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان حقائق تک احساس اور جذبے کے راستے پہنچتے ہیں۔ لیکن اس سے انہیں ایک ... فائدہ یہ کہ اس طرح ان موضوعات کی ترجمانی میں بھی وہ اس سوز و گداز کو قائم رکھ سکے ہیں جو تغزل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

... بات یہ ہے کہ ولی تغزل کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ اس کی مزاج دانی کا شعور ان کے یہاں اس حد تک موجود ہے کہ وہ خود ان کا مزاج بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر بات تغزل کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ غزل کے بہت بڑے فن کار اور اس صنعت کے ایک بلند پایہ خالقِ جمال ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تغزل کی صحیح فضا پیدا کی ہے۔ حسن و عشق کا رنگ ان کے یہاں رچا ہوا ہے۔ خارجیت اور داخلیت کے متوازی امتزاج سے انہوں نے اس تغزل کو بہت دلکش بنایا ہے۔ فنی اور جمالیاتی اعتبار سے ان کے تغزل میں ایک نئی زندگی نظر آتی ہے۔ اس میں بڑی ہی تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔ بڑی ہی رنگینی اور پرکاری دکھائی دیتی ہے۔ اس میں بڑی ہی روانی اور موسیقیت ہے۔ بڑی ہی نغمگی اور غنائی کیفیت ہے۔ رمزیت اور ایمائیت کا پہلو بھی اس میں خاصا نمایاں ہے۔ علامتوں اور اشاروں کے استعمال نے بھی اس میں بڑی دلکشی پیدا کی ہے تشبیہات و استعارات کی جدت اور اُپج نے بھی اس میں عجیب و غریب رنگ بھرے ہیں۔ زبان بھی اس میں ایک فن کارانہ انداز سے استعمال ہوئی ہے — اور ان سب باتوں نے مل کر جہاں تک غزل اور تغزل کا تعلق ہے انہیں ایک بہت بڑا خالقِ جمال بنا دیا ہے۔ یہ چند اشعار ان کی اس تخلیقِ جمال کے بہت اچھے نمونے ہیں:-

کفارِ فرنگ کوں دیا ہے — تجھ زلف نے درس کافری کا

اے گلِ باغِ حسن مُکھ سوں ترے جلوہ پیرا ہے رنگ و بوئے حیا

سیرِ صحرا کی توں نہ کر ہرگز دل کے صحرا میں گر خدا پایا

معنی طرف چلیا ہے صورت سوں لیے مرادِ دل سورت ستی چلیا ہے کعبے جہاز گویا

دسے سوکھے سوں تجھ انکھیاں کی پودھ کہ جیوں برچھی پکڑ نکلا ہے رجپوت

تیری بھواں کوں دیکھ کے کہتے ہیں عاشقاں ہے شاہ جس کے نام چڑھی یو کمان آج

گنہگار داں کیا ہوں اپس کے نین ستی آلے صنم شتاب ہے روزِ بہان آج

ہجر تیرے سوں اے پری پیکر اشک پڑتے ہیں چشم سیں ٹپ ٹپ

ترے فراق میں ہر آہ اے کماں ابرو گئی ہے چرخ پہ تیرِ شہاب کے مانند

عجب اس شوخِ چنچل کی انکھاں ہیں شوخ اور چنچل ہوئے قرباں جس اوپر آ ہوئے صحرا نشیں آکر

سب گیا دن شام کوں آیا نہ پاس نین کے قلزم میں اب ڈوبی ہے آس

اگر آبرو تجھ کوں درکار رہے نہ جا خوبرویاں کی کشور طرف

اے آفتابِ طلعت دل پر مرے نظر کر تا ایک گھڑی میں آدے تجھ پاس مثلِ شبنم

صنم کے لعل پہ وقتِ تکلم رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم

یوں دو رشاں کے ہجر سوں داغاں ہیں سینے پہ ولی صحرا کے دامن کے اُپر جیوں نقشِ پائے رہرواں

لگتا ہے اس گروہ میں وہ سروِ نازنیں گویا گلِ گلاب کیا جلوہ گھاس میں

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

کروں جب آہ و نالہ کا علم برپا ترے غم میں مرے انجھواں کی فوجاں سوں ندی کا پل پسل جاوے

اس کے پیچاں کا کچھ شمار نہیں زلف ہے یا کہ موجِ دریا ہے

اے سجن ایک بات ہے لیکن اسے بوجھتا ہے وہ کہ جس کوں ہوش ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال ہندوئے ہر دوار باسی ہے

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر ناگنی جیوں کنویں پہ پیاسی ہے

مفلسی بے کسی کی فوجاں نے شہرِ دل کوں کیا ہے ویراں آج

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں ۔ ولی کا دیوان تو اس طرح کی فن کارانہ سحر کاری یا سحر کارانہ فن کاری سے بھرا پڑا ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ولی ایک تخلیقی مزاج رکھتے ہیں۔ ان کے اس تخلیقی مزاج کی تشکیل و تعمیر میں ان کے تخیل نے بڑا کام کیا ہے۔ اس تخیل نے ان کے تغزل میں بڑی گل کاریاں کی ہیں۔ بڑے شوخ اور جاذبِ نظر رنگ بکھیرے ہیں۔ ان کے یہاں جو نئی تشبیہات اور اچھوتے استعارات ہیں۔ اور ان تشبیہات و استعارات سے کام لے کر انہوں نے اپنے تغزل میں جو نئے نئے پیکر تراشے ہیں اس میں ان کے تخیل کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کا یہ تخیل اس میں شبہ نہیں کہ بہت بلند پرواز ہے لیکن اس کے باوجود اپنی حدود میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فن اپنے آپ سے بیگانہ نہیں ہوتا۔ اس کی جڑیں ان کے ماحول میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فارسی تغزل کی روایت سے انہوں نے استفادہ کیا ہے اور مجموعی طور پر اس کے اثرات ان کے فن میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سے کہیں زیادہ انہوں نے اپنے مقامی ماحول اور آس پاس اور گرد و پیش کی فضا سے اثرات قبول کئے ہیں۔ اور ان اثرات کی جھلکیاں ان کے فن میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعرانہ پیکر تراشی میں خصوصیت کے ساتھ یہ اثرات بہت نمایاں ہیں۔ زبان کے استعمال میں بھی ان اثرات کا بڑا ہاتھ ہے۔ ولی کی امیجری میں جو مقامی ماحول کا رنگ اتنا نمایاں نظر آتا ہے اور زبان میں ہندی کی آمیزش دکھائی دیتی ہے وہ انہیں اثرات کا نتیجہ ہے۔ ان کی زبان میں جو شیرینی حلاوت اور لہجے میں جو لوچ اور بانکپن ہے اس کو بھی ان کے نجی ماحول کی رنگینی اور پرکاری نے پیدا کیا ہے۔ غرض ولی نے اپنے فن کی بنیادیں اپنے زمانے کی زندگی پر استوار کی ہیں۔ اسی لئے وہ خود بھی زندگی سے ہمکنار نظر آتا ہے۔

ولی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کی روایت کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔ اردو میں تغزل کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس کی محراب میں نئی نئی اقدار کی شمعیں فروزاں کی ہیں۔ فنی معیاروں کے چراغ جلائے ہیں ـــــ اور اس طرح غزل اور تغزل کو ایک نئی زندگی سے آشنا کر کے اس میں ایک انفرادی شان پیدا کی ہے۔

○

"ولی کی عظمت ان کے [illegible] ذوقی تجربات میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ انہوں نے تجربات کو ایک ایسے پیرایہ بیان میں ظاہر کیا ہے [illegible] حسن اور [illegible] کا بے نظیر پیکر اور نمونہ بن گئے ہیں"

ڈاکٹر سید عبداللہ

وارث کرمانی

ناسخ لکھنوی

ناسخ کی شاعری مغل ہندوستان کے دورِ انحطاط کی آئینہ دار ہے۔ اس عام انتشار کے زمانے میں ناسخ کا وطن ان تمام عناصر کی پناہ گاہ بن گیا تھا جنہوں نے اٹھارویں صدی کے مغلوں کو جفاکوشی سے عیش پرستی کی طرف مائل کیا۔ دلی میں آئے دن آفتیں اٹھا کرتی تھیں۔ شمال سے افغان اور جنوب سے مرہٹوں کی فوجیں امڈا منڈ کر آتیں اور اہلِ حکومت اور شہری آبادی دونوں کو اپنی لوٹ مار کا نشانہ بناتی تھیں۔ عیش پرستی کے یہ عناصر اس رستخیز کے متحمل نہ ہو سکے۔ البتہ لکھنؤ میں انہیں کچھ مدت کے لیے ایسی فضا مل گئی جہاں عیش و رنگینی کی بساط بچھ سکی۔ اس بساط کی کشش نے بہت سے شاعروں کو بھی دلی سے لکھنؤ کھینچ لیا۔ چنانچہ سراج الدین آرزو، سودا، میر حسن، قمرالدین منت، جعفر علی حسرت، میر سوز، حیدر علی حیران، میر تقی میر، جرأت، انشا، مصحفی، سعادت یار خاں رنگین دلی چھوڑ کر لکھنؤ کی محفلوں کی زینت بنے۔

یہاں برہان الملک صفدر جنگ اور خاص طور سے نواب شجاع الدولہ کے انتظام و تدبیر کی وجہ سے ایک منظم حکومت قائم ہو چکی تھی جسے بعد میں نواب آصف الدولہ نے زیادہ نرم، حسین اور ادب نواز بنا دیا۔ دلی کے تھکے ہوئے قافلوں نے یہاں مستقل اپنے بستر لگا دیئے۔ اور جی کھول کر دادِ عیش دی۔ تقریباً ایک صدی تک یہاں کی شہری آبادی کے ساتھ یہ مہاجرین بھی راگ رنگ اور عیش پرستی کے نشہ میں ڈوبے رہے۔ تمام فراغت اور بے فکری، تفریح اور تفنن طبع کے نئے نئے سامان بہم پہنچاتی تھی۔ کبوتروں، بٹیروں اور مرغوں کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ بانا، پٹا، بنوٹ اور کشتی کا شغل عام تھا۔ برسات میں باغات اور دریا کی بہاریں منائی جاتی تھیں، جھولے پڑتے تھے۔ میلوں اور تہواروں میں بانکوں اور منچلوں کا زور ہوتا تھا۔ مزاروں اور زیارت گاہوں پر چراغ جلنے سے ڈولیوں پر ڈولیاں ترتی تھیں، طوائفوں کا بازار علیحدہ گرم تھا۔ جہاں زندگی کی رنگینیاں اپنے شباب پر نظر آتی تھیں۔ انہیں مشاغل میں ایک اہم مشغلہ شعر و شاعری کا بھی تھا۔ جسے علمی یا ادبی ریاضت سے زیادہ تعلق نہ تھا۔ ہوسناکی کے جذبات، عاشقوں کی سرگذشت اور شاہدانِ بازاری کی مانگ چوٹی کا ذکر اُس وقت کی غزل کا عام موضوع تھا جو روزمرہ کی عام فہم زبان میں بے تکلف اظہار پاتا تھا۔ اس وقت اعلیٰ غزل کا معیار ہی یہ تھا۔ بڑے بڑے شاعر جن میں زندگی کے سنجیدہ مسائل اور فلسفیانہ خیالات کو نہ صرف نظم کرنے بلکہ شعر کے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت تھی، پبلک کے عام ذوق اور تقاضائے وقت سے مجبور ہو کر اس قسم کی شاعری کرتے تھے۔ طوائفوں کی شوخیاں اور اسبابِ نشاط کے غمزوں کو نئے نئے پہلوؤں سے باندھ کر یہ شاعر دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔ صرف وصال کے مضمون کو مختلف عملی صورتوں میں اس طرح پیش کیا جاتا تھا۔ کہ آج کا ذوقِ سلیم برداشت نہیں کر سکتا۔ شاگردی استادی کا قاعدہ عام تھا۔ اور استادانِ فن اپنے شاگردوں کو مقررہ حدود سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ اس وقت کے شاعر کے لئے فلسفہ و علم سے زیادہ شہری رسوم و آداب، شہری زبان و بیان اور لکھنؤ کی مخصوص تہذیبی نفاست و نزاکت سے واقف ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ یہ شاعری کہی جا سکتی ہے۔ جس میں چہل پہل، تفریح اور طنز و مزاح کے عناصر غالب ہیں۔ اس شاعری میں قنوطیت کے بجائے رجائیت، ماضی کی یاد اور مستقبل کی فکر کی جگہ حال کا عیش، تنہا نشینی و فکر انگیزی کے بجائے مجلس آرائی و خوش طبعی پائی جاتی ہے۔ ذیل میں ایسے اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ جو اُس وقت کے مستند استادوں نے کہے تھے۔ انہیں پڑھ کر پوری فضا سامنے آ جائے گی۔

جرأت

جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم — کل واقفِ راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم — کیا جانئے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر

انشاء

ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت — کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
اُس نے محرم کو سنبھال اور ہی تیاری کی گیند — نہ لگی مجھ کو جب اس شوخ طرحدار کی گیند

مصحفی

بے بے ترا سر جھکا کے چلنا — پھر شرم سے مسکرا کے چلنا
آنا گھر میں تو کھلکھلاتا — اور راہ میں منہ بنا کے چلنا
بے تہ کہ مجھ کو دیکھ پیچھے — پھرتی سے قدم اٹھا کے چلنا
نیچی نظروں سے دیکھنا ہائے — پھر تس پہ نظر چرا کے چلنا
اس اتنی حیا پہ پھر یہ شوخی — بازار میں بن ٹھن کے چلنا

یہ شاعر لکھنؤ کی شہر پناہ کے باہر مطلق نہیں دیکھتے تھے۔ انہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں صدہا سال کا پرشکوہ نظام تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا۔ حد یہ ہے انہیں دریائے گومتی کے اُس پار افق تا افق پھیلے ہوئے کھیتوں کی سرسبزی، ان کے سنوارنے بنانے والوں کے حالات کا بھی کوئی علم نہ تھا۔ وہ صبح سے شام تک اپنی دلچسپیوں میں منہمک رہتے تھے۔ یہ صحیح ہے اس رنگ کے ساتھ ساتھ دہلوی شاعری کا بھی رنگ تھا جس کے بانی میر تھے۔ چنانچہ جرأت اور مصحفی کے یہاں درد انگیز اور مؤثر اشعار بھی ملتے ہیں۔ جن کا سلسلہ بعد کو آتش اور اُن کے شاگردوں تک چلا گیا ہے۔ لیکن عام طور سے اس وقت کا غالب رجحان وہی تھا۔ جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ناسخ اس رجحان کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ ان کا اصل نام شیخ امام بخش[1] تھا۔ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ یا اُس نے متبنیٰ کیا تھا۔ ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ لیکن خدا بخش خیمہ دوز کو لاہور کا بسنے والا بتایا گیا ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ سن تمیز میں لکھنؤ پہنچے اور محلہ ٹکسال میں سکونت اختیار کر لی۔ اور یہیں ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی۔

ناسخ جب شعر کہنے کے قابل ہوئے تو انشاء اور مصحفی کا دور دورہ تھا۔ یہ پہلے محمد تقی خاں ترقی کے یہاں ملازم ہوئے پھر لکھنؤ کے ایک رئیس میر کاظم علی سے متعلق ہو گئے۔ مولفِ گلِ رعنا کے قول کے مطابق انہوں نے محمد تقی خاں ترقی کے یہاں سے شاعری کرنا شروع کی تھی۔ پھر میر کاظم علی کے دربار کا بھی ان کی شاعرانہ پرداخت میں حصہ رہا ہوگا۔ لیکن اس زمانے میں ناسخ نے باقاعدہ شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور بقول محمد حسین آزاد اگر غزلیں کہتے بھی تھے۔ تو مشاعروں میں پڑھنے سے احتراز کرتے تھے۔ مزید برآں اس زمانے کے تذکروں میں جن میں میر حسن اور علی ابراہیم کا تذکرہ اور گلشن ہند بھی ہیں۔ ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ میر کاظم علی کے بعد ناسخ کا تعلق مرزا حاجی کے دربار سے ہو گیا۔ جہاں شعر و شاعری کی محفلیں خوب منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اور انشاء، مصحفی، جرأت، قتیل جیسے شاعر شریک ہوتے تھے۔ ناسخ بھی بحیثیت مبتدی ان محفلوں میں شامل ہونے لگے۔ اس زمانے میں مرزا حاجی کے ساتھ قتیل اور محمد صادق اختر نے ناسخ کی فنی صلاحیتوں کو پہچانا

---

[1] ابن امین اللہ طوفانی نے اپنے تذکرہ میں امام بخش کے ساتھ عبداللہ کا اضافہ بھی کیا ہے۔ عبداللہ نام اور کہیں نہیں ملتا۔ اس تذکرے کو قاضی عبدالودود نے ایڈٹ کیا ہے۔

دوران کی خوب ہمت افزائی کی ۔ ان لوگوں کی شفقت اور توجہ نے ناسخ کے بے استادے ہونے کی تلافی کر دی ۔ ایک روایت ہے کہ انہوں نے اپنا کلام میر تقی میر کو اصلاح کے لئے پیش کیا ۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا ۔ دوسری روایت مصحفی سے اصلاح لینے کی ہے ۔ لیکن مصحفی نے اپنے شاگردوں میں ناسخ کا نام نہیں لکھا ہے ۔ بہرحال مصحفی سے ناسخ کی شناسائی کافی تھی ۔ اور انہوں نے ناسخ کے حق میں بڑی اہم بات لکھی ہے ۔ عبارت درج ذیل ہے ۔

"حصہ نعمت ایوان این خوان بہ شیخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہا است و بفقیر ہم رسوخے از تہ دل دارد مقسوم گشت تخلص خود را ہم باسمی انگاشتہ بطرز ریختہ گویان سادہ کلام در عرصہ قلیل حظ نسخ کشیدہ واز تقضائیش بر قدم ا د خواجہ حیدر علی آتش ہم در رسیدہ ۔"

اس عبارت سے دو نتیجے نکلتے ہیں ۔ اول یہ کہ مصحفی جیسا باکمال استاد نوجوان ناسخ کی اہمیت محسوس کرتا ہے ۔ دوسری بات جیسا کہ صاحب جلوۂ خضر نے استدلال کیا ہے ۔ آتش پر ناسخ کی برتری ہے ۔ بہرحال قرآئن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری میں ناسخ نے اپنے ذوق ہی کو رہنما بنایا ۔ دراں کے دیوان کو پڑھنے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر ۔ دیوان کم از کم میر یا مصحفی کا شاگرد نہیں ہو سکتا ۔ ناسخ کے یہاں جس قوت تخیلہ کا ذریعہ ہے اسے میر درد مصحفی کبھی نہ پڑھنے دیتے ۔ اس قسم کی مبالغہ آرائی جیسا کہ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے ۔ ذہن کے بے لگام ہونے ہی پر ممکن ہو سکتی ہے ۔ لیکن دوسرے علوم میں ناسخ نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ۔ ان کے استاد حافظ وارث علی ان کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے ۔ آزاد نے لکھا ہے کہ علمائے فرنگی محل سے بھی درس و تدریس کا سلسلہ رہا ۔ عربی استعداد معمولی تھی ۔ دیوان کے آخر میں متعدد قطعات فارسی کے درج ہیں ۔ جو ان کی فارسی دانی کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ ناسخ کی علمی قابلیت سے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے یہ الفاظ بھی غور طلب ہیں ۔ تذکرہ نادر کے دیباچہ میں موصوف لکھتے ہیں ۔

"نادر شیخ ناسخ کے شاگرد تھے ۔ اور استاد کی بہت عزت اور بہت قدر کرتے تھے ۔ انہوں نے ایک جگہ شیخ ناسخ کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو صرف ایک بڑا نقاد و شاعر نغز و غزل زبان کا ماہر اور راسخ ہی نہیں ۔ جید استعداد کا عالم بھی سمجھتے تھے ۔ نادر خود عربی اسلامی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے ۔ ان کا ناسخ کو کاشفِ حقائقِ فروع و اصول ، واقفِ دقائقِ معقول و منقول لکھنا محض لفاظی نہیں ہو سکتا ۔"

ناسخ نے قدیم شاعروں کا بھی بخوبی مطالعہ کیا تھا ۔ چنانچہ حافظ شیراز ، غنی کاشمیری ، علی حزیں ، سودا ، میر اور درد کے نام جابجا ان کے اشعار میں آتے ہیں ۔ خاص طور سے میر اور سودا کا نام وہ بڑی عقیدت سے لیتے ہیں ۔ لیکن اصلیت میں انہوں نے غنی کاشمیری کا اثر زیادہ قبول کیا ۔ اور بھی دوسرے قدیم اردو و فارسی شاعروں کو پڑھ کر انہوں نے استفادہ کیا ۔ پھر اسے اپنے وقت کے مذاق کے مطابق ایک نئی ترکیب دی ۔ آہستہ آہستہ ان کی شہرت پھیلتی گئی اور وہ اپنے وقت کے استاد تسلیم کر لئے گئے ۔ انہوں نے اپنی فنی ریاضت سے وہ کمال اور شہرت بہم پہنچائی کہ سارے معاصر ماں گئے ۔ اس زمانے کی بیشتر کتابوں اور تذکروں میں جو تعریف ناسخ کی ملتی ہے ۔ وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی ۔ ان کے مکان پر شاگردوں اور ادب کے شیدائیوں کا ہجوم رہتا تھا ۔ اکثر امراء اور عمائدین ان سے شاگردانہ عقیدت رکھتے تھے ۔ معتمد الدولہ کے یہاں سے سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر تھی ۔ خود محمد علی شاہ بادشاہ بھی اسی قدر تنخواہ دیتے تھے ۔ دوستوں کے یہاں دعوتیں ہوتیں ۔ عقیدت مندوں کے یہاں سے تحفے تحائف آتے ۔ راجہ چندو لعل نے ایک گراں قدر رقم کے ساتھ توجہ دی ۔ لیکن ناسخ نے قبول نہ کیا ۔ ان کی زندگی فراغت اور عیش میں گزرتی تھی ۔ کچھ اپنی گرم بازاری کی وجہ سے ۔ اور کچھ غالباً کاظم علی رئیس کی دولت مل جانے سے ان میں مال و دولت کی طرف سے ایک بے نیازی سی پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ اپنے گھر میں بادشاہ کی طرح رہتے ۔ اور ہمہ وقت زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے ۔ چند رباعیات اور تاریخی قطعات بھی ہیں ۔ ایک مولود شریف ۔ اور ایک مثنوی بھی لکھی جو حدیث مفضل کا ترجمہ ہے ۔ پہلا دیوان ۱۸۰۶ء میں مرتب ہوا ۔ اس کا ۱۸۱۸ء کا نسخہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے ۔ دوسرا دیوان دفتر پریشان ۱۸۳۱ء اور آخری

دیوانِ دفترِ شعر ۱۸۳۸ء میں تمام ہوا۔[ـــہ]

ناسخ کو دوسرے استادوں سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرتبہ کی ذمہ داری پورے طور سے محسوس کی۔ اور اُس کا حق ادا کر دیا۔ غالباً اُردو کے بہت کم شاعروں نے اتنی سنجیدگی اور محنت سے زبان و ادب کی خدمت کی ہوگی۔ خود کہتے ہیں۔

جی لڑا دیتا ہے کیسی ہو زمینِ سنگلاخ
خامہ تیشہ ہے تو ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

افسوس ہے کہ ناسخ کی اس کوہ کنی کو آج تک ہم بہ نظرِ تمسخر دیکھتے ہیں۔ ناسخ نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی اس کا صحیح اندازہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہم اس زبان اور شاعری کا جائزہ نہ لیں۔ جو انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ اُس وقت ادبی سرمائے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ کہ ہماری زبان جب تک اس قابل بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ اس میں سیدھے سادے خیالات کو بے تکلفی سے نظم کیا جا سکے۔ اسی لئے جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا تو اس کی دھوم مچ گئی۔ غالب نے صفیر بلگرامی سے دیوانِ ناسخ کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی بتلایا تھا کہ "قاعدے کے ساتھ مطالب کا واضح طور سے ادا ہونا دل کو برانگیختہ کرنے لگا۔" ناسخ کا یہ کارنامہ اردو ادب میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور انہیں زبان کا بہت بڑا مصلح تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ناسخ سے پہلے حاتم، آرزو، مرزا جانِ جاناں نے بھی اصلاحِ زبان کی۔ انشا، دریائے لطافت تصنیف کر چکے تھے۔ جو اصلاحِ زبان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن قطعی اور مکمل اصلاح ناسخ کے قلم سے ہونی تھی۔ ناسخ نے ان بزرگوں کی اصلاح سے استفادہ کرتے ہوئے خود زبان کے قواعد و اصول باضابطہ طور سے وضع کئے اور اپنے اشعار میں انہیں برت کر عملی مثال پیش کی۔ انشائے دریائے لطافت میں فصاحت کے تین اصول معین کئے تھے۔ (۱) تنافر نہ ہو (۲) غرابت نہ ہو۔ (۳) تعقید نہ ہو۔ ناسخ نے اپنے شعروں میں اسے عملی جامہ پہنایا۔ ناسخ سے پہلے حروفِ رابطہ کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ شعرا لفظوں کو ضرورتِ شعری سے گھٹا بڑھا دیتے تھے۔ اور لغت کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ متروک الفاظ کا استعمال عام تھا۔ قواعد کے اصولوں سے جا بجا انحراف کیا جاتا تھا۔ ناسخ نے اس عام بدنظمی و بے ترتیبی کو دور کیا۔ ردیف و قافیہ کے قواعد اور تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کئے۔ ہندی و سنسکرت کے ڈھیلے ڈھالے لفظوں کی جگہ عربی و فارسی کے ہم آہنگ الفاظ کو رواج دے کر اردو غزل کو چست سبک اور رواں کر دیا۔ ان کی تین نکاتی ہدایت نے شاگردوں کو بھی انہیں کے نقشِ قدم پر قائم رکھا جو اُصول یہ ہیں (۱) بندش چست ہو۔ (۲) حشو و زوائد کا دخل نہ ہو (۳) ذم اور ابتذال کا پہلو نہ ہو۔ ناسخ کی قادر الکلامی اور درستی زبان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی غزل اور ہمارے زمانے کی غزل میں باعتبارِ زبان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ان کے زمانے کے دوسرے شاعروں کے کلام سے ڈیڑھ سو برس کا تاریخی بُعد صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ناسخ نے جس طرح زبان کی اصلاح کی۔ اس کا کچھ حال ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی قابلِ قدر کتاب لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ تفصیلی مطالعہ کے لئے تذکرہ جلوۂ خضر، مؤلفہ صفیر بلگرامی دیکھا جا سکتا ہے۔ راقم نے اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ان دو کتابوں کو خاص طور سے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس اصلاح کے ساتھ ناسخ نے تنگنائے غزل میں بہت سے موضوعات اور گوناگوں مضامین کو سمو کر اُس کے دامن کو وسیع کیا۔ جدید ماہرین کا خیال ہے کہ بچے کو بولنے اور خیالات کو ظاہر کرنے کی ابتدائی کوشش میں جو مشقت پڑتی ہے وہ بالغوں کی کڑی سے کڑی محنت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ناسخ کو قدما کی اٹکتی ہوئی زبان میں نئے نئے مضامین باندھنے میں کچھ اس قسم کی دقت پیش آتی ہوگی۔ انہوں نے اپنے خامہ کو تیشہ اور خود کو کوہ کن بجا طور سے کہا ہے۔ آخر کار ان کی یہ محنت بارآور ہوئی۔ اور بہت جلد انہیں طرزِ جدید کا موجد اور استادِ یگانہ قرار دے

[ـــہ] ملاحظہ ہو لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

دیا گیا۔ ناسخ سے پہلے لکھنؤ کے شعراء دلی کے دبستان کے پیرو تھے۔ اور دہلی کے نافذ کئے ہوئے قواعد و اصول کو سند مانتے تھے۔ لیکن اب یہ صورت ہوئی کہ ناسخ کے کلام کا دلی والوں نے تتبع شروع کر دیا۔ غالب نے خود زبانی گفتگو میں صفیر بلگرامی سے کہا کہ ذوق، مومن اور خود میں نے ناسخ کے تتبع میں شعر کہنا شروع کئے۔ ذوق کی طبیعت ٹھس تھی وہ زیادہ نہیں چل سکے۔ لیکن غالب و مومن کے یہاں اس تقلید کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ صفیر بلگرامی نے اپنی کتاب جلوۂ خضر میں، غالب کی زبان سے نکلے ہوئے یہ جملے درج کئے ہیں یہ ملاقات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی تھی۔

"یہاں اگر مجھ سے پوچھئے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا۔ لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے۔ مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی گنجائش ہی نہیں چھوڑ گیا۔ ہاں قواعد نہیں لکھ گیا۔ قواعد جاننے والا اُس کی زبان کے مزے پاتا ہے۔"؂

ناسخ کے متعلق غالب کے تاثرات اُس خط سے بھی ظاہر ہیں۔ جو انہوں نے عبدالغفور خاں کے نام لکھا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"ہم فقیر لوگ اعلانِ کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔"

اس کے علاوہ صفیر بلگرامی نے اُس خط کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو غالب نے ناسخ کو اپنے دیوان کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس خط سے عقیدت و احترام ٹپکتا ہے ناسخ پر قدیم تذکروں سے لے کر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں ان کی قادر الکلامی، استادی، اصلاح زبان اور مہارت فن کی تعریف ملتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان کا یہی کارنامہ زیادہ اہم ہے۔ لیکن اس مضمون کا مقصد ناسخ کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالنا ہے یہ صحیح ہے، ناسخ نے بنیادی طور سے قافیہ پیمائی اور نازک خیالی کی مشق کی۔ لیکن اس کے لئے وہ احساس و اظہار کی تمام منزلوں سے بھی گزرتے تھے۔ کوئی فنکاری محض خلا میں نہیں کی جا سکتی۔ اس میں خیال و معنی کی آمیزش ناگزیر ہے۔ لیکن ناسخ کی شاعری کو محض قافیہ پیمائی سمجھ کر بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ اور اس زمانے میں تو ان کے خلاف ایک خاص تعصب ہی پیدا ہو گیا ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا یہ جملہ اس تعصب کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔

"ناسخ بلا شبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کے "ناسخ" اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں۔ ان کے کلام میں نہ نمکینی ہے نہ شیرینی"

مجھے امید ہے کہ طرز سے عبدالحق صاحب کا مفہوم طرزِ بیان نہیں ہے اس لئے کہ ناسخ کے طرزِ بیان یا ڈکشن کو بھونڈا کہنا، اور ان سے پہلے کئے بیان و بیان کو پاکیزہ قرار دینا سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دینے کے مترادف ہے۔ البتہ ان کے طرزِ خیال پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے کلام میں بے شک آج کے معیار کے مطابق نمکینی و شیرینی نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ تر غزلوں میں طبیعت کو اکتا دینے والی کیفیت ملتی ہے۔ کہیں کہیں خیال کی عریانیت ذوقِ سلیم پر بار ہوتی ہے لیکن ناسخ نے کسی شائستگی کو ختم کر کے اس عریانیت کا نفاذ نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ عبدالحق صاحب کے جملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف ناسخ سے پہلے لکھنؤ میں فحش گوئی اور عریانیت کا بازار گرم تھا۔ جسے انہوں نے ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ ظاہر ہے ایک تنہا شخص شاعری کی پوری فضا کو منقلب تو نہیں کر سکتا تھا۔ جب کہ وہ خود بھی اس فضا کا پروردہ ہو۔ ناسخ نے اس قدر کیا کہ اس وقت کی منہ پھٹ شاعری کو حتی الوسع رمز و ایماء اور اشارات و کنایات کے ذریعے تہذیب کے دائرے میں لانے کی کوشش کی۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو ناسخ کے پہلے کے شاعروں کا کلام دیکھئے۔ جس کا نمونہ مضمون کی ابتداء میں پیش کیا گیا ہے۔ البتہ ناسخ کے کلام میں نمکینی و شیرینی واقعی بہت کم ہے بلکہ یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ آج کل کے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کلام کو پڑھ کر نا امید ہوں گے۔ لیکن عبدالحق صاحب کے مرتبہ کے نقاد کو اپنے زمانے کے ادبی ذوق

؂ تذکرہ جلوۂ خضر جلد اوّل مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ ۱۸۸۵ء

سے بلند ہو کر ماضی و مستقبل کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے تھا۔ ناسخ اپنے زمانے کے مانے ہوئے شاعر تھے لیکن کیا عبدالحق صاحب کی یہ تنقید اس پورے دور کے ادبی ذوق کی تضحیک نہیں کرتی؟

ناسخ کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے اولاً اس وقت کے ادبی مذاق کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد خود ان کی شخصیت کو بھی سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اسی جگہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور شاعر کا کلام جب ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہوتا۔ تو ہم اسے مطعون کرنے لگتے ہیں۔ ناسخ اردو کے عام شاعروں کی طرح نہ تھے۔ میر کے زمانے سے آج تک غالباً شاعری و پہلوانی یکجا نہ ہوئی ہوگی۔ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ لیکن ناسخ ایک قوی ہیکل سیاہ رنگ پہلوان بھی تھے۔ صبح اٹھ کر ایک ہزار سے زیادہ ڈنڑ لگاتے تھے۔ آزاد کے قول کے مطابق پانچ سیر پختہ شاہجہانی خوراک تھی۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے کبھی انہیں ان تجربات سے نہیں گزرنا پڑا جو دلسوزی پیدا کرتے ہیں۔ مصاحبوں اور شاگردوں کی خوشامد نے کھال اور بھی موٹی کر دی تھی۔ چنانچہ وہ ایک مست الحرش باش اور بے فکر آدمی تھے۔ رونا، بسورنا اور آہیں بھرنا ان کی فطرت میں نہ تھا۔ پہلوانی کی وجہ سے ہمہ وقت ایک غنودگی کی کیفیت دل و دماغ پر طاری رہتی تھی۔ جس میں انسان کو موٹی موٹی چیزیں نظر آتی ہیں۔ فکر کی تہہ داری اور ژرف نگاہی نہیں حاصل ہوتی۔ چنانچہ جب ہم ناسخ سے غالب جیسی نفسیاتی بصیرت یا میر جیسا گداز طلب کرتے ہیں تو وہ تقاضا ہی غلط ہوتا ہے۔ ہر شاعر یا ادیب سے اس کے ذوق، طبع اور مزاج کے مطابق ناشندہ خوبیوں کی توقع رکھنی چاہیئے۔ اگر وہ ان میں ہمیں نا امید نہیں کرتا تو شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔ ناسخ نے زبان سے کشتی لڑ لڑ کے شاعری کی ان کا یہی کارنامہ قابل قدر ہے۔ اس وقت اردو زبان اور شاعری کو ایسے ہی جفاکش دیو ہیکل اور مضبوط اعصاب کے آدمی کی ضرورت تھی یا ظرفین محال ہمارے زمانے کا شاعر ... کے ... فلاطہ پر زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس زمانے میں ہوتا۔ اور قواعد زبان یا عروض و قافیہ کے اصولوں سے اپنی وارفتگی فکر میں انحراف کرتا تو اردو زبان کا کیا حشر ہوتا۔ یہ ناسخ اور ان کے رفیقوں کی کارگزاری ہے کہ انہوں نے زبان و بیان کا ایسا مضبوط قلعہ قائم کر دیا جس میں آج ہم آزادانہ بے نیازی کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں تک خالص شاعری کا سوال ہے اسے بھی محض فکر و فلسفہ یا سوز و گداز تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ناسخ کا فن دراصل آورد کا فن ہے۔ جس میں شاعر بالارادہ اور شعوری طور سے شعر کہتا ہے۔ اور اسے محنت کر کے سنوارتا ہے۔ ایسی شاعری موثر اور پرسوز نہ سہی خوبصورت اور دل آویز ضرور ہو سکتی ہے۔ عام طور سے ہم ایسے شاعروں کو خلوص سے عاری سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر میں ان کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ یا وہ اعلیٰ انسانی اقدار سے محبت نہیں رکھتے۔ یہ ایسی غلط فہمی ہے۔ جس نے بہت سے شاعروں کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ ناسخ ان میں سب سے زیادہ مظلوم ہیں۔ ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت میں سادگی و شرافت کے علاوہ اخلاقی قدروں کا احترام تھا۔ وہ متمول تو تھے مغرور تھے۔ لیکن زر اندوزی کی ذہنیت سے بیزار تھے۔ ان کے شعروں میں بکثرت امیر غریب کی تفریق پر طنز ملتا ہے۔ خودداری اور استغنا پر نہ صرف انہوں نے اپنے اشعار میں فخر کیا ہے۔ بلکہ زندگی میں اس کا عملی ثبوت بھی دیا ہے۔ زمانہ روایات اودھ کی مطلق العنانی کے دور میں جب ہم ناسخ کو بادشاہ وقت سے اس طرح خطاب کرتے دیکھتے ہیں۔

بہت پھولو نہ مسند پر ندیموں کی خوشامد سے
یہاں ملتا ہے عہدہ مدح خواں کو نوحہ خوانی کا

تو اردو کے بڑے بڑے شاعروں کا قد ہیں ناسخ کے آگے خم ہوتا نظر آتا ہے۔ اس خودداری اور تمکنت کے ساتھ ان کے دل میں اپنے وطن کی محبت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لکھنؤ کی مفارقت میں جو غزلیں انہوں نے کہی ہیں۔ ان کی تاثیر سے کوئی با مذاق آدمی انکار نہیں کر سکتا یہ غزل پڑھیئے۔

یاد ہیں سب گلعذارِ لکھنؤ ہے تصور میں بہارِ لکھنؤ

اور بھی کئی غزلیں ایسی کہی ہیں جن کی ردیف لکھنؤ ہے۔ ناسخ اپنے زمانے میں اقلیمِ سخن کے واحد تاجدار تھے۔ اودھ کا پایۂ تخت تھا۔ معتمد الدولہ کے زوال کے بعد جب ان کے سیاسی حریفوں کا اقتدار ہوا۔ تو مجبوراً لکھنؤ چھوڑ کر عرصہ دراز تک انہیں بنارس، الہ آباد، پٹنہ اور کانپور رہنا پڑا۔ اس جلا وطنی کے زمانے میں وہ عیش و عشرت کا زمانہ اور گلعذارانِ لکھنؤ کی خدمات انہیں یاد آتی ہوں گی۔ لیکن وہ ایک نارمل صحت مند آدمی تھے۔ ان کی اس غمگین یاد سے بھی رنگینیاں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہیں۔ برخلاف اس کے جب میر تقی میرؔ دلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے تو ان کا غم وحشت زدگی اور جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

ناسخ کی شخصیت کی ایک اور اہم بات ان کی نامذہبیت SECULARISM تھی۔ پرائیویٹ طور سے تو وہ شیعہ تھے۔ اور غالب کی طرح بلکہ غالب سے زیادہ انہوں نے حضرت امام حسین اور جناب امیر سے اظہارِ عقیدت اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کی بنیاد نامذہبیت پر ہے۔ شیخ اور برہمن دونوں کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ اس سلسلے میں ان کے بعض اشعار نہایت بصیرت افروز ہیں۔

زیست بھر دھڑکے عذابِ حشر میں زاہدا تیرا ہی یہ دل گردہ ہے
ترکِ کفر آساں ہے کب دینِ زاہد کی طرح آستیں میں لیکے بت جاتے تھے پیغمبر کے پاس
دونوں اس غارت گرِ دیر و حرم کے یار ہیں یہ سبب ہے ربط جو شیخ و برہمن میں نہیں
اے دلِ سرمست کشمکشِ کفر و دیں سے چھوٹ میخانے بھی بنائے ہیں دیر و حرم کے ساتھ

اردو فارسی شاعری کی ایک دلچسپ روایت مذہبی "تنگ نظری" کے خلاف طنز و احتجاج ہے۔ اس کا سلسلہ خیام و حافظ سے شروع ہو کر آج تک قائم ہے۔ ہماری شاعری کا یہ ایسا نادر پہلو ہے جو دنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری میں کمیاب ہے۔ اور اس خوبی پر ہم جتنا بھی فخر کریں بجا ہے۔ ناسخ نے اس روایت کو نہ صرف برقرار رکھا۔ بلکہ اسے زیادہ مضبوط اور منظم کر دیا۔ اُن کی غزلوں میں ایسا کاری طنز ملتا ہے جو فکر و خیال کی مکمل آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔ نیم ملا اور نفس کشی کی تضحیک جس ادا سے ناسخ نے کی وہ خیام اور حافظ کی یاد دلاتی ہے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

گر نہیں مقبول اسے زاہد نمازِ بے حضور ہڈیاں اپنی بھلا کیوں زندگی بھر توڑتے
سنگِ اسود کی طرح سب رُخ زاہد ہو سیاہ کیا جو سجدوں سے ہوئی تیری جبیں تھوڑی سی

یہاں اختصار کے خیال سے زیادہ شعر نہیں لکھے گئے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا اس رنگ کا کلام اس قدر ہے کہ اس سے عاشقی و برہمنی کے تمام آئین مرتب کئے جا سکتے ہیں۔

اس رندانہ طبیعت کا ایک رخ ان کی ظرافت تھی۔ تعجب ہے آزاد نے ان کو نمکِ ظرافت سے قطعاً عاری بتایا ہے۔ حالانکہ ناسخ اردو کے ظریف ترین شاعروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ ادبی ظرافت کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اس میں سے ایک پہلو ناسخ کی مخصوص ظرافت تھی۔ جسے بعد کو غالب نے اپنایا۔ اس ظرافت میں شاعر ہر چیز کو تمسخرانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ مغربی ادب میں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں انگریزی زبان کے مایۂ ناز ناول نگار فیلڈنگ نے اپنے ناولوں کے کردار اسی رنگ میں پیش کئے۔ مشہور فرنچ مصنف لاسیج LASIGE نے ایسی ہی ایک کتاب گل بلاس GIL BLAS تصنیف کی۔ جس میں کرداروں کے مضحک پہلوؤں کو خوب ابھارا۔ یہ رجحان ادب کے علاوہ مصوری میں بھی موجود تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں انگلینڈ میں ہوگارتھ HOGARTH نے اپنی تصویروں میں ایسے مبالغہ آمیز خاکے پیش کئے۔ جن میں اسی مضحک پہلو کی نمائش کی گئی تھی۔ ناسخ کے یہاں اس کا چسکا اس قدر ہے کہ وہ زاہد و واعظ سے نکل کر خود اپنا اور اپنے محبوب کا بھی تمسخر اڑانے سے باز نہیں رہتے۔ [illegible]

کارٹون بناتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پاؤں پھیلائے زمیں پر میں پڑا رہتا ہوں صورتِ سایۂ دیوار ترے کوچے میں
حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں
انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے
ناتوانی نے نکل جانے کا ڈر تو کھو دیا یار کو اب اپنے مر جانے سے کھٹکا ہو لیں
میرے نالوں سے جو اس کے دل میں کچھ آتا تھا رحم روئی اب ٹھونسنے لگا ہے وہ ستمگر کان میں
رقعۂ خوابِ ناز میں پڑھتا کبھی نہیں تکیے میں نامے ہیں عوض پہ بکھرے ہوئے

یہ تو مختصر اُدہ عناصر تھے جو ان کی شخصیت کی ترکیب میں شامل تھے ان کی جھلک ان متفرق اشعار میں واضح طور سے ملتی ہے۔ جو اب تک درج کئے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی صورت سے ناسخ کے کلام کی دو باتیں بہت اہم ہیں۔ ان میں پہلی چیز مصوری ہے جس کے صرف معنک مہدر کا ذکر شاعری کی ظرافت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یوں تو مصوری اور شاعری کا اکثر ساتھ ہوتا ہے اور ہمارے متقدمین اور متاخرین شعرا کے یہاں ایسے بہت سے اشعار نظر آتے ہیں۔ جن میں رنگ و روغن کا حسن اعلیٰ درجہ کا پایا جاتا ہے۔ قدرتی مناظر کی عکاسی۔ محبوب کا سراپا اور دوسری دل آویز چیزیں ہمیشہ سے ہماری شاعری میں منعکس ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ناسخ نے اسے کمال پر پہنچا دیا۔ ان کے یہاں شاعر کا قلم مصور کا برش بن جاتا ہے۔ ان کی نظر محبوب کے خدوخال کے علاوہ لباس و زیورات تک کی جزئیات کو سمیٹ کر ایسی مینا کاری بہم پہنچاتی ہے۔ کہ پڑھنے والا خود کو شیشے سے جھلکتے ہوئے محل میں پاتا ہے۔ جہاں ایک کرن کی چھوٹ پڑنے سے ہزاروں کرنیں تھرتھراتی ہیں۔ و رنگ و رنگ و روشنی کے ستاروں میں ڈوب جاتا ہے۔ افسوس ہے ناسخ کے کلام کی یہ خوبی پورے طور پر روشن نہیں ہوئی۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ہم شاعری میں دل کو متاثر کرنے والی چیزیں زیادہ ڈھونڈھتے ہیں۔ اور حسن و دلکشی کی ضیافت کا زیادہ احساس نہیں رکھتے حالانکہ یہ خوبی اپنی جگہ پر کم نہیں۔ انگریزی ادب کے نقادوں نے اسے کافی اہمیت دی ہے۔ اور وہاں کے شاعروں نے بھی اس کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ رومانی دور کے شاعروں میں کیٹس کو زبردست اہمیت حاصل ہے وہ زیادہ تر اسی خوبی کی بنا پر ہے۔ اس نے اپنی مشہور نظم THE EVE OF ST. AGNES میں پر فائر دکی محبوبہ کا جو سراپا بیان کیا ہے۔ وہ ناسخ کا آرٹ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے عظیم ODES میں بھی جا بجا بڑی دلکش مصوری پائی جاتی ہے۔ کیٹس کے بعد وکٹوریا کے زمانے میں لارڈ ٹینی سن بھی اپنی اس خوبی کی وجہ سے خاص طور سے مشہور رہے۔ اس زمانے میں ایسے چند شاعروں کا ایک اسکول قائم ہو گیا تھا۔ جو شاعری میں مصوری کرتے تھے ان میں روزٹی اور مارس خاص طور سے مشہور ہیں۔ یہ لوگ اٹلی کے مشہور مصور ریفائیل کا تتبع کرتے تھے۔ ناسخ کے یہاں یہ آرٹ خالص مشرقی انداز کا ہے۔ محبوب کے چلنے میں کفش پا سے ستارے جھڑتے ہیں۔ شاعر اس سے ایک جگمگاتی ہوئی کہکشاں بناتا ہے۔ کہیں اس کے آویزوں کی چمک سے گوشِ دگردن کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ کبھی اس نے قبا کے بند کس لئے ہیں۔ تو انگ انگ سے جامہ زیبی ٹپک پڑی ہے۔ کبھی وہ ماہِ حسن بام پر آیا ہے۔ تو ڈوبتے سورج کی طرح تمام آسمان کو شفق رنگ کر دیا ہے۔ ناسخ کی مصوری عموماً وسیع کنوس پر نہیں ہوتی۔ وہ جزئیات کے چھوٹے چھوٹے نگینوں سے شعر کو ہیرا و زیور کی طرح تیار کرتے ہیں۔ جس میں تناسب، سبکی اور نزاکت کا امتزاج ہوتا ہے۔ ان کی اس تراش خراش کی جگمگاہٹ سے بہت سی غزلیں جواہرات کی دکان معلوم ہوتی ہیں۔ ثبوت کے لئے یہ شعر کافی ہوں گے۔

پڑ گیا عکس زرِ گل جو تنِ عریاں پر تجھ کو میں پہنے ہوئے خلعتِ پر زر سمجھا
زمرد کی انگوٹھی کب ہے انگشتِ حنائی میں ہوا ہے لے پرید شاخِ مرجاں سے ثمر پیدا

دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقے میں — تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کامدانی کا
نہ کیونکر وصل میں ہو یوں صبح خنداں شام سے ہولی — اثر ہے اے صنم تیرے لباسِ زعفرانی کا
بن گیا مقیش کا تار ان دنوں تارِ نگاہ — بسکہ آتا ہے نظر وہ روئے نورانی مجھے
گلفشاں عکس ہوا کس کے رخِ رنگیں کا — ہے جو آئینہ میں عالم سبدِ گل چیں کا
ستارے جھڑتے ہیں جو کفشِ پا کے — زمینِ فیضِ قدم سے آسماں ہے
ہر اک انگلی ہے اس کی شمع کافور — ہتھیلی اک بلوریں شمع داں ہے
کی جو خیاطِ ازل نے تری پوشاک درست — رہ گئے قطع میں یہ شمس و قمر دو ٹکڑے
گل تو کیا رنگِ حنا کے بوجھ سے ہوتے ہیں لال — شاخِ گل سے ہیں کہیں نازک تمہارے ہاتھ پاؤں
سمجھے ہم ابرِ سیہ سے نکل آتا تارا — کھل گئی بالوں سے جو تیری جبیں تھوڑی سی

ایک اور غزل پانی کے اندر مصوری کا اتنا خوبصورت نمونہ پیش کرتی ہے۔ جسے پڑھ کر گھنٹوں نگاہ اس کے نقش و نگار میں کھوئی رہتی ہے۔

ہو جو تیرا دستِ رنگیں پر تو افگن آب میں — جائے ماہی بلبلوں کا ہو نشیمن آب میں
لعلِ خنداں کا تصور دیدۂ گریاں میں ہے — دیکھنا لعلِ بدخشاں کا ہے معدن آب میں
جمع ہوتے ہیں نہانے کو ہزاروں گلبدن — روز آتے ہیں نظر پھولوں کے خرمن آب میں
تو نے دریا میں جو منہ دھویا ہے لے رشکِ چمن — شاخِ گل موجیں بنیں پھولا ہے گلشن آب میں
کھول دے زلفیں لبِ دریا کہ لہریں شرم سے — ڈوب جائیں صورتِ زنجیرِ آہن آب میں

رفتہ رفتہ مصوری کی شدتِ رنگ و روغن سے بے نیاز ہو کر ایسا پیکر تیار کرتی ہے۔ جو کسی خارجی عنصر کا مرہونِ منت نہیں رہتا۔ یہاں نہ لکھنؤ کے زیورات باقی رہتے ہیں، نہ آبِ رواں کا لباس۔

ہر عضو اس کے عضوِ دگر میں ہے منعکس
حیراں بزمِ یار میں آئینہ ساز ہے

مصوری اور شاعری کا یہ جادو آگے چل کر تمام مادی لوازمات سوخت کر دیتا ہے۔ اور خطوط اور خاکوں کی جگہ صرف عالم ہی عالم منظر پر طاری رہتا ہے

تو نظر آتا نہیں لیکن منور بام ہے
جلوہ تیرا بھی برنگِ آفتابِ شام ہے

ناسخ کی دوسری اہم خصوصیت ان کے تخیل کی وسعت ہے۔ جسے تذکرہ نگاروں نے بلند پروازی لکھا ہے۔ یہ خصوصیت ان شاعروں میں زیادہ ہوتی ہے۔ جن کے یہاں جذبہ کی کمی پائی جاتی ہے۔ اور ذہنی جز شاعری پہ غالب رہتا ہے۔ ناسخ کے یہاں جو مبالغہ آرائی ملتی ہے۔ اُس کی اساس یہی ہے۔ یہ مبالغہ ہر موقع پر نظر آتا ہے۔ ناسخ جب عاشق کا روپ دھارتے ہیں تو لاغری و ناتوانی کو حد سے باہر پہنچا دیتے ہیں۔ آلام و مصائب کا مقابلہ کرنا عاشق کا ہمیشہ سے کردار رہا ہے۔ لیکن ناسخ اسے بھی کھینچ کر اپنی ایذا طلبی کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں فطرتاً وہ اس قسم کے شاعر نہیں تھے۔ جو گھل گھل کر سوچتے ہیں۔ انہیں عیاشی کا جذبہ شاعری کی طرف مائل کرتا ہے۔ ان کے محبوب بھی ہر جگہ دستیاب ہوتے رہتے تھے۔ ایک محبوب سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

یاد آتا ہے ترا "کیا" کے عوض "کا" کہنا
ہائے پھر اب میں سنوں گا وہ گنواری باتیں

اس سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے باہر دیہات بھی ان کے عشق کی جولان گاہ تھے۔ کیونکہ لکھنؤ میں اس وقت دیہاتی زبان نہیں بولی جاتی تھی۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

پھر کسی محبوب معنی فہم سے الفت ہوئی
پھر نیا دیوان ناسخ کا مرتب ہوگیا

یہ محبوب ٹکسالی یا کشمیری محلہ کا رہنے والا ہوگا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں عشق کا جذبہ صادق کا کوئی سوال نہیں۔ جہاں تک فکری عنصر کا تعلق ہے نہ وہ زمانہ فکر و خیال کا تھا۔ نہ ان کی شاعری میں اس قسم کی صلاحیت تھی۔ لامحالہ بعض نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں سرمایہ شعر بن گئیں۔ لیکن اس رجحان کو محض ہرزہ سرائی یا فضول گوئی پر محمول کرنا غلط ہے۔ کیونکہ اس سے شاعر کی نظر میں ایک عجیب قسم کا پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے۔ جو کبھی کبھی وسیع استعاروں کے سہارے ہمیں ایک مبہم اور پراسرار دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں ہماری فکر و نظر کی تجدید ہو سکتی ہے۔ ہمارے گرد و پیش کے مادی مظاہر ہیں۔ ہر جگہ وضاحت و قطعیت ہوتی ہے جس سے روح انسانی بیزار ہو کر نامعلوم اور نامحسوس کو تلاش کرتی ہے۔ غالب کے یہاں ایسی جھلک اکثر اور ناسخ کے یہاں شاذ و نادر ملتی ہے۔ دو ایک شعر جن میں ایسی پرچھائیاں نظر آتی ہیں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

تنگ اس عالم میں ہوں اب اور عالم چاہیئے　　　وحشیوں کو ماورائے عرش اعظم چاہیئے
زندہ ہیں پھر دوست میں عاشق نہ مرتے ہیں　　　عالم اک اور بھی ہے وجود و عدم کے ساتھ
آستیں زن ہے یہاں کوئی چراغ جاں پہ　　　کھا گیا داں روش ناز سے ٹھوکر دامن
گر آنکھ ہے تو باطن انساں کی دید کر　　　کیا کیا طلسم دفن ہیں مشت غبار میں

ناسخ کو کئی اعتبار سے غالب کا نقش اول کہا جا سکتا ہے۔ دونوں جذبہ کے مقابلے پر ذہن کے شاعر ہیں۔ دونوں کے یہاں قوت متخیلہ کا زور ہے۔ دونوں میں طنز و مزاح اس حد تک ہے۔ کہ خود اپنا مذاق اڑانے سے باز نہیں رہتے۔ دونوں مذہبی پابندیوں سے بیزار ہو کر گریز کرتے ہیں۔ ناسخ صنم و بت پرستی کے شوق میں ترک اسلام کر کے ہندو ہو جاتے ہیں۔ غالب کی آتش نفسی انہیں زردشت کے حضور میں لے جاتی ہے۔ جہاں وہ زمزمہ سرائی اور برہمن گذاری کے مراسم ادا کر کے آتش پرستوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں۔ غالب کو اگر حسن سے ماورائے حسن کی تلاش نے ایک بڑا مفکر بنایا۔ تو ناسخ کو حسن کے ظاہری آب و رنگ نے رنگ کر ایک بڑا مصور بنا دیا۔ غالب محبوب کے سامنے اپنی حیثیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی ضد پر اصرار کرتے ہیں۔ ناسخ جسمانی وصال کے عوض خود کو بیچ دیتے ہیں۔ غالب کے یہاں علم و آگہی کا سناٹا ہے۔ ناسخ کے یہاں جالی کی کرتی اور کامدانی کے آنچلوں کا ایسا طلسم ہے۔ جہاں افلاطون بھی علم و آگہی سے دست بردار ہو جائے۔ اس موازنہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب اور ناسخ میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔ اور اگر اختلافات بھی ہیں تو وہ بنیادی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ غالب کا ناسخ سے اختلاف مشترک خصوصیت کی "ترقی یافتہ" صورت ہے۔ لہذا یہ ماننے میں کوئی پس و پیش نہ ہونا چاہیئے کہ غالب کی تعمیر میں ناسخ کو کافی دخل رہا ہے۔ اسے اسی طرح کہنا کہ غالب نے ناسخ کا تتبع کیا کافی نہیں ہے۔ درحقیقت غالب کے کلام کا اصل تانا بانا ناسخ کا ہے۔ جسے اسد اللہ نے اپنے عرفان و بصیرت کی رنگ برنگی تہوں سے زیادہ خوبصورت وسیع اور دبیز بنایا۔ یہاں دونوں شاعروں کے ایسے مماثل اشعار درج کئے جاتے ہیں جنہیں پڑھ کر مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

ناسخ

لاغر ایسا ہوں کسی کو میں نظر آتا نہیں
چاہیئے مانی ورق سادہ مری تصویر کا

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

بارِ احسانِ فلک سے تو ملی آزادی
یہی حاصل ہے اگر کچھ مجھے حاصل نہ ہوا

رکھو کسی طرح تو سروکار مہربان
کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے

گر سودۂ الماس نہ تھا لون چھڑکت
یہ مہرِ دہن زخم کو قاتل سے گلہ ہے

سر کا شبِ تاریک میں داغوں سے جو چھایا
اک خلق مرے سامنے کھاتی ہے کھڑی دھوپ

مل گیا خاک میں پس پس کے حسینوں پر میں
قبر پہ بوٹیں کوئی جز حنا پیدا ہو

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں
خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

وہ سرو جو ہوتا ہے خراماں روشوں پر
سائے کی طرح پھرتے ہیں گلشن کے شجر ساتھ

کون منت کرے دربانِ درِ جاناں کی
ایک دم روؤں تو دیوار ابھی در ہو جائے

میں اکیلا اپنے غم کی شرح کر سکتا نہیں
کوئی مثلِ مرثیہ خواں چاہیئے بازو مجھے

وہ بادل ہیں جو لیں قرض آبِ دریا
مروں پیاسا نہ لوں آبِ بقا قرض

مجنوں کی طرح میں دے کے پیغام
جاتا ہوں قفائے قاصدِ یار

غالب

لاغر ایسا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

گیرم کہ بہ افشاندن الماس ستیزم
مشتے نمک سودہ بہ زخمِ جگرم ریز

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکہ
دکھلاتا ہوں ہر روز میں اک داغِ نہاں اور

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی — دل ہی دل میں ہم اسے یاد کیا کرتے ہیں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
اُس کے تلووں سے ملیں سوتے میں کیا آنکھوں کو ہم — سے تو ووں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ناخنِ پُرنور ہیں چشم نگہباں پاؤں میں — ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

موجودہ طالبِ علم کے لئے ناسخ کی اہمیت دو حیثیتوں سے ہے۔ اول یہ کہ وہ جدید اردو زبان کے معمار ہیں۔ دوسرے یہ کہ مشرق کے ایک بہت بڑے شاعر کی نشوونما میں ان کا خاص حصہ رہا ہے۔ اگر غالب کو متاثر کرنے والے اردو شاعروں کی فہرست تیار کی جائے تو ناسخ کا نام سرِفہرست ہوگا۔ اپنے طور پر ان کی شاعری میں زیادہ خوبیاں نہیں ہیں۔ لیکن جو لوگ ناسخ کو محض نازک خیال اور معاملہ بند شاعر سمجھ کر نظرانداز کرتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ناسخ کے دیوان کو صبر کے ساتھ پڑھیں جس میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو آتش و مصحفی تو کیا میر و غالب سے نگاہ بازیاں کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے یہ چند اشعار قارئین میں کلامِ ناسخ کا کچھ شوق پیدا کرسکیں۔

میں نہ فریادی بتوں کا ہوں خدا کے سامنے — آشنا کا کیا گلہ ناآشنا کے سامنے

میں نے جانا یہ بھی میری طرح ہے فرقت نصیب — آنکھ میں جس کی کوئی آنسو نظر آیا مجھے

آتا ہے رحم کافر و مومن کے حال پر — بُت محوِ ناز ہیں تو خدا بے نیاز ہے

تو نظر آتا نہیں لیکن منور بام ہے — تیرا جلوہ بھی برنگِ آفتابِ شام ہے

جھنکار کیوں نہ نیند اڑایا کرے کہ ہے — زنجیر ہر دیدہ بیدار پاؤں میں

پھونک دیں نالۂ سوزاں سے اگر چاہیں قفس — ہم فقط خاطرِ صیاد کیا کرتے ہیں

کیا سیاہی اور سرخ لالہ وار آنکھوں میں ہے — چشم بد دور آج اے ساقی بہار آنکھوں میں ہے
کر دیا بسمل اُسے جس سے ہوا قاتل دوچار — یہ نگہ ہے یا کہ تیغ آبدار آنکھوں میں ہے

کچھ بھی اے دل چھپا نہیں تجھ سے — ناز ہے وہ خفا نہیں تجھ سے
تو نہیں ہے کسی سے بیگانہ — پر کوئی آشنا نہیں تجھ سے
لگ گیا داغ اک غلامی کا — ورنہ یوسف برا نہیں تجھ سے
شکوہ اپنا ہے باوفا کیوں ہوں — گلہ اے بے وفا نہیں تجھ سے

یاں تو بجلی بھی سنبھل جاتی ہے گرتے گرتے — شمع کے ٹھہریں قدم کیا مرے ویرانے میں

تیرے جور و ستم اے عہد شکن بھول گئے ۔۔۔ نوعِ غربت میں یہ پائے کہ وطن بھول گئے
جان کیا مفت گئی صید گہ عالم میں ۔۔۔ نیم جان کر کے مجھے صید فگن بھول گئے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی ۔۔۔ عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

اس ادا سے چلے جو یار اپنا ۔۔۔ نقشِ پا کیوں نہ ہو مزار اپنا
آپ ہی آئیں جائیں یار کے پاس ۔۔۔ کب سے ہے مجھ کو انتظار اپنا
یاسمیں دھوپ میں ہوئے گُل سُرخ ۔۔۔ دیکھو آئینے میں عذار اپنا
ہے جو اس چاند کے جلو میں رواں ۔۔۔ چاندنی بن گیا غبار اپنا

ناسخ کے کچھ اور اشعار

روئے جاناں کا مقدر میں جو نظارا ہوا ۔۔۔ دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا
وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا ۔۔۔ اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا
محفلِ مے میں جو آیا تو برائے مے کشی ۔۔۔ تھا جو شیشہ جوش سے ایک فوارا ہوا

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

وہ نہیں بھولتا جدھر جاؤں
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں

سیّد سبطِ حسن

داغ

نواب مرزا خاں داغ دہلوی اپنے عہد میں اردو کے سب سے مشہور اور مقبول شاعر تھے۔ ان کے کلام کی دھوم ملک کے گوشے گوشے میں تھی۔ لاہور سے کلکتے تک اور دہلی سے دکن تک ہر بزم میں ان کا چرچا تھا۔ مشاعروں کی رونق اُن کے دم سے تھی۔ دربار ی محفلوں میں ان کو امتیازی شان حاصل تھی۔ اُن کے اشعار گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگوں کی زبان پر ہوتے تھے۔ ادب کے شیدائی ان کی غزلیں نجی صحبتوں میں جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ ارباب نشاط کے بالاخانے ان کی کلام کی نغمگی سے گونجتے رہتے۔ رقص و سُرود کی محفلوں میں مُغنیہ ان کے وارداتِ قلبی کو لہک لہک کر گاتی۔ اور سننے والوں کے دلوں کو تڑپاتی ان کی تازہ تخلیقات کا انتظار بڑی بے چینی سے ہوتا۔ ہر ادبی رسالہ اور گلدستہ ان کے کلام کو بڑے فخر سے شائع کرتا۔ کوئی شہر کوئی قصبہ ایسا نہ تھا جہاں ان کے شاگرد موجود نہ ہوں۔ اور ان کے اشعار کو شوق سے نہ پڑھا جاتا ہو۔ چنانچہ غالب کی وفات (سنہ ۱۸۶۹ء) سے بیسویں صدی کی ابتدا تک اقلیمِ سخن پر داغ ہی کا پرچم لہراتا رہا۔ اور انہیں کی زبان کا سکہ چلتا رہا۔

مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ داغ کی قبر کے پھول بھی خشک نہ ہونے تھے۔ کہ اُن کی شخصیت اور شاعری کا سارا طلسم درہم برہم ہوگیا۔ زمانے نے ایسی کروٹ بدلی کہ نہ وہ ماحول باقی رہا نہ وہ معاشرہ۔ لوگوں کے مزاج اور مذاق بدل گئے۔ ولولے اور اُمنگیں بدل گئیں۔ زندگی کے تقاضے بدلے۔ جذبات واحساسات بدلے۔ عشق کے اندازِ جنوں بدلے۔ اُلفت کے قرینے بدلے۔ محبت کے طور طریقے بدلے۔ شعر و سخن کا معیار بدلا۔ ادبی اور تہذیبی قدریں بدلیں۔ غرضکہ گلشن کی وہ فضا ہی نہ رہی جس میں داغ کا طوطی بولتا تھا۔ زمانہ گذرتا گیا۔ داغ کے مجموعوں پر گرد کی تہیں جمتی رہیں۔ ان کے کلام کے بوسیدہ نسخے کتب خانوں کی الماریوں میں پڑے لوگوں کی کم نگہی کو چشمِ حسرت سے تکتے رہے مگر زندگی کے نئے ہنگاموں میں کسے فرصت تھی۔ جو یادوں کے بجھے ہوئے چراغوں کو پھر سے جلاتا اور کاشانۂ اُردو کو داغ کے داغہائے دل سے روشن کرتا۔ چنانچہ آج شاہ جہاں آباد کے اِس آخری شاعر کا کلام بازار میں کمیاب کیا قریب قریب نایاب ہے۔ بڑی تلاش و جستجو سے اگر کسی کباڑی کی دوکان سے کوئی پرانا نسخہ دستیاب بھی ہوتا ہے۔ تو اُسے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کاغذ خستہ۔ کتابت ناقص۔ طباعت گندی۔ اور متن میں بے شمار غلطیاں۔ یہ بے توجہی ہماری خوش ذوقی کی علامت ہو یا نہ ہو۔ البتہ اپنی تہذیبی میراث سے ہمیں جو لگاوے کا پیار ہے۔ اس کا بھرم اس سے ضرور کھل جاتا ہے۔

نواب مرزا خاں داغ ۲۵ مئی سنہ ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خان ریاست فیروزپور جھرکہ و لوہارو کے رئیس تھے۔ ان کی والدہ وزیر بیگم، دہلی کے ایک کشمیری سادہ کار کی بیٹی تھیں۔ وزیر بیگم نواب شمس الدین سے وابستہ ہوگئیں تو نواب صاحب نے وزیر بیگم کو ایک مکان چاندنی چوک میں خرید وادیا۔ نواب مرزا خاں کی ولادت اُسی گھر میں ہوئی۔ مگر نواب مرزا کی عمر ابھی پانچ برس سے کم تھی کہ نواب شمس الدین ریاستی جھگڑوں کے سبب سر ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کے قتل میں ماخوذ ہوگئے اور انگریزوں نے اُنہیں اکتوبر سنہ ۱۸۳۵ء میں پھانسی دے دی۔ ان کی ریاست ضبط ہوگئی اور انگریزوں نے وزیر بیگم اور اُن کے کمسن لڑکے کو مکان سے بھی بے دخل کردیا۔ وزیر بیگم عذاب کے خوف سے کہیں روپوش ہوگئیں اور نواب مرزا خاں کی پرورش ان کی خالہ عمدہ بیگم

کے گھر میں ہونے لگی۔ عمدہ بیگم کا تعلق نواب یوسف علی خاں سے تھا۔ اگست ۱۸۴۰ء میں جب نواب یوسف علی خاں ولی عہد ہو کر رام پور واپس گئے تو عمدہ بیگم بھی نواب مرزا کو ساتھ لے کر رام پور چلی گئیں۔ اس وقت نواب مرزا نو سال کے تھے۔ باپ کی پھانسی، گھر بار کا اجڑنا اور ماں کی آغوشِ محبت سے جدا ہونا ایسے المناک سانحے تھے۔ جن کا اثر نواب مرزا خاں پر ضرور پڑا ہوگا۔ مگر اتنی چھوٹی عمر میں بڑے سے بڑے حادثے کے زخم بھی جلد بھر جاتے ہیں اور بچہ نئی دلچسپیوں میں الجھ کر ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا دیتا ہے۔

نواب مرزا خاں بارہ سال کی عمر تک اپنی خالہ ہی کے پاس رام پور میں رہے۔ وہاں انہوں نے رسم زمانہ کے مطابق مولوی غیاث الدین (صاحب غیاث اللغات) سے فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ کہتے ہیں کہ نواب یوسف علی خاں بھی نواب مرزا کو کبھی کبھی کچھ پڑھا دیا کرتے تھے۔ مگر عمدہ بیگم کا گھر دلی کے عیش پسندوں کا مرکز تھا۔ مدرسہ نہ تھا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ نواب مرزا خاں نے بچپن کا یہ زمانہ کہ شخصیت کی تشکیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ نغمہ و نشاط کے طرب انگیز ماحول میں گذارا۔ نوابی ٹھاٹھ باٹ۔ زرق برق پوشاکیں، قیمتی ساز و سامان، مرغن اور لذیذ غذائیں، گانے بجانے کی محفلیں، عیش و محبت کے چوچلے، نگاوٹ گھلاوٹ کی باتیں۔ شعر و شاعری کے چرچے۔ عیش و آرام کے تقاضے عمدہ بیگم کے گھر میں یہی کچھ ہوتا ہوگا۔ نواب مرزا خاں کا ذہن شاہانہ امارت کے لوازمات کو قبول بھی کر سکتا تھا۔ اور نفسیاتی ردِ عمل کے طور پر وہ ان چیزوں سے نفرت بھی کر سکتے تھے۔ مگر بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ نواب مرزا خاں نے نوابی زندگی کی ان قدروں کو رد نہیں کیا۔ بلکہ ہنسی خوشی قبول کر لیا۔ خوش باشی، عیش کوشی اور آرام پسندی ان کا حاصل حیات بن گئی۔

۱۸۴۴ء میں جب نواب مرزا خاں کی والدہ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کے حرم میں داخل ہو کر قلعہ معلیٰ پہنچیں تو انہوں نے نواب مرزا خاں کو بھی اپنے پاس بلوا لیا۔ مرزا فخرو نے نواب مرزا خاں کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ اور اب ان کی تربیت قلعہ کے شہزادوں کی طرح ہونے لگی مگر لال قلعہ اب برائے نام لال قلعہ رہ گیا تھا۔ وہاں تربیت کیا خاک ہوتی۔ نواب مرزا خاں نے اپنے ہم عصر آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد یا مولوی ذکاء اللہ کی طرح دہلی کالج میں تعلیم پائی ہوتی۔ تو شاید رام پور کا رنگ ہلکا ہوتا۔ اور کوئی دوسرا رنگ چڑھتا۔ لیکن لال قلعے میں تو لے دے کے شہزادوں کے صرف دو ہی مشغلے رہ گئے تھے۔ شاعری اور شاہد بازی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رام پور کا رنگ اور گہرا ہوتا گیا۔ شباب کی آمد نے اس رنگ کو اور چمکایا۔ چنانچہ نواب مرزا خاں کو ایک عاشق مزاج شاعر بنتے دیر نہ لگی۔ سوتیلے باپ نے داغ تخلص تجویز کیا۔ اور داغ شیخ ابراہیم ذوق کے کہ بادشاہ اور ولی عہد دونوں کے استاد تھے۔ شاگرد بن گئے۔ اور تقریباً دس سال تک ذوق سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا تو داغ اپنی غزلیں غالب کو دکھانے لگے۔ مگر ان کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔

ان دنوں قلعہ معلیٰ میں اور دوسرے شہر کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ داغ بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور غزلیں پڑھتے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ داغ کی پہلی غزل کون سی ہے۔ مگر مشاعرے میں پہلی بار جو غزل انہوں نے پڑھی اس کا مطلع یہ تھا۔

شررِ برق نہیں، شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں۔

جولائی ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ اور داغ کو معہ اپنی بیوی اور والدہ کے قلعے سے نکلنا پڑا۔ بہادر شاہ ظفر نے شاید ان کا کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا اس کی تصدیق ان کے ایک شعر سے ہوتی ہے۔

اے داغ اہلِ قلعہ کا لٹنا تو در کنار
تنخواہ بھی خزانۂ شاہی میں رہ گئی

داغ دہلی میں تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ عظیم شروع ہوا۔ اور انہوں نے قلعے کی تباہی اور دہلی کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ باپ کی پھانسی

کے بعد یہ دوسرا سانحہ تھا جو داغ پر گزرا۔ البتہ باپ کی وفات بہت بچپن میں ہو گئی تھی، لیکن اس وقت تو وہ ۲۴ سال کے باشعور جوان تھے۔ چنانچہ اس سانحے سے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے مشہور "شہر آشوب" کے علاوہ "گلزارِ داغ" کی متعدد غزلیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ حادثاتِ سانحہ کا زخم داغ کے دل میں مدت تک تازہ رہا۔

داغ نے جلوۂ داغ میں خود لکھوایا ہے کہ ان کا ایک دیوان بھی اس سانحے کی نذر ہو گیا۔ اس مجموعے میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں وغیرہ شامل تھیں۔ یہ ان کی بارہ سال کی مشقِ سخن کا نتیجہ تھا۔ اور داغ کے پاس اس کی کوئی نقل نہ تھی۔ البتہ جب داغ اپنا پہلا مجموعہ "گلزارِ داغ" مرتب کرنے لگے۔ تو پرانے دور کے ایک ایک دو دو شعر جو یاد آتے گئے وہ لکھ لیے اور پھر ان میں کچھ اور شعر بڑھا کر اس طرح چند پرانی غزلیں پوری کر لی گئیں۔ اس طرح پرانی غزلیں تو بلاشبہ پوری ہو گئیں۔ مگر آنے والی نسلوں کے لیے اب یہ سراغ لگانا بہت مشکل ہے کہ ان کھچڑی غزلوں کے کون سے شعر سانحے سے پہلے کے ہیں۔ اور کون سے بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہوتے ہی داغ ۱۸۵۸ء میں رام پور چلے گئے۔ نواب یوسف علی خاں (۱۸۵۵ء - ۱۸۶۵ء) والیٔ رام پور نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور اب داغ دوبارہ اطمینان اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ شعر کہنا اور نواب صاحب کی مصاحبت کرنا ان کا مشغلہ ٹھہرا۔ نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نواب کلب علی خاں ریاست کے مالک ہوئے۔ وہ اردو شاعروں کی سرپرستی میں باپ پر بھی سبقت لے گئے۔ چنانچہ انہوں نے امیر مینائی، جلال لکھنوی، منیر شکوہ آبادی، تسلیم، اماں، تسخیر، ظہیر غرض اردو کے قریب قریب سبھی چوٹی کے شاعروں کو اپنے دربار میں جمع کر لیا۔ داغ داروغۂ اصطبل مقرر ہوئے اور سرکاری مشاعروں کا انتظام بھی ان کے سپرد ہوا۔ نواب کلب علی خاں بھی داغ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ داغ کی وفاداری پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔ اور وہ ریاست کے باہر سفر میں داغ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے۔ ۱۸۷۲ء میں نواب صاحب حج کرنے گئے تو داغ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ گلزارِ داغ میں متعدد غزلیں ایسی ہیں جن میں حج بیت اللہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

داغ نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ گلزارِ داغ کے نام سے ۱۸۷۶ء میں رام پور ہی میں مرتب کیا۔ یہ دیوان جناب عرشی رام پوری کے بیان کے مطابق سب سے پہلے تاج المطابع رام پور میں ۱۸۷۸ء میں چھپا۔ اس دیوان میں ۳۹۱ غزلیں، ۷ رباعیاں، ۲ مخمس، ایک مسدس، ۲ قصیدے، ۲ تاریخی قطعات ہیں۔ دیوان کے اشعار کی مجموعی تعداد ۵۲۹۳ ہے۔ گنتی کے ان چند اشعار کے علاوہ جو لال قلعہ کی یادگار کے طور پر ذہن میں محفوظ رہ گئے تھے۔ اس مجموعے میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۸ء تک کا سارا کلام موجود ہے۔ یعنی انہوں نے بیس سال میں تقریباً ۵۰۰۰ اشعار کہے۔ اس حساب سے ان کی شعر گوئی کی ماہانہ اوسط دس بارہ اشعار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ داغ اپنی زود گوئی کے لیے بہت مشہور ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے دیوان ترتیب دیتے وقت بہت سے اشعار مجموعے سے خارج کر دیئے ہوں۔ داغ کے شاگردوں یا سوانح نگاروں نے ان کی زود گوئی کے بہت سے قصے بیان کئے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ داغ قریب قریب روز شعر کہتے تھے۔ بلکہ شعر بولتے تھے۔ لیکن کسی نے ان کی قوتِ انتخاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پرگوئی اور زود گوئی کے قصوں میں حقیقت سے زیادہ عقیدت کو دخل ہے۔

جذباتی وابستگی کے لئے نہ کوئی تعداد مقرر ہے اور نہ سن و سال کی قید ہے۔ گو کہتے ہیں کہ انسان کو عشق زندگی میں فقط ایک بار ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر کی الفتوں میں انسان آنے والے کے قدموں کی آہٹ سننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے بعد کی چاہتوں میں جانے والے کے قدموں کے نشان تلاش کرتا ہے۔ یہ عشق مر کے بھی امر ہو جاتا ہے۔ اور آدمی اس کی یادوں کو دل کے کسی نہ کسی گوشے میں تمام عمر محفوظ رکھتا ہے۔ بڑی دلکش مگر بڑی المناک ہوتی ہیں یہ یادیں۔ ایسا ہی ایک عشق داغ نے بھی کیا تھا۔ اور اڑتالیس سال کی عمر میں جب کہ وہ متعدد امراض کے باعث ادھیڑ بلکہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ کلکتے کی منی بائی

حجاب کا عشق تھا۔ جو انہیں ۱۸۷۹ء میں رام پور کے میلہ بے نظیر میں لگا۔ اس عشق نے انہیں بہت ستایا۔ اور داغ آخر عمر تک حجاب کو دل سے نہ نکال سکے اپریل ۱۸۸۲ء میں وہ حجاب کو حاصل کرنے کلکتے بھی گئے۔ مگر وہ آنا دپیشہ اور آزاد منش عورت تھی۔ رام پور میں داغ کی اسیر ہو کر رہنے پہ آمادہ نہ ہوئی۔ داغ ناکام و نامراد واپس آئے تو اسی عالمِ ہجر و یاس میں دودن کے اندر مثنوی فریادِ داغ لکھی۔ یہ مثنوی ان کے ماجرائے عشق کی داستانِ غم ہے۔ اس مثنوی میں داغ نے بے نظیر کے میلے۔ حجاب سے اپنی ملاقات۔ سفرِ کلکتہ اور پھر رامپور کی واپسی تک تمام واقعات بڑی بے باکی سے قلم بند کئے ہیں۔ یہ مثنوی نہیں۔ سچ مچ کی آپ بیتی ہے۔ اس میں داغ نے اپنے جذبات بڑے خلوص۔ بڑی سادگی، انکساری اور سچائی سے نظم کئے ہیں۔ اس مثنوی میں بڑی تڑپ۔ بڑا سوز ہے ۸۳۸ اشعار کی یہ مثنوی ۱۸۸۹ء میں مرادآباد میں چھپی تھی۔ مگر اس سے پہلے ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "آفتابِ داغ" کے نام سے ۱۸۸۴ء میں لکھنؤ سے شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعے میں کل ۱۹۱ غزلیں اور ۸ رباعیاں ہیں۔ اس میں ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۳ء تک کا کلام شامل ہے۔

نواب کلب علی خاں مارچ ۱۸۸۷ء میں انتقال کر گئے اور رام پور کی بساطِ سخن اجڑ گئی۔ چنانچہ داغ کو بھی تیس سال کے بعد رام پور چھوڑنا پڑا۔ وہ دہلی واپس آئے۔ اور کسی مستقل ٹھکانے کی تلاش میں اجمیر۔ لاہور۔ آگرہ۔ علی گڑھ۔ جے پور، منگرول۔ حیدرآباد دکن وغیرہ کی خاک چھانتے رہے۔ جب کوئی صورت نہ بنی تو ناچار دہلی لوٹ آئے۔ مگر کچھ مدت کے بعد میر محبوب علی خاں نظامِ دکن کا پیغام آیا اور داغ مستقل طور سے حیدرآباد چلے گئے۔ اور ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے۔ نظام نے ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور اب داغ امیرانہ شان و شوکت سے عشرت اور فراغت کی زندگی گزارنے لگے۔

دل سے چلو داغ کرو سیر دکن کی
گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر۔

ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ "مہتابِ داغ" کے نام سے ۱۸۹۳ء میں حیدرآباد ہی سے شائع ہوا۔ اس دیوان میں ۲۹۲ غزلیں ۱۹ رباعیاں ۲ مخمس ۶ قصیدے ۔ ۳۷ تاریخی اور ۴ غیر تاریخی قطعے ۔ ۴ سہرے ۔ ۲ سلام اور ۱۲۰ متفرق اشعار ہیں۔ کل اشعار ۵۲۱۸ ہیں۔

داغ کی صحت جوانی میں بھی اچھی نہ تھی۔ اور اب تو بڑھاپا تھا۔ خون کے دباؤ کے علاوہ آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہو جاتی۔ اس عالم میں فالج گرا۔ اور داغ ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو ۷۴ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ ان کی قبر حیدرآباد میں ہے۔

ان کی وفات کے بعد ان کا ایک اور مجموعہ "یادگارِ داغ" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ان کی حیات کے آخری بارہ سال کا کلام درج ہے۔ سنتے ہیں کہ ایک اور دیوان جسے خود انہوں نے مرتب کیا تھا۔ نظامِ دکن کے خزانے میں موجود ہے۔ مگر ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

داغ چمپئی رنگ کے میانہ قد انسان تھے۔ خرابیٔ صحت کے باعث رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اپنے اس رنگ پر انہوں نے اشعار میں جا بجا پھبتیاں بھی کسی ہیں۔ ان کی طبیعت میں نفاست کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دلی کا مغل لباس پہنتے۔ دن میں دو بار نہاتے۔ اور پوشاک تبدیل کرتے۔ پان کثرت سے کھاتے اور حقہ بہت شوق سے پیتے تھے۔ کھانا عمدہ اور لذیذ کھاتے۔ موسیقی کے بے حد دلدادہ تھے۔ چنانچہ حیدرآباد میں ان کے پاس ایک قوال اور کئی گانے والیاں باقاعدہ ملازم تھیں۔ داغ عموماً رات کے وقت ان سے گانا سنتے۔

داغ نہایت خلیق۔ مہمان نواز۔ دوست پرور۔ یار باش۔ رنگین مزاج۔ شوخ طبع اور بذلہ سنج انسان تھے۔ تنہائی سے انہیں بڑی چڑھ تھی۔ چنانچہ ان کے گھر پہ ہمیشہ دوستوں اور شاگردوں کا ہجوم رہتا وہ شعر بھی خلوت میں نہیں بلکہ انہی دوستوں اور شاگردوں کے مجمع میں کہتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ داغ شعر بولتے جاتے تھے اور شاگرد لکھتے جاتے تھے۔ زود گوئی ایسی تھی کہ بعض اوقات شاگردوں نے ابھی ایک شعر نہ لکھا ہوتا کہ داغ کی زبان پہ دوسرا شعر جاری ہو جاتا۔ داغ کبھی ایک مصرع نہ بولتے۔ جب لکھوانے تو پورا شعر لکھواتے کبھی کبھی تو پوری غزل ایک ہی بیٹھک میں مکمل ہو جاتی۔ داغ کے کلام میں خطابت

مکالمے، اور ڈرامائی لہجے کی جو فراوانی ہے، غالباً اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اشعار تنہائی میں بیٹھ کر خود نہ لکھتے تھے۔ بلکہ بھرے مجمعے میں دوسروں سے لکھواتے تھے۔ داغ کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ شاعر دور دور سے اپنی غزلیں اصلاح کے لئے بھیجتے۔ اور داغ ہر غزل کی اصلاح خود کرتے۔ حیدرآباد میں تو انہوں نے شاگردوں کا باقاعدہ ایک رجسٹر بنا لیا تھا۔

داغ کا ماحول

یوں تو معاشرے کا ہر عہد عہد آفریں اور ہر دور عبوری ہوتا ہے۔ مگر داغ کا زمانہ ہمارے ملک کی تاریخ میں بڑے ہیجان و اضطراب ۔ بڑی پیکار و کشمکش کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کا تسلط قریب قریب پورے ملک پر ہو چکا تھا۔ ان کے غلبے کے باعث ہمارے سیاسی نظام کا پرانا ڈھانچہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور سامراجی معیشت نے ملک کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ مغربی افکار و خیالات کی رو تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مگر مشرقی افکار و خیالات نے ابھی ہار نہ مانی تھی۔ بلکہ قدم قدم پر نئی قدروں سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک بند ٹوٹتا تو ہماری فکرِ کہن دوسرا بند باندھنے میں مصروف ہو جاتی۔ بنائے وطن اپنی مادی و ذہنی پسپائی پر ہراساں ضرور تھے۔ مگر انہوں نے ہنوز سپر نہیں ڈالی تھی۔ یہ تصادم زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ تعلیم ہو یا فنونِ لطیفہ، عقائد ہوں یا رسم و رواج۔ طرزِ معاشرت ہو یا طرزِ کلام۔ صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اردو ادب کا مطالعہ کیا جائے تو نئی اور پرانی سوچ۔ نئے اور پرانے جذبات و احساسات۔ نئے اور پرانے زاویۂ نگاہ نئے اور پرانے پیرایۂ بیان۔ نئے اور پرانے موضوعات کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایک صف میں غالب، سرسید، آزاد، حالی اور نواب محسن الملک وغیرہ ملتے ہیں۔ تو دوسری صف میں روایتی شعرا اور ادبا کا جمِ غفیر۔ ان کے سرغنہ داغ اور امیر مینائی ہیں۔

ایک اور گروہ ان کے درمیان کھڑا ہے۔ اس میں مولوی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی اور رتن ناتھ سرشار صاف پہچانے جاتے ہیں۔ یہ گروہ مقابل کی دونوں صفوں پر تیر پھینکتا ہے۔ اور دونوں کو للکارتا ہے۔ غالب اور سرسید کا گروہ نباضِ عصر ہے۔ زندگی کے نئے تقاضوں سے واقف ہے۔ اور مغرب کی نئی قدروں کو اپنانے ہی میں قوم کی نجات دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک روایتی ادب زہرِ قاتل ہے۔ جس نے قوم کی قوتِ فکر و عمل کو مضمحل کر دیا ہے۔ اس لئے وہ ایسا ادب تخلیق کرتا ہے۔ جو نیچرل ہو جس سے قوم میں جان آئے۔ قوم خوابِ خرگوش سے بیدار ہو۔ اس میں کسب و جہد کی قوتیں ابھریں، خود اعتمادی پیدا ہو وہ عقل سے کام لے اور جذبات کی رو میں بہنے سے باز آئے۔ دوسرا گروہ اہلِ مغرب کے تسلط کا زخم خوردہ ہے۔ مگر وہ افکارِ مغرب سے بھی آزردہ ہے۔ وہ فرنگی اقتدار کو قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے اپنی پرانی روایتیں بہت عزیز ہیں۔ اور وہ انہی کی بقا و تحفظ میں قوم کی بھلائی دیکھتا ہے۔ اسی لئے وہ روایت کی گلی سڑی لاش کو کندھے پر اٹھائے کبھی رامپور میں پناہ لیتا ہے۔ کبھی حیدرآباد میں۔ کیونکہ ان نام نہاد ریاستوں میں اسے انگریزوں سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا تھا۔ کہ اس کی قدیم تہذیب دشمن کے دست برد سے بچ گئی۔ اسے انگریزوں کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اور نہ ان کی شان میں قصیدے لکھنے پڑتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے قومی اور ذاتی وقار کو مجروح ہونے سے بھی بچا لیتا تھا۔ نوابوں کے طفیل اسے بلا ہاتھ پاؤں ہلائے شاعری اور مصاحبت کے عوض دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ اور چونکہ قوم پر بھی ابھی پرانی روایتوں کا غلبہ تھا۔ اس لئے اس گروہ کو اپنے کلام کی داد مل جاتی تھی۔ تن آسانی اور سلامت روی کی جو راہ ان شاعروں نے اختیار کی۔ یہی تن آسانی اور سلامت روی ان کی فنی تخلیقات میں بھی جھلکتی ہے۔ ان میں کسی جذباتی۔ فکری یا فنی اجتہاد کی نہ صلاحیت تھی اور نہ جرأت۔

داغ کی صفائی میں یقیناً ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ صاحب وہ دلی میں رہتے تو کھاتے کیا۔ اور ریاستوں میں پناہ نہ لیتے تو جاتے کہاں۔ مگر یہ دلیل دل کو نہیں لگتی۔ انگریزوں نے انہیں تحصیلداری پیش کی تھی۔ لیکن وہ انگریزوں کی نوکری کرتے تو ان کی نوابی شان کیونکر قائم رہتی یہ بھی درست نہیں ہے کہ وہ نئی قومی تحریکوں سے واقف نہ تھے۔ اول تو یہ تحریکیں ایسی پوشیدہ اور گمنام نہ تھیں کہ رامپور یا حیدرآباد میں کسی کو ان کی خبر ہی نہ ہو۔ دوم ان کے بعض نیک نیت دوستوں نے انہیں

مشورہ بھی دیا تھا۔ کہ ریاست میں پڑے کیا اپنی مٹی برباد کر رہے ہو۔ یہاں سے نکلو اور قوم و وطن کی کچھ خدمت کرو۔ مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ یہاں ان کے ایک دوست اور سوانح نگار نثار علی شہرت کی روایت نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ شہرت لکھتے ہیں کہ "ایک روز میں نے داغ صاحب سے کہا کہ۔۔ ۔۔۔ اگر مجھ کو فرصت ہوتی تو میں ایسا شاعر نہ بنتا۔ جیسے آپ بنے ہوئے ہیں۔ میں اپنی نظموں سے قوم کی رہنمائی کا کام لیتا نہ فقط یہی بلکہ پولیٹیکل اور سوشل قسم کے دقائق کو نظم کا لباس پہناتا جس سے پوشیدہ فائدہ حاصل کرتے"۔ داغ صاحب نے میری تقریر کو غور کے ساتھ سنا اور فرمایا دوست تم سچ کہتے ہو۔ لیکن کیا کروں ایک کام اپنے ذمے لیا ہے وہ ہی پورا نہیں ہوتا۔ میں نے پوچھا وہ کام کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ جس طرح کان میں سے جواہر نکلتے ہیں۔ اس طرح قلعہ معلی اور دہلی میں سے اردو نام درنہ زبان نکلی ہے۔ جس کے محاورے لعل و یاقوت کو پرے بٹھاتے ہیں۔ پس کوشش یہ ہے کہ دہلی کی شستہ و رفتہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جائے اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جائے جیسی کہ دہلی میں بولی جاتی ہے۔ گو مجھ کو اس امر میں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ دو آدمی خاص اس امر کے لئے متعین کو رکھے ہیں کہ جو روز ڈاک میں ہندوستان کے شہروں سے اصلاح کے لئے غزلیں آئیں وہ بعد اصلاح روانہ کر دی جایا کریں۔ پیارے شہرت اگر تمام ہندوستان کی زبان دہلی کے مطابق ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے (آئینہ داغ صفحہ ۲۴)

یہ واقعہ ۱۸۸۶ء کا ہے۔

اس طویل اقتباس سے داغ کے طرزِ عمل پر اعتراض مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتانا ہے۔ کہ زمانے میں ملک میں جو نئی تحریک ابھر رہی تھی۔ داغ اس سے واقف تھے۔ مگر ان کی پرورش جس نوابی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور انہوں نے اپنے لئے عیش کوشی اور آرام پسندی کی جو زندگی منتخب کی تھی۔ اس کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ پرانی ڈگر پر چلتے رہیں۔ اور نئی ڈگر سے گریز کریں۔

نہ دیا خواہشِ آرام نے آرام مجھے
مجھ کو کھینچے مری راحت طلبی پھرتی ہے۔

داغ کے تین دور

داغ کی شاعری کے تین دور ہیں۔ پہلا دور قلعہ معلی کا۔ دوسرا جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا۔ جس کے اثرات غدر کے بہت بعد تک ان کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ اور تیسرا دور ریاستی شاعری کا جو رام پور میں شروع ہوا۔ اور حیدر آباد میں کمال کو پہنچا۔ اس لحاظ سے گلزارِ داغ ان کا سب سے نمائندہ مجموعہ ہے۔ کیونکہ اس میں پہلے اور دوسرے دور کا سارا کلام موجود ہے اور تیسرے دور کی چھاپ بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔

قلعہ معلی کے دور کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ داغ کا پہلا دیوان ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا تھا۔ گلزارِ داغ میں جو غزلیں قلعۂ معلی کی یادگار ہیں۔ ان میں بھی۔۔۔۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔۔۔۔ فقط چند ہی شعر ہیں۔ جن سے اس دور کا سراغ ملتا ہے۔ داغ کے سوانح نگار کا کہنا ہے کہ کم از کم مندرجہ ذیل غزلیں داغ نے قلعہ معلی میں کہی تھیں۔

(۱) بے کسی صدمۂ ہجراں کی مجھے تاب نہیں
(۲) کب ہوا اے بُتِ بیگانہ منش تو اپنا
(۳) عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
(۴) نالا اب تیر سینے سے کہ جانِ پُرالم نکلے

ان کے علاوہ گلزارِ داغ میں کئی ایسی غزلیں موجود ہیں۔ جو غالب۔ مومن اور ذوق کی زمین میں کہی گئی ہیں۔ غالباً یہ غزلیں بھی ۱۸۵۷ء کے سانحے

سے پہلے کی ہیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا ایک شعر یہ ہے۔

دھوم صبحِ محشر کی داغؔ سنتے آئے ہیں
پر نہیں کچھ اندیشہ خواب ہے گراں اپنا

اس شعر میں قیامت کا صنعر ہے اگر اس شعر کا اضافہ رام پور میں نہیں ہوا۔ بلکہ قلعہ معلیٰ کی یادگار ہے تو اس سے داغؔ کی معاملہ شناسی اور بالغ نظری کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ قوم اور قلعہ معلیٰ دونوں کے انجام سے آگاہ تھے۔ اور جو غفلت اہلِ وطن پر طاری تھی۔ اس سے باخبر تھے۔

اس دور کی غزلوں میں بڑی سنجیدگی اور متانت ہے۔ شاید اس لئے کہ ابھی داغؔ کا عشق بازاری نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے صبر اور ضبط سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ چھوری باتیں نہیں کرتے۔ ان کی جذبات نگاری بھی سطحی نہیں ہے۔ بلکہ دل کی داخلی کیفیت اس سے عیاں ہوتی ہیں۔ اور آتشِ اُلفت کی ہلکی ہلکی آنچ آتی ہے۔ ابھی ان کے کلام میں کامیاب عاشق کی نشاط انگیزی۔ شوخی اور طراری نہیں آئی ہے بلکہ چوٹ کھائے ہوئے دل کا کرب و درد ہے۔ افسردگی اور نیازمندی ہے۔ محاوروں کی بہتات بھی نہیں ہے۔ البتہ رعایت لفظی اور معاملہ بندی پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے۔ زبان میں ابھی وہ روانی سلاست اور صفائی نہیں آئی ہے جس کے لئے داغؔ مشہور ہیں۔ اور نہ اظہارِ بیان پر ابھی پوری قدرت پائی ہے۔ ابھی وہ بات رک رک کر اور سوچ سوچ کر کرتے ہیں۔ اس دور کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

شررِ برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

بے کسی صدمۂ ہجراں کی مجھے تاب نہیں
کاش دشمن ہی چلے آئیں جو احباب نہیں

تہ میں بھی نہ بجھی آتشِ غم وائے نصیب
ہم جہاں دفن ہیں واں زیرِ زمیں آب نہیں

تجھ کو اے بخت سیہ آگ لگا کر دیکھوں
شبِ ہجراں میں اگر جلوۂ مہتاب نہیں

پوچھتے کیا ہو کہ دیکھا شبِ وعدہ کیا کیا
تم سے تعبیر بن آئے وہ مرا خواب نہیں

موت اب کوچۂ قاتل میں کھڑی رہتی ہے
یہ بھی قسمت کی ترے اے دلِ بیتاب نہیں

دیکھ بت خانے میں تصویر کا عالم اے شیخ
یا مصلا نہیں یا منبر نہیں محراب نہیں

آنکھ لگتی ہے تو کہتے ہیں کہ نیند آئی ہے
آنکھ اپنی جو لگی چین نہیں خواب نہیں

نہ ملے مجھ کو مرے حال پہ رونے والے
چین کیسا کہ یہاں غم کے بھی اسباب نہیں

مجھ سے بے تاب کی میت پہ ملیں کیوں کاندھ
کیا میسر مرے احباب کو سیلاب نہیں

حالِ دل جس سے کہا اس نے کہا بس خاموش
داغؔ اس درد کے سننے کی ہمیں تاب نہیں

داغؔ کی شاعری کا یہ حزنیہ دور ہے۔ وہ عشق کا درد محسوس کرتے ہیں۔ ہجر میں شدتِ غم سے تڑپتے ہیں اور بے تاب ہو کر مرنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ابھی وہ "لطف کے بندے" نہیں بنتے ہیں۔ شاید دلّی کے حالات اور ماحول کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ شہر پہ غبار کا سا چھا رہا تھا۔ وظیفہ خوار بادشاہ قلعہ کے اندر بیٹھا اپنی بیچارگی اور بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ امرائے شہر کی پرانی شان و شوکت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ عام لوگوں کا ذریعہ معاش چھن رہا تھا۔ ہر شخص مصیبت میں مبتلا تھا۔ ہر طرف پریشانی و سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ اور مایوسی و شکستہ خوردگی کا غلبہ تھا۔ ان حالات میں خوشی کے گیت کون گا سکتا تھا۔

اس دور میں داغؔ المیہ شاعری کو نشاطیہ شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اور انہی اشعار کو پسند کرتے تھے جو احساسِ غم سے لبریز ہوں۔ جن میں سوز و گداز پایا جاتا ہو۔ جو سننے والوں کو تڑپائیں اور رلائیں۔

رہتا ہے نام صاحبِ سوز و گداز کا
تاثیر شعر اشکِ داغؔ ہی میں رہ گئی

داغؔ کو ہم صاحبِ سوز و گداز نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ ان کے کلام میں اشکی داغی اشعار کی وہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ جو میرؔ کے اشعار میں ملتی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ پہلے اور دوسرے دور میں ان کا عام رجحان یہی ہے کہ وہ اپنے اشعار میں سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اس دور میں وہ میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے معتقد او مقلد نظر آتے ہیں۔ نہ کہ جرأت کے۔

دوسرا دور

داغؔ کی شاعری کا دوسرا دور قلعہ معلی سے نکلنے کے بعد شروع ہوا۔ قلعے سے نکل کر وہ تین چار سال تک بڑے آلام و مصائب میں مبتلا رہے۔ مرزا فخرو کے سایہ عاطفت میں انہیں نہ معاش کی فکر تھی نہ گھر کی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ مگر اب تو اپنی ماں اور بیوی اور دوسرے متعلقین کا بوجھ انہیں کے سر پہ تھا۔ قلعے سے کچھ وظیفہ مل جاتا تھا۔ لیکن اس میں گزر مشکل سے ہوتی تھی۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ قلعے سے ننگے جو کے نہیں نکلے تھے، بلکہ کافی اثاثہ لائے تھے۔ تو بھی شہر میں اب ان کی پہلی سی عزت و توقیر نہ تھی۔ بے بضاعتی سے زیادہ ان کو اپنی اس بے وقعتی کا ملال تھا۔ کیونکہ آدمی جتنی اونچی جگہ سے گرے اتنی ہی زیادہ چوٹ آتی ہے۔ اسی دور کی ایک غزل میں وہ اپنے قلبی محسوسات کو بڑے شاعرانہ مبالغے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

وہ میں کہ ملتا تھا مجھے ساغرِ جمشید — پیتا ہوں لوگ تا سبُو خونِ جگر آج
وہ میں کہ مرا قصر تھا اک رشکِ ارم تھا — بستر ہے گدا یانہ سرِ راہ گذر آج
وہ میں کہ مجھے سیرِ گلستاں سے غرض تھی — ہے خونِ جگر اور مرا دیدۂ تر آج
ساماں تھا دنیا کا مرے واسطے موجود — دنیا سے گذرنے کا نہیں زادِ سفر آج

ابھی داغ محرومیٔ فردوس کے ماتم سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہر میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ پہلے ملکی فوجوں نے شہر پر قبضہ کیا۔ مگر انہوں نے اپنی نااہلی جلد ثابت کر دی۔ دشمن سے بے فکر ہو کر وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوگئے۔ اور غداروں کی بن آئی۔ ادھر انگریز تاک میں تھے۔ انہوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور بہادر شاہ ظفر کی نظامِ شاہی ختم ہوگئی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی اس بغاوت کا بڑا عبرت ناک انتقام لیا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی کیا عورت کیا مرد، کیا بوڑھے کیا جوان سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ اور توپوں سے اڑائے گئے۔ نہ کسی کی داد تھی نہ فریاد، اور نہ گناہ گار اور بے گناہ کا فرق تھا۔ نہ کسی کی عزت و آبرو محفوظ تھی نہ جان و مال۔ غرض مہینوں وہ ہنگامہ دار و گیر برپا رہا کہ زمین و آسمان فریاد کرنے لگے۔

داغ اپنی جان چھپائے شہر کے کسی گوشے میں بیٹھے یہ سب دیکھتے رہے اور حیرت ہے کہ قلعے سے قریبی تعلق کے باوجود وہ انگریزوں کے ظلم سے بچے رہے۔ شاید دہلی کا ماتم کرنے کے لئے۔ اور آج ہم بڑے فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنی تمام راحت طلبیوں کے باوجود ان کے حساس دل نے اس حادثۂ جانکاہ سے گہرا اثر لیا۔ وہ جہاں آباد کی بربادی پر واقعی خون کے آنسو روئے ہیں۔ انگریزوں نے اہالیانِ شہر پر جو ستم ڈھائے یہ سفاکیاں کیں، داغ کا سینہ ان سے چھلنی ہے۔ اس دور کے ایک ایک شعر سے جوشِ الم اور شدتِ احساس کے آنسو ٹپکتے ہیں۔ بڑی برہمی، تلملاہٹ اور درد ہے ان شعروں میں۔ ان کی حقیقت نگاری میں جذبات کے خلوص اور بیان کے زور نے ایسی کیفیت بھر دی ہے کہ پڑھنے والوں کے دل ہل جاتے ہیں۔

مگر حیرت ہے کہ اردو کے تذکرہ نویسوں اور تنقید نگاروں نے داغ کے اس دور کے کلام کو بالکل درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ وہ درد و مصیبت کی اس کہانی سے یوں کترا کر گذر جاتے ہیں گویا یہ اشعار داغ کی شاعری پر کوئی بدنما داغ ہیں۔ حالانکہ تعصب اور مصلحت کی عینک کو اتار کر دیکھا جائے تو داغ کے اس دور کا کلام بڑا منفرد اور ممتاز ہے۔ ان کے کسی ہمعصر کے مجموعے میں ہمیں اس ٹھن گرج کے دو شعر بھی نہیں ملتے۔ ان کا ایک شہر آشوب ہے جو ان کو حیاتِ دوام بخشنے کو کافی ہے۔ اور داغ نے یہ اشعار دہلی کے میدانِ حشر میں اس وقت لکھے ہیں جب کسی کو لب کھولنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ لوگ اپنے مردوں کے ماتم بھی نہ کر سکتے تھے۔ سارا شہر جاسوسوں اور مخبروں سے پٹا پڑا تھا۔ سرکار کو ذرا کسی کی وفاداری پر شبہ ہوا کسی کے خلاف مخبری ہوئی جبھی کہ سر تن سے جدا ہوگیا۔ نہ وکیل، نہ دلیل، نہ اپیل۔ اس کٹھن اور تہمت بھری فضا میں شعر کہنا۔ اور وہ بھی ایسے شعر جن میں فریاد و فغاں کے تیروں کا رخ انگریزوں کی طرف ہو بڑے دل گردے کا کام تھا۔ مگر ان بندشوں کے باوجود داغ نے زبانِ قلم سے وہ سب کچھ بے دھڑک کہہ دیا جو ان کے دل پہ گذرتی تھی۔ ایک غزل میں وہ اس زبان بندی کا ذکر کرتے ہیں۔ ؎

ہے قہر اگر اب بھی نہ ہو رازِ نہاں بند
لب بند، نفس بند، دہن بند، زبان بند

پھر بھی ان کی اخلاقی جرأت انہیں سچ بات کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ اپنے جذباتِ قلبی کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

اے محتسب اک دم سے ترے کتنی بلائیں
شیشے کا ہے دم بند، صراحی کا گلا بند
اک حرفِ محبت پہ بگڑتے ہیں وہ سو بار
اب دفترِ افسانۂ الفت ہی ہوا بند

داغ کا شہر آشوب دراصل دہلی کا مرثیہ ہے۔ اس شہر آشوب کے ابتدائی تین بندوں میں داغ نے دہلی کی عظمتِ رفتہ کا ذکر کیا ہے۔

یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا جس کا   چراغ رشکِ تجلائے طور تھا جس کا۔

گڑھ مکتیشر اور الہ آباد وغیرہ سے جب دیسی فوجیں دہلی میں آئیں تو ان کی وجہ سے شہر میں بدامنی پھیل گئی۔

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربیے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

داغؔ ان پوربیوں سے خفا معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور غزل میں کہ دہلی کا نوحہ ہے۔ انہوں نے ان دیسی فوجوں کی لوٹ مار پہ ناراضگی کا اظہار کیا ہے

لے گئے لوٹ کے اب شوکت و شانِ دہلی
پوربی پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی

ممکن ہے کہ انہوں نے پوربیوں کی برائی مصلحتاً کی ہو۔ تاکہ فرنگیوں کے مظالم پر انہوں نے جو کچھ لکھا۔ اس پر پردہ پڑ جائے۔ اور وہ عتاب سے محفوظ رہیں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ دیسی فوجوں کی وجہ سے دہلی میں جو تاراج پھیلا تھا۔ داغؔ اس کو ناپسند کرتے ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ داغؔ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے دیسی فوجوں کو خوش آمدید کہا اور نہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بلکہ غیر جانبداری کے گوشۂ عافیت میں خاموش بیٹھے رہے۔ البتہ شہر کی تاراجی اور شہریوں کا قتل عام چونکہ انگریزوں نے کیا تھا۔ اس لئے شہر آشوب اور فغانِ دہلی میں دراصل فرنگی ہی داغؔ کی ملامتوں کا نشانہ بنے ہیں۔

دے دیا فوج کو انعام میں حکام نے سب
گنج قاروں سے فزوں گنج نہانِ دہلی

اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہیں ہوں حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی

آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے
کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

اسی غزل کے ایک شعر میں ان فوجوں پر بھی بڑا لطیف طنز کیا ہے۔ جو جنرل نکلسن اور جنرل لارنس کی کمان میں پنجاب سے دہلی کو فتح کرنے گئی تھیں۔

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب
گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی

احتیاط کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ان لالہ رخوں کو اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جائے۔ شہر آشوب میں گلشن آباد کی بہاروں کا قصیدہ پڑھنے کے بعد داغؔ اس کی خزاں کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی — پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اشک سے مژہ خوں چکاں نظر آئی — نہ کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گل رخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحان کے چہچہے نہ رہے

اور تب حاکموں کی ستم رانیوں اور خون آشامیوں کا ماتم کیا۔

لہو کے چھینٹے ہیں چشم پر آب کی صورت — شکستہ کاسہ سر ہیں حباب کی صورت

لٹتے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت   کہاں یہ حشر میں تو یہ عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی

رسن ہے طوق ہے گردن ہے بے گناہوں کی

دفاتر میں اہلِ علم و ہنر پر جو تشدد ہو رہا تھا۔ اس پر دلی زبان سے احتجاج کیا ہے۔

ہے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی   تلاشِ بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی

جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی   کہ حکم عام ہے بھرتی ہے نیمہ خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ

کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

انگریزوں نے شہریوں کو سزا دینے کے لئے عجیب و غریب قانون بنائے تھے۔ اور مجرموں کے مقدموں کی سماعت نرالے ڈھنگ سے ہوتی تھی۔ چنانچہ داغ نے اس چنگیزی انصاف کا پول اس شعر میں کھولا ہے۔

وہی قاتل، وہی مخبر، وہی منصف ٹھہرے

اقربا میرے کریں خون کا دعوےٰ کس پہ

عین ممکن ہے کہ اس شعر میں دہلی کی کسی معزز ہستی کے بے جا قتل کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔

فرنگیوں کے دلوں میں انتقام کی آگ ایسی بھڑکتی تھی کہ بجھنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ہر روز ظلم و جور کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوتے تھے۔ اور موجِ خون تھی کہ چڑھتی ہی آتی تھی۔

داغ نے "ابتدائے عشق" کی ان تلخ کامیوں کو بڑے حسین اور پُر تخیل انداز میں بیان کیا

دریائے الفت میں مت کیا جانے آگے کیا بنا

چین جبین یار ہے اور موج ہے ساحل کے پاس

داغ دلی کے انجام سے مایوس ہو چکے تھے۔ نہیں یقین ہو گیا تھا کہ عروس البلاد کا سہاگ ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا۔ اور اب اس کی بہاریں پھر کبھی واپس نہ آئیں گی

پھریں گے داغ نہ دہلی کے دن یقین مانو

نہیں ہے چرخ میں دولابِ چاہ کی گردش

یہ تو چیدہ چیدہ اشعار ہیں۔ حالانکہ گلزارِ داغ میں متعدد ایسی غزلیں موجود ہیں۔ جو پوری کی پوری اسی رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ اور داغ کے جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہاں ہم فقط ان کی نشان دہی پر اکتفا کرتے ہیں

(۱) ترے خرام سے برپا ہے شور و شر کیسا

اٹھا یہ فتنہ قیامت سے پیشتر کیسا

(۲) جواب کی دل جلوں نے تیرے تو یہ خاک داں پھونکا

زمین کیا آسمان پھونکا مکاں کیا لا مکاں پھونکا

(۳) وہ کچھ سنائیں کہ صیاد دردمند ہوا
قفس میں بند ہوئے پر بھی ہیں نہ بند ہوا

(۴) میں کیا کہوں بلا سے جو تو مہرباں ہے اب
وہ دل کہاں ہے اب وہ طبیعت کہاں ہے اب

(۵) ہے طرفہ تماشا سرِ بازارِ محبت
سر بیچتے پھرتے ہیں خریدارِ محبت

(۶) بہ رنگِ حسرت مثالِ ارماں جو آ گیا یاں سے پھر نہ نکلا
رہے گا سینے میں تیر تیرا اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر

آخری شعر خاص توجہ کا محتاج ہے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ اردو شاعری میں "اسیرِ قیدِ فرنگ" کی ترکیب سب سے پہلے داغ نے استعمال کی ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ غالب نے "قیدِ حیات رہی، نہ تپ۔ فرنگ کا ٹکڑا اسی شعر سے لیا ہو۔ داغ نے اسیرِ قیدِ فرنگ کو حبسِ دوام سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے شعر میں بڑی بلاغت پیدا ہو گئی ہے۔

اس دور کے اشعار کی شناخت مشکل نہیں ہے۔ بشرطیکہ گلزارِ داغ کا مطالعہ غور سے کیا جائے۔ بعض اشعار تو اتنے واضح ہیں کہ ان کی دوسری کوئی توجیہہ ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن ان غزلوں کے پوشیدہ مطالب بھی جن میں داغ نے اپنا مفہوم اشاروں، کنایوں میں بیان کیا ہے۔ یا حالاتِ حاضرہ کے اسرار و رموز غزل کی مروجہ اصطلاحوں اور علامتوں کے ذریعہ آشکار کئے ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ کیونکہ اول تو اس دور کی غزلوں کا مزاج۔ تیور اور لہجہ پہلے اور تیسرے دور کی غزلوں سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے یہ کہ داغ نے جو مروجہ استعارے تشبیہیں، اور علامتیں استعمال کی ہیں۔ ان میں نئے معنی بھر دیئے ہیں۔ کہ ان معانی سے ہٹ کر ان کی اور تاویل کریں تو شعر بالکل پھسپھسا ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ داغ نے ان علامتوں کو جس کثرت سے اس دور میں استعمال کیا ہے۔ پہلے اور آخری دور میں استعمال نہیں کیا۔ مثلاً قاتل و مقتل، صیاد و قفس، تیغ و خنجر، گناہ و خطا، سزا و جزا، دار و فریاد وغیرہ ذیل کے چند شعر اپنے رمز و کنائے کے باوجود کتنے واضح ہیں

تیری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا
اِدھر چمکی، اُدھر سلگی، یہاں پھونکا، وہاں پھونکا

رہا تھا کون سا ارماں جیتے جی جلانے کو
جو تو نے لاش کو بھی میری اب اے بدگماں پھونکا

بجھی کب عندلیبِ سوختہ دل کی لگی تجھ سے
چراغِ گل کو کب پھونکا جو اے بادِ خزاں پھونکا

کہاں صیاد کیسا باغباں کس پر گری بجلی
چمن میں آتشِ گل نے ہمارا آشیاں پھونکا

مختصر یہ کہ داغ نے اور فقط داغ نے اس پر آشوب زمانے کا نقشہ بڑی سچائی۔ بڑی فنی چابک دستی اور بڑے جوش سے کھینچا ہے۔ اور اگر ادب

روحِ عصر کا آئینہ ہے اور ادیب اپنے عہد کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے تو داغؔ کا کلام بلاشُبہ اس دور کے آلام و مصائب کی بولتی تصویر ہے۔

مگر شاعرِ آتشِ بیان کے "سوزِ دل" کو ثبات نصیب نہیں ہوا۔ چنگاری شعلہ نہ بن سکی۔ ورنہ شاید اس مشعل سے غلامی کی تاریک راہیں روشن ہو جاتیں داغؔ رام پور چلے گئے۔ وہاں کی درباری فضا کا جو اثر ہونا تھا وہ ان پر ہوا۔ حالانکہ انہوں نے جو غزل رام پور کے پہلے مشاعرے میں پڑھی۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے دکھی ہیں۔

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں

اب کے رام پور میں داغؔ تقدیر کے جس چکر میں پھنسے۔ اس سے آخر دم تک نہ نکل سکے۔

تیسرا دور

رام پور نے انہیں آرام و راحت کی گود میں پالا تھا۔ اور اب یہی سامانِ عشرت انہیں بھی میسّر تھے۔ چنانچہ دلی میں ان پہ جو افتاد پڑی تھی۔ اس کی یادیں رفتہ رفتہ ذہن سے محو ہوتی گئیں۔ اب داغؔ نہ تو غمِ عشق کی سوزش سے تڑپتے ہیں۔ اور نہ غمِ زمانہ کا ماتم کرتے ہیں۔ اب وہ شاعرِ نشاط و انبساط ہیں اور ایک فاتح عاشق۔ وہ معشوق سے بہ شوخ انداز میں چہلیں کرتے ہیں۔ اپنی کامرانیوں کے راگ الاپتے ہیں۔ اور خوشیوں کے گیت گاتے ہیں۔ ان خصوصیات کی جھلکیاں گلزارِ داغؔ میں ملتی ہیں۔ مگر بہت نمایاں نہیں ہیں۔ البتہ آفتابِ داغؔ اور مہتابِ داغؔ میں اپنے عروج کو پہنچ گئی ہیں۔

بے عشق کے جینا مجھے دم بھر بھی نہ ہوتا
سودا جو نہ ہوتا تو مرا سر بھی نہ ہوتا

اور یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں۔ بلکہ امرِ واقعہ ہے۔ چنانچہ وہ کبھی حجابؔ سے عشق کرتے ہیں، کبھی صاحب جان سے۔ کبھی عمدہ جان اور الٰہی جان کی الفت کا دم بھرتے ہیں۔ اور کبھی لطیفؔ، بھمّی، اخترؔ اور کبرؔی کو منظورِ نظر بناتے ہیں۔ یہ تو باہر والیاں تھیں۔ گھر کے اندر بھی وہ جوان جوان خادمائیں رکھتے ہیں اور ان سے چھیڑ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے عشق کو قرار اور ثبات نہیں ہے۔

اک نہ اک ہم لگائے رہتے ہیں
تم نہ ملتے تو دوسرا ہوتا

یہاں اس سے بحث نہیں کہ خوش جانوں سے ان کی یہ لگاوٹیں پاکیزہ تھیں۔ یا جنسی ہوس ناکی کا نتیجہ۔ بات یہ ہے کہ شاعرانہ جذبات کو ابھارنے کے لئے داغؔ کو جن خارجی محرکات کی ضرورت تھی۔ وہ ان کے پاس موجود تھے۔ بعض لوگ میر تقی میرؔ کی مانند محبوب کی ایک ہی گلابی سے تمام عمر مدہوش رہتے ہیں۔ اور ان کو دوسرے جام کی طلب ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس بعض لوگ داغؔ کی مانند اپنے تجربوں سے گہرا اثر نہیں لیتے۔ بلکہ ان کو ہر لمحہ نئے تجربے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تب کہیں ان کی حس بیدار ہوتی ہے۔ اور ان کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ داغؔ کے یہ جذبات بڑے سطحی اور عارضی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ نوح ناروی نے الٰہ آباد کی نبی جان کی تصویر دکھائی اور داغ تڑپ اٹھے۔ ملکہ جان نے ایک خط لکھ دیا۔ اور داغؔ ریشہ خطمی ہو گئے۔ داغؔ کا عشق نہ تھا۔ اچھا خاصہ کشتہ یا معجون تھا جس سے وہ شعر میں حرارت پیدا کرتے تھے

لیکن داغؔ کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ان تجربات اور احساسات پر پردہ نہیں ڈالتے ہیں۔ نہ انہیں دباتے ہیں۔ اور نہ ان کی الٹی سیدھی تاویلیں کرتے ہیں۔ وہ علانیہ کہتے ہیں کہ عشق میری غذا ہے۔ اس کے بغیر نہ میں جی سکتا ہوں نہ شعر کہہ سکتا ہوں وہ اپنے اس عشق کے اظہار میں جھجکتے شرماتے بالکل نہیں کیونکہ

ان کے دل میں چور نہیں ہے۔ وہ اپنے کئے پر نادم نہیں بلکہ خوش ہیں۔ کیونکہ وہ اس محبت یا لگاوٹ کو معیوب نہیں سمجھتے۔ اسی وجہ سے وہ احساسِ گناہ کی ذہنی کوفت سے بچے ہوئے ہیں۔ اور ان کی شاعری کا دامن منافقت کے گھناؤنے دھبوں سے محفوظ ہے۔ جنسی واردات جرأت نے بھی خوب خوب بیان کئے ہیں۔ مگر جرأت محبوب کے خیال سے وصل کرتے ہیں۔ ان کی جنسی لذتیت فقط ذہنی عیاشی ہے۔ اس کے بالمقابل داغ محبوب کے جسم سے بھرپور لذت لیتے ہیں۔ ان کے کلام میں جنسی آسودگی ہے۔ جنسی تشنگی نہیں ہے۔ اس جنسی آسودگی کے باعث ان کی شاعری ایک عیاش اور خوش باش رئیس زادے کی جنسی فتوحات کی داستان ضرور بن گئی ہے۔ مگر ان کے جذبے کی صداقت اور ان کی اخلاقی جرأت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ داغ کے ظاہر و باطن میں قول و فعل میں شخصیت اور شاعری میں تضاد نام کو نہیں پایا جاتا۔

داغ کی شاعری فکر و نظر کی شاعری نہیں ہے۔ وہ زندگی کی گتھیاں نہیں سلجھاتے ہیں۔ اور نہ پیغمبری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے پاس تو سرے سے کوئی پیغام ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو یہ کہ کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ۔ ان کا مسلکِ حیات خوش باشی ہے۔

افسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے

یا

دن گذارے عمر کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی نکلے تو میری جان ہنستے بولتے

وہ عشق کی گہرائیوں میں نہیں جاتے اور نہ فلسفہ مسرت کے اسرار بیان کرتے ہیں۔ ان کا عاشق کبھی سراپا جسم ہے۔ اور ان کا معشوق بھی۔ انہیں نہ عاشق کے ذہن سے کوئی واسطہ ہے۔ اور نہ معشوق کے ذہن سے کوئی سروکار۔ البتہ معشوق اگر "خواندہ" شعر لو اور شوخ ہو تو بہتر ہے۔

"معشوق کیا جو شوخ نہ ہو خوش گلو نہ ہو"

داغ مسائلِ حیات پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بھی عادی نہیں ہیں۔ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کہ ان کے گرد و پیش کی دنیا حسین ہے یا مکروہ، خوش ہے یا غمگین وہ تصوف و اخلاق کے مروجہ مضامین بھی اپنے اشعار میں بہت کم باندھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ داغ کے اکثر اشعار لذت انگیز تو ہوتے ہیں۔ مگر احساسِ لطیف کو نہیں ابھارتے۔ ان کا کلام ذہن کو متاثر نہیں کرتا۔ اور نہ قاری کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

ڈرامائی مکالمہ

داغ اپنے اشعار میں معشوق سے دوبدو گفتگو کرتے ہیں۔ ان کا محبوب ایک زندہ حقیقت ہے۔ جو ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے موجود رہتا ہے وہ ایک جسم ہے۔ جس کا کوئی رُخ اور جس کی کوئی خصلت ان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ اسی جسم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ عاشق اور معشوق میں "من و تو" کا رشتہ ہے۔ البتہ دونوں کا مقام بدلتا رہتا ہے۔ کبھی عاشق کلام کرتا ہے۔ اور معشوق سنتا اور جواب دیتا ہے۔ کبھی معشوق کلام کرتا ہے۔ اور عاشق کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ "من و تو" کے اس رشتے کی خوبی یہ ہے کہ دونوں اپنی شخصیت کو ایک دوسرے کے روبرو منکشف کرتے ہیں۔ عاشق کو کسی وسیلے اور ذریعے کی حاجت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کو اپنے محبوب کا علم براہِ راست ہوتا ہے۔ اس طرح کے براہِ راست علم کی نوعیت جذباتی اور حسی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس "من و او" کے رشتے میں محبوب کا تاثر بالواسطہ ہوتا ہے۔ اس رشتے میں "من" فعال شخصیت نہیں رہ جاتا۔ بلکہ فعال شخصیت "او" کی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ "من" کا ذہن "او" کے تصور کو قبول کرتا ہے۔ اس کے علاوہ "او" کوئی خود مختار فرد بھی نہیں۔ بلکہ "کل" کا جزو ہے۔ اور کل کے ہمہ گیر قانون کے تابع اس کے برعکس "تو" ایک خود مختار فرد ہے۔ جس کے مزاج اور کردار کے بارے میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی ہے۔

لہجے کی شاعری

داغؔ کے کلام میں "من و تو" کا یہ رشتہ مکالمے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مکالمہ ان کا خاص فن ہے۔ اور وہ اس فن کے اتنے بڑے ماہر ہیں کہ اُردو کا کوئی شاعر مکالمے میں ان پر سبقت نہیں لے جا سکتا۔ وہ اس گفتگو میں بڑا لطف لیتے ہیں۔ بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ گفتگو کرتے وقت آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور لہجے میں جو تبدیلی آتی ہے۔ داغؔ وہی اتار چڑھاؤ اور لہجے کی تبدیلی اپنے اشعار میں بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں لہجے کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔ کہ ان کے اشعار کو اگر گفتگو کے انداز میں نہ پڑھا جائے۔ اور لہجے کو ضرورت کے مطابق نہ بدلا جائے تو شعر کا مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے کیونکہ بسا اوقات لہجے ہی سے ان کے کلام کے معنی متعین ہوتے ہیں۔

کیا کہا پھر تو کہو "ہم نہیں سنتے تیری"
نہیں سنتے تو ہم ایسوں کو سناتے بھی نہیں

ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گزاری تمہیں نے رات
تم نے ہی انتظار کیا ہم نے کیا کیا

دیکھا نہ اس قدر کسی معشوق کا غرور
اللہ کیا دماغ ہے "اللہ کیا مزاج"

غیر سے ملتے ہو چھپ کر یہ کھلا ہے ہم پر
واہ بس دیکھ لیا ہم نے تمہارا اخلاص

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں
مجھے یقین ہوا، مجھ کو اعتبار آیا

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا

میری التجا پر بگڑ کر وہ بولے
نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا

اب کے کچھ منہ سے نکالا تو تمہیں جانو گے
داغؔ پھر مجھ کو نہ کہنا جو بُرا پر نہ کہوں

داغؔ کا یہ لہجہ بڑا مردانہ ہے۔ وہ گڑگڑا کر حسن کی بھیک نہیں مانگتے۔ ان میں عاشقوں کی سی نیازمندی، سپردگی اور انکساری بھی نہیں ہے۔ وہ معشوق کو جلی کٹی سناتے ہیں۔ اس پر طنز کرتے ہیں۔ اسے طعنے دیتے ہیں کہ ان کے لہجے میں اب افسردگی اور اضمحلال کے بجائے شوخی اور تیکھا پن ہے۔ ان کے اشعار میں کسی مصیبت زدہ عاشق اور جفا پیشہ معشوق کی گفتگو نہیں ملتی۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا انیسویں صدی کا کوئی رئیس رقص و سرود کی محفل میں بیٹھا کسی طوائف سے چہلیں کر رہا ہے۔ داغؔ کی معشوقہ کا لہجہ بھی نرم نہیں ہے وہ بھی بڑی شوخ اور چنچل ہے۔ اور حاضر جوابی میں داغؔ کی ہمسر ہے۔ ایک سنتی ہے تو دس سناتی ہے کبھی کبھی تو یہ گفتگو متانت و سنجیدگی کی سطح سے گر کر بالکل ہی بازاری ہو جاتی ہے۔

داغ نواب تھے۔ انہیں اپنی خاندانی عظمت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ صاحبِ ثروت بھی تھے۔ چنانچہ ان سب عورتوں کی جو ان سے وابستہ ہوئیں باقاعدہ تنخواہیں مقرر تھیں۔ وہ داغ کی محبوبہ بھی تھیں۔ اور ملازم بھی۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے اظہارِ عشق میں ان کے اندازِ تکلم میں ایک خاص قسم کا احساسِ برتری پایا جاتا ہے۔ سپردگی، افتادگی، نیازمندی اور مسکینی ان کی فطرت نہیں ہے۔ بلکہ معشوق سے گفتگو کرتے وقت ان کا انداز بعض اوقات جارحانہ ہو جاتا ہے۔ شوخی، تعلی، طنز اور چھیڑ چھاڑ ان کے مزاج میں داخل ہیں۔ وہ عشق یوں کرتے ہیں گویا معشوق پر احسان کر رہے ہیں۔

دماغ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں
رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں

یہ کیا کہا کہ داغ ہے تو کس شمار میں
یکتا ہوں میں ہزار میں کیسا سو ہزار میں

دنیا میں وضعدار حسین اور بھی تو ہیں
معشوق اک تمہیں تو نہیں اور بھی تو ہیں

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد و دولت زیادہ

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا
دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

نہ کسی شخص کی عزت نہ کسی کی توقیر
عاشق آتے ہیں تمہارے کہ غلام آتے ہیں

نکل کر مرے گھر سے یہ جان لو گے
نہ ہوگا کسی گھر گذارا تمہارا

آخری شعر میں تو عاشق اپنی محبوبہ سے نہیں بلکہ آقا اپنی ملازمہ سے مخاطب معلوم ہوتا ہے۔

داغ کی زبان

یوں تو باتیں سبھی کرتے ہیں۔ مگر بھری محفل میں کسی تیز و طرار معشوقہ سے گفتگو کرتے وقت بڑے بڑے زبان دانوں کے بھی پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ اس

کے لئے بڑا سلیقہ، بڑی منجھی ہوئی طبیعت چاہیئے۔ اس ڈرامائی مکالمے میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو فطرتاً بذلہ سنج اور شوخ مزاج ہو۔ اور جو اپنی زبان اور اظہار بیان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ داغؔ میں یہ خوبیاں موجود تھیں۔ ان کی زبان قلعہ معلیٰ کی ٹکسالی زبان تھی۔ اور قینچی کی طرح چلتی تھی۔ وہ ان مکالموں کو اس روانی اور بے ساختگی سے شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ جیسے کسی سے سچ مچ باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی نظم پر گفتگو کا گمان ہوتا ہے۔

داغؔ مکالمے کے انداز میں بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اشعار عام طور سے بہت سادہ اور سلیس ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی پیچ نہیں ہوتا۔ البتہ وہ محاورے بڑی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے تو ان محاوروں کو یکجا کر کے محاوراتِ داغؔ کے نام سے ایک کتاب مرتب کر دی ہے۔ لیکن یہ محاورے خواہ مخواہ کی ٹھونس ٹھانس نہیں کرتے۔ بلکہ موزوں و برمحل ہوتے ہیں۔ اور شعر کے تاثر میں اضافہ کرتے ہیں۔

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم
راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

داغؔ غالباً "جو بولو وہی لکھو" کے اصول پر چلتے تھے۔ اور نظم اور نثر کی زبان کے فرق کو نہیں مانتے تھے۔ شاید اسی بنا پر وہ فارسی اور عربی کے نامانوس لفظوں کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں اسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

مگر دلّی کی بول چال کی زبان لکھنے کی دھن میں وہ بعض اوقات ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کر جاتے ہیں۔ جو اردو شاعری میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ضعف سے کچھ نظر نہیں آتا
کر رہی ہیں ڈگر ڈگر آنکھیں
آج ان کے بھید اس صورت سے ظاہر ہو گئے
غیر کا مذکور آیا شعر باہر ہو گئے

ہر عہد اور ہر دور کی نئی تخلیق میں فن کار کی شخصیت کی تھوڑی بہت جھلک ضرور مل جاتی ہے۔ مگر داغؔ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے اردو غزل میں روایت پرستی اتنی رچ گئی تھی۔ اور شاعروں نے اپنے ہیئت اور کیفیت کا ایک ایسا سانچہ گڑھ لیا تھا۔ کہ ان کی ساری انفرادیت اسی شکنجے میں کس گئی تھی۔ نہ ذاتی مشاہدہ تھا نہ ذاتی تجربہ۔ عاشقانہ اشعار کے لئے تجربہ عشق کی شرط نہ تھی۔ مدح سے پیشتر شراب چکھنا ضروری نہ تھا۔ تصوف اور معرفت کے بیان سے پہلے ان مقامات سے گذرنا لازمی نہ تھا۔ ٹکی بندھی اصطلاحیں تھیں۔ اور ٹکے بندھے مضامین۔ انہیں کو سو رنگ سے باندھنے کا شاعری تھا۔ سارا زورِ بیان، زبان اور اندازِ اظہار پر صرف ہوتا تھا۔ داغؔ نے گو شاعری کے اس روائتی سانچے کو توڑا نہیں۔ اور نہ اپنے لئے کوئی نیا سانچہ بنایا ہے۔ لیکن انہوں نے اس سانچے میں اپنے ذاتی احساس و جذبات اور انفرادی تجربوں کا خمیر ضرور بھرا ہے۔ اسی سبب سے ان کی شاعری ان کی آپ بیتی بن گئی ہے۔ اور ان کی انفرادیت جھلک اٹھی ہے۔ داغؔ کی

شاعری اور شخصیت میں بڑا گہرا ربط ہے۔ ان کے کردار اور کلام میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

ان کی مقبولیت کا راز بھی ان کی اسی انفرادیت میں پوشیدہ ہے۔ ان کے اشعار میں جو تازگی اور تنومندی ملتی ہے۔ وہ ان کے دور کے دوسرے شاعروں کے کلام میں کم نظر آتی ہے۔ ان کے لہجے کا تیکھا پن ان کی شوخی، چلبلا پن اور ظرافت، ان کا احساسِ برتری اور شاہانہ انداز، ان کا فلسفۂ راحت طلبی اور خوش باشی، ان کی شاہد بازی اور عاشق مزاجی، غرض ان کے کلام کی جملہ خصوصیات ان کی شخصیت کا پتہ دیتی ہیں۔ اور ان کے جذبات کا دلی عکس تجربہ اور تخلیق کی جو وحدت داغ کے اشعار میں ملتی ہے۔ وہ اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

داغ کے چند اشعار

بُتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں بستے ہیں　　　کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں بستے ہیں
خدا رکھے محبت نے کئے آباد گھر دونوں　　　میں اُن کے دل میں بستا ہوں وہ میرے دل میں بستے ہیں

ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے　　　پر تمہیں شرمسار کون کرے
آفتِ روزگار جب تم ہو　　　شکوۂ روزگار کون کرے

یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی　　　نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی خاموش　　　کہو وہ تذکرہ ناتمام کس کا تھا

عرضِ وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دلفریب　　　دل میں کچھ مسکرا دیا آنکھ میں کچھ ملال سا

پروفیسر نظیر صدیقی

یگانہ چنگیزی

یگانہ اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جن کا مجموعۂ کلام دردؔ اور غالبؔ کی طرح مختصر بھی ہے اور منتخب بھی۔ "گنجینہ" کی پہلی ہی غزل پڑھتے وقت یہ بات محسوس ہونے لگتی ہے کہ ولیؔ دکنی سے لے کر ناصر کاظمیؔ تک جتنے شعرا پیدا ہوئے ہیں ان میں یگانہؔ کی شخصیت، شاعری، آواز اور آہنگ سب سے الگ ہے۔ ان کے یہاں دوسروں کے اثرات اتنے نمایاں نہیں جتنی خود ان کی انفرادی خصوصیات۔ ان کے کلام کی ایک بڑی خوبی ہمواری ہے، جو ان کے SUSTAINED INSPIRATION کا ثبوت ہے۔ وہ ان شاعروں میں سے نہیں جن کے نام لینے سے ذہن چند اچھے اور مشہور اشعار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ ان شاعروں میں سے ہیں جن کا خیال آتے ہی کئی مکمل غزلوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ان میں سے ہر غزل کے کئی کئی شعر اور مصرعے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔

لیکن اردو شاعری میں یگانہ چنگیزی کی اہمیت ابھی تک عام طور پر تسلیم نہیں کی گئی۔ جدید غزل کے معماروں کی فہرست حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ سے آگے بڑھتی ہے تو عموماً فراقؔ پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بسا اوقات اس فہرست میں یگانہ چنگیزی کا نام نہیں ہوتا۔ اگرچہ یگانہؔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں شہرت پا چکے تھے پھر بھی "شعر الہند" کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی اور "جدید اردو شاعری" کے مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے زمانے میں کوئی یگانہ چنگیزی بھی تھا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" کی دونوں اشاعتوں میں یگانہ کو یک قلم نظر انداز کر دیا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مقالہ "جدید غزل" میں صرف ایک جگہ یگانہ کا نام لیا ہے۔ وہ بھی مجروحؔ سلطانپوری کو عبرت دلانے کی غرض سے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ نے "نگار" کے غزل نمبر میں غزل گو شعرا پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یگانہ کو غزلوں سے زیادہ رباعیات اور قطعات (؟) میں کامیاب قرار دیا تھا۔ فراقؔ گورکھپوری، احتشام حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ممتاز حسین نے اردو شاعری اور اردو غزل کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کے باوجود یگانہ کے بارے میں کچھ لکھنا نہ مناسب سمجھا نہ ضروری۔ حسن عسکری نے [illegible] نوجوان شاعر کو دادِ سخن دی ---- وہ شاعر جو پہلے فراقؔ کا چربہ اتارتا تھا اور اب یگانہؔ کی مضحکہ خیز نقالی میں مصروف ہے ---- لیکن یگانہ کبھی حسن عسکری سے خراجِ تحسین حاصل نہ کر سکے۔ اردو کے ممتاز نقادوں میں مجنوںؔ گورکھپوری واحد شخص ہیں جو یگانہ کی شاعرانہ اہمیت کے معترف اور مداح رہے ہیں۔ انہوں نے اردو کے تمام نقادوں کے برعکس یگانہ کو ان کی زندگی ہی میں پہچان لیا تھا۔ اور اس وقت تک یگانہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سب سے اہم تنقید انہی کی ہے۔ مجنوں کے علاوہ جن لوگوں نے یگانہؔ کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کا تعلق جدید ترین نسل سے ہے اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید ترین نسل اپنے ادبی بزرگوں سے جن باتوں میں اختلاف رکھتی ہے ان میں یگانہ کی شاعری بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یگانہ کی غالب شکنی اور خود پرستی نے ان کی شہرت اور شاعری کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اور "شاید لوگ جب یگانہ کی غالب شکنی کو بھول جائیں گے تو ان کے کلام کو زیادہ ہمدردی سے پڑھا جائے گا"۔ اس میں شک نہیں کہ یگانہ کی غالب شکنی اور خود پرستی نے ان کی ذات اور ان کی شاعری دونوں کو نامقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا لیکن ان کی نامقبولیت یا ان کی طرف عام بے اعتنائی [illegible] سبب محض ان کی غالب شکنی اور خود پرستی نہیں۔ یگانہ کے مقبولِ عام ہونے

میں جو چیزیں مانع رہی ہیں۔ ان میں ان کا رنگِ سخن بھی ہے۔ یگانہ کی بدولت اُردو قارئین اور ناقدین غزل کے ایک نئے مزاج سے متعارف ہو گئے لیکن آج تک اس سے مانوس نہ ہو سکے۔ غزل کے اس نئے مزاج سے مانوس ہونے کے لیے قارئین اور ناقدین دونوں کو شعری مذاق و میلان کی بعض تبدیلیوں سے گذرنا ہو گا۔ اور یہ کام کچھ اور وقت چاہتا ہے۔

یگانہ غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں وہ تغزل نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم اُردو والوں کو غزل بہت عزیز رہی ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ یگانہ انفعالی رومانیت کے شاعر نہیں۔ انفعالی رومانیت غزل کے مزاج کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اگرچہ یگانہ نہ تو پہلے شاعر ہیں اور نہ واحد شاعر جس نے اس انفعالی رومانیت کے خلاف بغاوت کی پھر بھی اس بغاوت کی جتنی قیمت یگانہ کو ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ اتنی دوسروں کو ادا نہ کرنی پڑی۔ دوسرے باغیوں میں غالب اور اقبال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غالب کی شاعری (غزلیں) انفعالی نہ ہونے کے باوجود جمال و جلال کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔ اسی طرح اس حقیقت کے باوجود کہ " اقبال نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے پر پہنچا دیا" (رشید احمد صدیقی) اقبال کی غزل شاعری میں دلبری اور قاہری کے اتصال کی بڑی اچھی مثال ہے۔ ان دونوں کے برعکس یگانہ کی غزل کا جلال جمال سے خالی ہے۔ اور اس کی ظاہری دلبری کی اداؤں سے ناآشنا۔ وہ نہ صرف تلخ و ترش تجربات کے شاعر ہیں بلکہ تیز و تند لہجے کے بھی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کی سادگی کے باوجود زبان میں سختی، بیان میں کرختگی اور لہجے میں خشونت پائی جاتی ہے۔ ان عناصر کے مجموعی اثر نے ان کی شاعری میں اکھڑپن کی فضا پیدا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اکھڑپن کی فضا اور تغزل میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

یگانہ کی شاعری کی طرف عوام و خواص کی بے اعتنائی کا ایک سبب غالباً اس میں تاثیر و ترنم کی کمی بھی ہے۔ ان کی ایک غزل ہے۔ ؎

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں کہ "یاس کی یہ غزل مشاعرے ہی سے ضرب المثل ہو کر مشہور ہو گئی تھی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نگار کے غزل نمبر میں اسی غزل کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ " ان اشعار سے سامعہ اور دماغ پر خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر گہرا نہیں ہوتا۔ فوراً مٹ جاتا ہے۔ ان شعروں میں وہ تاثیر نہیں جو دل کی گریباں گیر ہو جائے۔ ان میں وہ لہجہ نہیں جو ابدیت کی نشانی ہے جو میر، غالب اور مومن کے کلام میں موجود ہے" کلیم صاحب کی یہ رائے بالکل صحیح ہے۔ یگانہ کی شاعری میں خیال کی بلندی، فکر کی ندرت، مشاہدے کی گہرائی، الفاظ کے صحیح انتخاب، روزمرہ اور محاورات کے فن کارانہ استعمال، بندش کی چستی، ہندی الفاظ کے تخلیقی صرف، فارسی تراکیب کی معنی خیزی، تشبیہات کی تازگی اور تصرفات کی دلکشی کے باوجود کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے ——— جیسے ان کی شاعری میں شاعری کے سوا اور سبھی کچھ ہے ——— یہ التباس (ILLUSION) اگر صحیح ہے جب بھی یہ ان کی شاعری کی پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا۔ یگانہ کی شاعری کے خلاف ساری باتیں کہہ چکنے کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں یگانہ کی شاعری ایک نئے عنوان اور ایک امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حسن و حلاوت کی جو کمی ہے اس کی تلافی تنوع اور توانائی سے ہو جاتی ہے۔ وہ اُردو کے ان دو تین شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کو حکیمانہ ذہن اور فلسفیانہ مزاج عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری نہ تو محبت کا ماتم ہے، نہ زندگی کا مرثیہ۔ اس میں نہ تو واسوخت کی فضا پائی جاتی ہے نہ شہر آشوب کی۔ یگانہ کی شاعری زندگی سے اُلجھنے اور اسے سمجھنے کی پُرخلوص کوشش کا نتیجہ ہے۔

یگانہ چنگیزی یاس عظیم آبادی کے نام سے بھی مشہور ہیں لیکن یگانہ چنگیزی کے مقابلے میں یاس عظیم آبادی اتنا ہی مشہور و مقبول ہے جتنا غالب کے مقابلے میں اسد۔ مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں کہ " یاس عظیم آبادی کو میں نے نہ کبھی لکھنوی سمجھا اور نہ کبھی یگانہ تسلیم کیا اور ان کے چنگیزی انداز سے میں ہمیشہ افسوس کے ساتھ چڑھتا رہا" یگانہ چنگیزی کے الفاظ پر مجنوں صاحب یا کسی اور کا ذاتی ردِ عمل کچھ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ یگانہ چنگیزی کی شخصیت اور شاعری یا ان کی تخصیت اور

شاعری کی ساری خوبیاں اور خامیاں یگانہ چنگیزی ہی کے نام سے ظاہر ہوتی ہیں۔ انہیں لکھنوی ماننے میں کوئی جذباتی یا منطقی مجبوری حائل ہو تو انہیں عظیم آبادی کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ عظیم آباد سے انہیں ذاتی نسبت تھی لیکن ان کا تخلص یاس تو ان پر ایک تہمت ہے۔

یہاں یہ سوال دلچسپی سے خالی نہیں کہ آخر وہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے یگانہ کو اپنی شاعری کی ابتدا میں یاس تخلص رکھنے پر مجبور کیا۔ میرا خیال ہے کہ یاس تخلص رکھنے میں ان کے اس نظریۂ شعر کو بڑا دخل رہا ہوگا کہ "جن اشعار کی بنا حسرت و یاس پر ہے، وہ بہت پُراثر ہوتے ہیں۔ بھلائے نہیں بھولتے اور ہر شخص کو وقتِ خاص پر یاد آجاتے ہیں"۔ چنانچہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "نشترِ یاس" میں حسرت و یاس کے رسمی مضامین بہت ہیں۔ "نشترِ یاس" کی شاعری بالکل روایتی شاعری ہے۔ اس کا موضوع وہی دل کی حسرت، وہی ہجر یار کی کشش، وہی محبوب کی سنگدلی، وہی عاشق کی سخت جانی، وہی آہ و سوزاں، وہی اشکِ حزن، وہی داغِ جنون، وہی زندگی سے بیزاری، وہی موت کی تمنا ہے جو روایت زدہ شاعروں کے یہاں جدتِ ادا یا حسنِ بیان کے باوجود صداقت اور خلوص سے خالی نظر آتی ہے۔ "آیاتِ وجدانی" اور "گنجینہ" میں یگانہ نے ان تمام روایات کو ترک کرکے اپنی دنیا آپ پیدا کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یگانہ کی بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں یاس تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن وہ غزلیں ان کی شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتی ہیں جب وہ یاس سے یگانہ بن چکے تھے۔ اگر وہ یاس سے یگانہ نہ بن جاتے تو آج ہمیں ان کے وجود کی خبر بھی نہ ہوتی۔

یگانہ کو یاس کہنے سے انکار کرنے کے معنی یہ نہیں کہ یگانہ کی شاعری شکست و ناکامی، حزن و حسرت، مایوسی و محرومی اور افسردگی و الم ناکی کے تجربات سے یکسر خالی ہے۔ کوئی شخص ہزار حوصلہ مند اور رجائیت پسند ہو لیکن زندگی کی الم ناک حقیقتوں سے کہاں تک اور کہاں تک دامن بچا سکتا ہے۔ چنانچہ یگانہ کے یہاں بھی کہیں کہیں ایسے اشعار ملتے ہیں جو زندگی کے انفعالی لمحات کے دین ہیں۔ لیکن وہ اشعار ان کے انفرادی رنگ و آہنگ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان کی شاعری اور جو کچھ بھی ہو ان کی شکست کی آواز ہرگز نہیں ہے۔

یوں تو کہنے کو شاعری میں یگانہ نے تین کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ (۱) نشترِ یاس (۲) آیاتِ وجدانی (۳) گنجینہ۔ لیکن حقیقت میں ان کے نمائندہ مجموعے دو ہی ہیں۔ آیاتِ وجدانی اور گنجینہ۔ ان دونوں میں بیشتر کلام مشترک ہے۔ ساتھ ہی "نشترِ یاس" کی بھی بعض غزلیں شامل ہیں۔ گنجینہ میں یگانہ کی وہ رباعیاں بھی ہیں جو دوسرے مجموعوں میں نہیں۔ نشترِ یاس اپریل ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ آیاتِ وجدانی ۱۹۲۷ء میں۔ گنجینہ کی تاریخِ اشاعت درج نہیں لیکن قرینے سے ظاہر ہے کہ وہ آیاتِ وجدانی کے بعد کی ہے۔ نشترِ یاس میں یگانہ نے اپنے پسندیدہ اشعار پر صاد بنا دیئے تھے۔ یہ صاد قلم سے نہیں بنائے گئے بلکہ چھپے ہوئے ہیں۔ کسی پر ایک۔ کسی پر دو اور کسی پر تین۔ اس وقت میرے پیشِ نظر نشترِ یاس کا وہ نسخہ ہے جو یگانہ نے ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نذر کیا تھا۔ اس میں پہلی غزل کے بائیں حاشیے پر یگانہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت بھی موجود ہے:-

"اشعار پر صاد خود پسندی کی راہ سے نہیں بنائے گئے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ناظرین شاعر کے مذاقِ خاص کو ملحوظِ خاطر رکھ کر رائے قائم کریں۔ محض اپنے مذاق کے اعتبار سے دوسروں کے کلام کا محاکمہ کرنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ یاس"

"نشترِ یاس" کی جو غزلیں آیاتِ وجدانی اور گنجینہ میں شامل ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں جن پر "نشترِ یاس" میں ایک یا دو یا تین صاد بنائے گئے تھے۔ یہ تو وقت، مذاق و مزاج کی بہتر تبدیلی کا پتا دیتا ہے۔ مثلاً "نشترِ یاس" کے مندرجہ ذیل اشعار جن پر ایک یا ایک سے زیادہ صاد بنے ہوئے ہیں۔ آیاتِ وجدانی یا گنجینہ میں شامل نہیں کئے گئے:-

نیم جاں چھوڑا تری تلوار نے اچھا کیا ایڑیاں بسمل نے رگڑیں صبر کا جوہر کھلا
اب زخمِ جگر کاش بگڑ جائے تو اچھا خود چھیڑ دوں لیکن کوئی نشتر نہیں ملتا

سایۂ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر اٹھ چلو ورنہ وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
بتاؤ سیرِ صحرا کی کوئی تدبیر وحشی کو گریباں میں تو ہاتھ الجھا پھنسا ہے پاؤں دامن میں
اب چپ رہو جو دل پہ گذرنی تھی وہ گذری ایسا نہ ہو پھٹ جائے کہیں زخم جگر بھی

میرا خیال ہے کہ "نشترِ یاس" کے جو اشعار اور غزلیں "آیاتِ وجدانی" اور "گنجینہ" میں شامل نہیں ہیں انہیں یگانہ کا رد کردہ کلام سمجھنا چاہیئے۔ گویا یہ دونوں مجموعے ان کے منتخب کلام پر مشتمل ہیں۔ یہ اور بات کہ ان میں بھی ایسے اشعار ملیں جنہیں حذف کر دینا بہتر ہوتا۔ لیکن یہ بات تو ہر انتخاب کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

نشترِ یاس میں یگانہ نے اپنی شاعری کے متعلق اساتذۂ لکھنؤ (نواب انجم، اوج، جاوید، رشید، عارف، فصاحت) کی جو رائیں درج کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت انہیں صرف دو باتوں کی دھن تھی۔ ایک تو اپنے آپ کو اہلِ زبان منوانے کی، دوسرے اپنے آپ کو آتش کا ہم رنگ تسلیم کرانے کی۔ چنانچہ اساتذۂ لکھنؤ نے بھی ان کی جن خصوصیات پر سب سے زیادہ زور دیا، وہ یہی ہیں کہ یاس محاورات اردو پر پوری مہارت رکھتے ہیں اور "آتش کے رنگ کو" خوب فرماتے ہیں"۔ اس اعتبار سے "نشترِ یاس" کی شاعری یا تو استادانہ ہے یا مقلدانہ۔ اس مجموعے میں وہ شاعر سے زیادہ استاد معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی غزلوں میں استادانہ رنگ تو ہے لیکن شاعرانہ روح نہیں۔ اساتذہ کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہوتا اور اس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔

"نشترِ یاس" کے یاس عظیم آبادی اور "آیاتِ وجدانی" کے یگانہ لکھنوی میں جو نمایاں فرق ہے، وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ دونوں کتابیں مصنف کی ایک ہی تصویر کی حامل ہیں۔ لیکن "نشترِ یاس" میں جو تصویر ہے اس کے نیچے "خاکپائے آتش مرزا واجد حسین یاس لکھنوی" کے الفاظ درج ہیں اور "آیاتِ وجدانی" میں جو تصویر ہے۔ اس کے اوپر A MAN WHO KNOWS HIMSELF اور تصویر کے نیچے یہ شعر ـــ

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

اور اس شعر کے نیچے MIRZA YAS-YAGANA A LIVING MIND OF THE EAST کے الفاظ درج ہیں۔ ان فقروں سے یہ بات ظاہر ہے کہ جہاں "نشترِ یاس" کے یاس عظیم آبادی کو صرف خاکپائے آتش ہونے پر فخر تھا۔ وہاں "آیاتِ وجدانی" کے میرزا یگانہ کو خود شناسی پر ناز تھا اور وہ اپنے آپ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ پورے مشرق کا ایک عظیم دماغ تصور کرنے لگے تھے۔

یگانہ کے شعری مزاج کی تشکیل میں آتش کی شاعری سے ان کے غیر معمولی لگاؤ کو خاصا دخل ہے۔ اس لیے یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر اس بات پر غور کر لینا بے محل نہ ہوگا کہ یگانہ پر آتش کے اثرات کی نوعیت کیا ہے اور ان اثرات کی وسعت کتنی ہے۔

یگانہ آتش کے علاوہ میر اور ناسخ کے بھی بڑے معتقد تھے۔ لیکن ان پر سب سے نمایاں اثر آتش ہی کا ہے۔ آتش سے یگانہ کے متاثر ہونے میں دونوں کے درمیان بعض باتوں کے مشترک ہونے کو بڑا دخل تھا۔ مثلاً دونوں فعال ذہن کے مالک تھے۔ دونوں زندگی کی حرکت و حرارت کے بڑے قدر داں تھے۔ یگانہ کی شاعری میں للکار اور جھنکار، امنگ اور ترنگ، بیباکی اور بلند حوصلگی، سرخوشی اور جانبازی، نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی، خود داری اور خود آگاہی کا جو احساس پایا جاتا ہے وہ محض آتش کا اثر نہیں خود ان کی شخصیت کا اقتضا بھی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان خصوصیات کے معاملے میں یگانہ آتش کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ یگانہ آتش کے فکر و فن دونوں سے متاثر تھے۔ محمد حسین آزاد نے آتش کے بارے میں لکھا تھا "جو کلام اُن کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل

ہے۔ . . . . . . شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے شعر کہہ دیئے ہیں۔" محاورات کا استعمال اور بول چال کا انداز یگانہ کی بھی شاعری کے نمایاں پہلوؤں میں سے ہیں۔ انہوں نے آتش کے نہ صرف اندازِ نظر کو اپنایا تھا بلکہ ان سے فن کے رموز و نکات بھی سیکھے تھے۔

آتش اور یگانہ کے مزاج و کلام میں جو مشابہت ہے وہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ لیکن اس مشابہت پر زور دیتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ان دونوں کی شخصیت اور شاعری میں جو فرق ہے وہ بھی کچھ اہم نہیں۔ یگانہ آتش کے معتقد اور مقلد ہونے کے باوجود ایک منفرد رنگ کے مالک ہیں۔ فراق نے آتش کی شاعری کو اکڑ، بانکپن اور قلندری کے اعتبار سے بے مثال بتایا ہے۔ اور عبدالسلام ندوی نے ان کی سرمستی اور بیخودی کو ضرورت سے زیادہ سراہا ہے۔ یگانہ کے یہاں آتش کی سی سرکشی، اکڑ اور بانکپن تو ضرور ہے لیکن سرمستی، بیخودی اور قلندری ہرگز نہیں۔ آتش فی الحقیقت صوفی رہے ہوں یا نہیں ان کی شاعری میں تصوف شعری روایت اور تہذیبی قدر دونوں حیثیتوں سے جلوہ گر ہے۔ تصوف کے سارے مسائل اور مضامین ان کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن یگانہ کی شاعری میں تصوف برائے نام ہے۔ آتش کی شاعری میں مشاہدۂ حق کی گفتگو یعنی تصوف کے ساتھ ساتھ بادہ و ساغر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری قلندرانہ آن اور رندانہ شان دونوں کی ترجمان ہے۔ لیکن یگانہ کی شاعری شرابِ معرفت کی سرمستی اور شرابِ انگوری کے سرور دونوں سے خالی ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری اردو کی عشقیہ شاعری کا قابلِ قدر جزو ہے۔ یگانہ کے یہاں صحیح معنی میں عشقیہ شاعری ہے ہی نہیں۔ جہاں فکری بلندی کے اعتبار سے آتش یگانہ کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ وہاں جمالیاتی احساس کے اعتبار سے یگانہ آتش کو نہیں پہنچتے۔ یگانہ کی شاعری اپنا ایک خصوصی اثر رکھتی ہے لیکن اس میں وہ سوز و گداز نہیں جو آتش کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے راحت طلبی کو آتش کی شاعری کا مرکزی تصور قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان کی فضائے ذہنی میں سرور و سرخوشی کی کیفیت موجود تھی۔" یگانہ کی دنیا میں اگر درد و غم کی تاریکی نہیں تو سرور و سرخوشی کی روشنی بھی نہیں ہے۔ ان کے یہاں راحت طلبی کی بجائے سعی و کوشش کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انہیں راحت و مسرت کے تصورات سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی نشاطِ کار، لذتِ عمل اور ذوقِ تصادم سے ہے۔ ان اشعار سے آپ کیا نتیجہ اخذ کریں گے:-

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل — ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

مراد شمن خود اپنی موت کو نے تو نہیں مارا — کوئی مرد عمل جھوٹی خوشی پر شادماں کیوں ہو

"ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا — جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں کلیں پھولیں — مگر نازل کوئی فضلِ الٰہی ناگہاں کیوں ہو

ریاضت سے جو حاصل ہو وہی سچی مسرت ہے — میسر آ سکے صاحب تو ان داموں گراں کیوں ہو

مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ "اگر میر اور غالب بھی ان کی شاعری کی تشکیل میں شریک نہ ہوتے تو اکیلے آتش یاس کو نہیں بنا سکتے تھے۔" اس رائے کا آخری حصہ یقیناً صحیح ہے لیکن پہلا حصہ بحث طلب ہے۔ "آیاتِ وجدانی" کے مقدمے میں یگانہ کو اردو کے جن شاعروں کا خاص طور پر عقیدت مند ظاہر کیا گیا ہے۔ ان میں میر، غالب اور آتش کے علاوہ سودا، انیس اور اکبر بھی ہیں۔ یگانہ کے مزاج میں سودا کا طنطنہ اور ان کی شاعری میں سودا کی بلند آہنگی ضرور پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یگانہ کے یہاں یہ دونوں باتیں سودا کے اثر سے پیدا ہوئیں۔ دراصل یگانہ اپنی ان خصوصیات کی بنا پر سودا کی طرف کھنچے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ہنری جیمز پر مضمون لکھتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ کسی ادیب سے متاثر ہونے کے معنی اس سے انفاق INSPIRATION لینے کے ہیں یا اس سے وہ کچھ لینے کے ہیں جو لینے والا لینا چاہتا ہے۔ یگانہ اگر سودا سے متاثر ہوئے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ انہوں نے اپنی شخصیت اور شاعری کے ان پہلوؤں کو چمکانے میں سودا سے مدد لی جو پہلے سے اُن کی شخصیت اور شاعری میں موجود تھے۔ یگانہ پر انیس کے اثر کو مجنوں نے محض تبرک قرار دیا ہے اور یہ صحیح ہے۔ جہاں تک اکبر کا

تعلق ہے اکبر اور یگانہ میں ایک ہی چیز مشترک نظر آتی ہے۔ طنز۔ سو اس میں بھی اکبر اور یگانہ کی طنز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اب آیئے میر و غالب کے اثرات کی طرف۔

مجنوں یگانہ پر میر و غالب کے اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یاس کے اشعار میں تفکر و تامل اور حکیمانہ ادراک کے جو نمایاں عناصر ہیں وہ غالب کی دین ہیں اور ان کے تیور اور ان کے لب و لہجے میں اس درد کا جو پُرگداز احساس ہے جس سے زندگی کا خمیر ہُوا ہے اور جس کے بغیر انسان کے نفس کی تہذیب نہیں ہو سکتی۔ وہ میر کی لائی ہوئی برکت ہے۔"

یگانہ کے تفکر و تامل اور حکیمانہ ادراک کو غالب کی دین پر محمول کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے اقبال کی فلسفیانہ شاعری کو غالب کا فیض قرار دینا۔ ظاہر ہے کہ اقبال فطرتاً فلسفیانہ مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے اور اگر اردو شاعری میں کوئی غالب نہ ہوتا جب بھی ان کی شاعری فلسفیانہ ہی ہوتی جیسا کہ خود غالب کی شاعری حکیمانہ تھی۔ باوجود اس کے کہ غالب سے پہلے اردو میں کوئی اور غالب نہ تھا۔ اگر کوئی شاعر فکر و تامل کی حکیمانہ صلاحیت لے کر پیدا نہ ہُوا ہو تو وہ غالب کا مداح و مقلد بن کر بھی اپنی شاعری میں حکیمانہ ادراک کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ وحشت کلکتوی کی شاعری اس دعوے کی بہترین دلیل ہے۔ یہاں میں یہ نہیں کہتا کہ یگانہ، غالب سے متاثر نہیں ہوئے۔ ہوئے اور ضرور ہوئے۔ ان دونوں میں کئی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ دونوں کے مزاج میں بلا کی انانیت اور خود پرستی تھی۔ مذہب اور معتقداتِ مذہب کی طرف دونوں کا رویہ کم و بیش یکساں تھا۔ شاعری میں دونوں قافیہ پیمائی کی بجائے معنی آفرینی کے قائل تھے۔ لیکن ان مماثلتوں کے باوجود یگانہ پر غالب کا اثر ویسا نہیں جیسا فانی بدایونی، اصغر گونڈوی اور وحشت کلکتوی کے یہاں نظر آتا ہے۔ یگانہ نے نہ تو غالب کے خیالات سے خوشہ چینی کی اور نہ ان کے اسلوب کو اپنایا۔ دیسے یگانہ کے دو چار شعر اس دعوے کی تردید میں ضرور مل جائیں گے۔ خصوصاً یگانہ کی فارسی ترکیبوں پر غالب کے اثر کا دھوکا ضرور ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یگانہ نے غالب کی متعدد زمینوں میں غزلیں کہنے کے باوجود غالب کے مضامین اور اندازِ بیان دونوں سے الگ رہنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب رہے۔ البتہ غالب یگانہ کی اندرونی صلاحیتوں کے لیے خارجی محرک ضرور تھے۔ غالب کی شاعری کو دیکھ کر انہیں بھی تحریک ہوئی کہ وہ اپنے ہر شعر کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیں۔ غالب کی طرح یگانہ کی شاعری بھی اپنے اندر معنوی نزاکتوں اور اسلوبی جدتوں کا بیش بہا سرمایہ رکھتی ہے۔ پھر بھی دونوں کا رنگ ایک دوسرے سے الگ ہے اور دونوں کا مرتبہ برابر نہیں۔

جہاں تک میر کا تعلق ہے یگانہ انہیں اردو کے ان تین شاعروں (باقی دو انیس اور آتش) میں سرِفہرست رکھتے تھے جن کے وہ سب سے زیادہ قائل تھے اور جن کو وہ اپنا امام تصور کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ذہنی اور فنی تربیت میں کلامِ میر کے مطالعے کو ضرور دخل رہا ہوگا۔ لیکن میر کی کوئی بنیادی صفت مثلاً دردمندی یا سوز و گداز یا مجنوں کے الفاظ میں" اس درد کا پُرگداز احساس جس سے زندگی کا خمیر ہُوا ہے اور جس کے بغیر انسان کے نفس کی تہذیب نہیں ہو سکتی"، یگانہ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ نہ الفاظ میں۔ نہ آہنگ میں۔ نہ لب و لہجہ میں۔ یگانہ پر خواہ مخواہ میر کا اثر ثابت کرنے سے نہ تو میر کو فائدہ پہنچتا ہے نہ یگانہ کو۔

یگانہ شاد عظیم آبادی کے ہم وطن بھی تھے اور ان کے شاگرد بھی۔ اگرچہ انہوں نے اپنے روحانی معلموں اور ذہنی معماروں میں شاد کا نام کہیں نہیں لیا۔ پھر بھی مجھے یگانہ اور شاد کی شاعری میں ایک مماثلت ایسی نظر آتی ہے۔ جس کی بنا پر خیال ہوتا ہے کہ وہ کسی حد تک شاد سے بھی متاثر تھے۔ شاد کی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو نہ صرف اپنے طنطنے، تیور اور تلخی کے اعتبار سے بلکہ زبان و بیان اور لب و لہجہ کے اعتبار سے بھی یگانہ کی شاعری سے مشابہ ہے۔ شاد کے یہ اشعار اور اس قسم کے اشعار یقیناً یگانہ پر اثر انداز ہوئے ہوں گے جبھی تو شاد کے ان اشعار اور یگانہ کی آواز میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا ہے۔

جو بن پڑے تو اُسی در پہ جاکے مر دیکھو　کچھ اس میں ہرج نہیں آؤ یہ بھی کر دیکھو
دنیا کو چھینکتے ہیں عبث اہلِ فن پڑے　اس بلیسوا کو ترک نہ کر دیں جو بن پڑے
ہنسیں گے توبۂ زاہد کبھی پہ سب میخوار　اگر بہشت میں صورت حرام تو نہ گئی
کوئی اے شکوہ پوچھے یا نہ پوچھے اس سے کیا مطلب　خود اپنی قدر کرنی چاہیئے صاحب کمالوں کو
خود اپنے بس میں رہے یا تڑپ کے مر جائے　جہاں میں اپنی سی انسان کچھ تو کر جائے
خیالِ سود و زیاں کی اکھاڑ دی بنیاد　بڑے پہاڑ کو رستے سے میں نے ٹال دیا

یگانہ کی شاعری بھرپور آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے لہجے میں وہ دھیما پن نہیں، جو خود کلامی کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ وہ بلند آہنگی ہے جو دوسروں سے ہم کلامی کے لیے ضروری ہے۔ ان کا جھگڑا اپنے آپ سے اتنا نہ تھا، جتنا دنیا سے۔ دنیا ان کے ساتھ اسی طرح پیش آئی جس طرح وہ عموماً اہلِ ہنر کے ساتھ پیش آتی ہے۔ یگانہ کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ یہی تھا کہ دنیا نے ان کے ساتھ وہ سلوک نہ کیا جس کے وہ مستحق بھی تھے اور متوقع بھی۔ وہ دنیا والوں سے اپنے کمال اور کارنامے کا اعتراف و احترام چاہتے تھے۔ لیکن ان کی تقدیر میں انکار و اعتراض کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تعصب اور حسد کی ساری قوتیں ان کے خلاف صف آرا تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اپنی جگر کاریوں کے صلے میں تعریف و تحسین کی بجائے قدم قدم پر تضحیک و توہین کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں جیل خانے بھجوانے کی کوشش کی گئی۔ ان کے ذریعۂ معاش پر حملہ کیا گیا جو کامیاب رہا۔ ان کے والدین کو منظوم گالیاں دی گئیں۔ ان کے قدر دانوں پر آوازے کسے گئے۔ مہذب محفلوں میں ان کے سامنے ان کی ہجو پڑھی گئی۔ اور بقول راوی پڑھنے والے نے کڑک کڑک کے ہجو پڑھی اور سننے والوں نے لہک لہک کے داد دی۔ مشاعروں میں ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ یہ سب کچھ لکھنؤ میں ہوا جو تہذیب و شائستگی کا مرکز رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یگانہ کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی گئی وہ تاریخِ ادب کا کوئی پہلا اور آخری واقعہ نہیں ہے۔ مثال کے لیے دور کیوں جایئے خود غالب جیسے باکمال کے معاملے میں زمانے نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی۔ مشہور ہے کہ ان کے نام گمنام خط میں کسی نے گالیاں لکھ بھیجیں۔ جس پر انہوں نے ہنس کر کہا کہ بدتمیزوں کو گالیاں تک دینے کا سلیقہ نہیں۔ لڑکوں کو ماں کی گالی دیتے ہیں۔ وہ اس وجہ سے کہ لڑکوں کو ماں سب سے پیاری ہوتی ہے، جوانوں کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ انہیں بیوی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بڈھوں کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں بیٹی بہت عزیز ہوتی ہے۔ مگر کمبختوں نے اس بڈھے کو ماں کی گالی کیا سمجھ کر دی جس کی ہڈیاں تک خاک ہو چکی ہوں گی۔" دنیا کی دشنام طرازیوں کو ہنسی میں اڑا دینے اور زندگی کی ناخوشگواریوں کو کشادہ روئی کے ساتھ سہہ جانے کے لیے جس قدر صبر و تحمل اور جس مزاحی حس کی ضرورت تھی وہ غالب کی ذات میں تو موجود تھی لیکن یگانہ اس سے بہرہ مند نہ تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ غم و غصے کی تلخی نہ صرف ان کے کام و دہن تک پہنچی بلکہ رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یگانہ کا کلام پڑھتے وقت سب سے پہلے جو بات محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کے منہ کا مزہ بگڑا ہوا تھا۔ خود بقول یگانہ ع غم کھاتے کھاتے منہ کا مزہ تک بگڑ گیا۔ ان کی شاعری کے محرکات میں مزاج اور ماحول کے تصادم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس تصادم کی طرف ان کا رویہ صبر و ضبط کا نہیں بلکہ احتجاج اور انتقام کا ہے۔ غالب نے زندگی کی ناہمواریوں کو اپنے احساسِ مزاح کی مدد سے ہموار کر لیا تھا۔ یگانہ نے زندگی کے پست و بلند کو اپنی ٹھوکروں سے برابر کرنے کی کوشش کی۔ اگر ان کا ماحول ان کے لیے چیلنج تھا۔ تو وہ بھی اپنے ماحول کے لیے چیلنج تھے۔ ان کی افتادِ طبع ہی ایسی تھی کہ وہ زمانے کی بدعنوانی اور بدسلوکی کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ ؎

علاجِ اہلِ حسد زہر خندِ مردانہ　ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو جلاتا جا
جھلائے پنجۂ مژگاں خوار پہ جو بس نہ چلے　تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا

یگانہ میر وہی ہے جو پہلے مار چلے — جو ٹھن گئی ہے تو اب تابِ انتظار نہیں

میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند — ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے — زمانہ کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

یگانہ کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے جو زمانے کے ہاتھوں پس جانے کے باوجود اس سے شکست نہیں کھاتا ؂

چت بھی اپنی ہے، پٹ بھی اپنی ہے
ہیں کہاں ہار ماننے والا

اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زمانے کی سختیوں اور زندگی کی تلخیوں کے باوجود زندگی سے نفرت اور موت سے رغبت نہیں پائی جاتی۔ وہ اپنے آپ کو حیات و کائنات سے اس طرح مانوس تو نہیں ہو پاتے جیسی طرح فراق لیکن اتنا ضرور ہے کہ دنیا اپنی ساری خرابیوں کے باوجود انہیں دلکش معلوم ہوتی ہے ——— اتنی دلکش کہ اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ؂

دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں — واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں

غضب کی دھوم شبستانِ روزگار میں ہے — کشش بلا کی تماشائے ناگوار میں ہے

دوسرے شعر کا دوسرا مصرع یگانہ کی حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری دونوں کا ثبوت ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو دنیا کو یا تو صرف جنت سمجھتے ہیں یا صرف جہنم۔ یگانہ کی نظر دونوں پہلوؤں پر ہے۔ اگر ایک طرف دنیا کے متعلق ان کا مشاہدہ یہ ہے کہ ؂

جس باگ پہ چاہے موڑتی ہے دنیا
کستی ہے، کبھی جھنجھوڑتی ہے دنیا
پائے ہمت کو توڑتی ہے دنیا
نامرد بنا کے چھوڑتی ہے دنیا

تو دوسری طرف دنیا کے متعلق ان کا تاثر یہ بھی ہے ؂

واللہ یہ دنیا بھی عجب دنیا ہے
ہر رنگ میں وہ کشش کہ دل کھنچتا ہے
منہ بولتی جیتی جاگتی تصویریں
اعجازِ ہنر ہے یا کوئی دھوکا ہے

یگانہ مردم گزیدہ ضرور تھے لیکن مردم بیزار ہرگز نہیں۔ وہ اگرچہ ترقی پسندوں کی طرح عوام کے پرستار تو نہ تھے لیکن ان کے دل میں عام انسانی محبت اس حد تک ضرور تھی کہ ایسا عرفانی شعر کہہ سکے ؂

صد رفیق و صد ہمدم پُر شکستہ و دلِ تنگ
داورا نمی زیبد بال و پر من تنہا

اسی انسان دوستی نے انہیں ایک ایسے انسانی المیے کا بھی احساس دلایا جسے انسان کے عظیم ترین المیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ؂

افساری ثبوت، پھولے تو لاکھوں
پھلتے نہ دیکھے سارے کے سارے

یگانہ کی شاعری میں مزاج اور ماحول کی جو باہمی آویزش پائی جاتی ہے۔ اسے ان کی زندگی اور شاعری دونوں کا افسوسناک پہلو کہا جاسکتا ہے۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ شاعری میں بسا اوقات انہوں نے اپنی ذات اور اپنے حالات سے اوپر اٹھنے کی کوشش کی اور ان کی یہ کوشش رائیگاں نہ گئی۔ ان کی شاعری صرف ذاتی اور ہنگامی حالات و حوادث کی طرف ردِ عمل کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ زندگی کے ازلی اور آفاقی مسائل کے متعلق ان کے غور و فکر کو بھی پیش کرتی ہے۔ یہاں اس بات کا اعتراف کر لینا ضروری ہے کہ یگانہ کی شاعری میں معاصرانہ مسائل اور موڈ کا عکس تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن انسانی زندگی کی اندرونی پیچیدگیوں اور انسانی فطرت کی تہہ نشین خصوصیتوں کے مطالعے میں انہوں نے جس دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے اس کے اعتبار سے ان کی شاعری اردو کی بلندترین فکری شاعری کا قابلِ قدر حصہ معلوم ہوتی ہے۔ کچھ اشعار سنئے :-

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
اندر ہی اندر کیوں کھپے رہتے ہو — کر بیٹھے کوئی ناکردنی کیا
وہی ساقی وہی ساغر وہی شیشہ وہی بادہ — مگر لازم نہیں ہر ایک پہ یکساں اثر ہونا
امیدِ صلح کیا ہو کسی حق پرست سے — پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو
رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال — طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے
قدم ہیں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے — گردشِ تقدیر سے جولانیٔ تدبیر نے
شیطان کا شیطان، فرشتے کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
مسلم کیا علم کی حقیقت کیا — جیسی جس کے گمان میں آئی
مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی — فریب کھاؤ گے پھر بھی، فریب دیدہ سہی
کھیلئے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی — لیجئے تو مہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے
غمِ بیداریٔ موہوم کے دھوکے میں کٹی — اب جو چونکے ہیں تو اپنا ہی گلہ کرتے ہیں
خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے — دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار
نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا — اپنی ہر سانس پہ رہ رہ کے پشیماں ہونا
ارے وہ صلح ہوئی تو کیا وہی آگ دل میں بھری رہی — وہی خو رہی، وہی بو رہی، وہی فطرتِ بشری رہی
تن میں اور دل کے تری ذات سراپا احسان — وائے قسمت کہ مری ضد سے تو عادل ہو جائے

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔ زندگی کے کتنے ہی پہلو اور مسائل یگانہ کی توجہ کا مرکز رہے ہیں لیکن دو تین مسئلے ایسے بھی ہیں جو تکرار و تسلسل

کے ساتھ ان کی شاعری میں اُبھرتے ہیں یا جن کی طرف وہ بار بار لوٹتے نظر آتے ہیں۔ خدا کا وجود، مذہب کی افادیت اور انسان کی مجبوری یہ وہ مسائل ہیں جو یگانہ کی روح پر مستقل بوجھ بن گئے تھے۔ سچ پوچھئے تو یہ مسائل ہر ذہین اور حساس آدمی کی روح کا بوجھ ہیں۔ آدمی ان مسائل کے بارے میں یا تو الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ یا ایسے نتائج تک پہنچتا ہے جن کے اظہار میں سنگسار ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ ولیوں اور صوفیوں کا کہنا ہے کہ بہت سے اسرار عوام پر ظاہر نہیں کئے جا سکتے۔ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں ایک جگہ مسئلہ جبر کو اُن ہی اسرار میں شمار کیا ہے۔ جو عوام پر ظاہر نہیں کئے جا سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسئلہ جبر کے معاملے میں انسان کو چاہیے مجبور سمجھو یا مختار دونوں نظریئے انسان کے لیے گمراہ کن ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ محی الدین ابن العربی جیسے صوفی اور مفکر نے شریعتِ اسلامی کو دروغِ مصلحت آمیز کہہ دیا تھا۔ ایک دن علامہ اقبال اس بات پر ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم سے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ دیکھو بعض صوفیہ شریعت کے بارے میں کس قدر گستاخانہ کلمے استعمال کر جاتے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ جب شیخ اکبر نے شریعت کو دروغ مصلحت آمیز کہا تھا تو وہ شریعت کی شان میں گستاخی نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک ایسے احساس کا اظہار کر رہے تھے جس نے ان کے دل کی گہرائیوں میں پرورش پائی تھی۔ یہاں میں احساس کی جگہ حقیقت کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کر رہا ہوں کہ حقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ تو خود صوفیوں کو بھی نہیں ہے۔ خدا اور مذہب کے بارے میں آج تک جو کچھ سوچا اور کہا گیا ہے اس کی حیثیت خواب ندیدہ کی تعبیر سے زیادہ نہیں ع خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند لیکن انسان حقیقت تک پہنچ سکے یا نہیں۔ وہ پہنچنے کی کوشش سے باز نہیں آ سکتا۔ یہی کوشش ذہین اور حساس آدمیوں کی زندگی میں اس کشمکش کو جنم دیتی ہے جسے وراثتی عقیدے اور ذاتی عقیدے کی کشمکش کہہ سکتے ہیں۔ یگانہ کی شاعری میں اس کشمکش کا جتنا جرات مندانہ اور بے باکانہ اظہار ملتا ہے۔ اتنا مجھے اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ اس باب میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ایسے ہیں کہ ان پر ع بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت والا مصرع صادق آتا ہے۔ ان کی شاعری ان کے عقیدوں کے بارے میں جو غمازی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا ذہن تشکیک سے خالی نہ تھا۔ یہ تشکیک انہیں کبھی لاادریت کی طرف لے جاتی تھی۔ اور کبھی الحاد کی طرف۔ کبھی انہیں محسوس ہوتا تھا کہ انسان خدا کو نہ جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے اور کبھی انہیں یہ خیال آتا تھا کہ خدا کا تصور انسان کی تخلیق کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ انسان نے دراصل اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے خدا کا تصور تراش رکھا ہے۔ ان کا متشکک ذہن خدا کے وجود کا قائل ہو بھی جاتا تو یہ سوچے بغیر نہ رہتا کہ جہاں تک نظامِ عالم کا تعلق ہے۔ خدا کی ہستی ایک غیر مرئی اور غیر مؤثر قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کائنات میں شر کی ہنگامہ آرائیوں کو مشیتِ ایزدی اور مصلحتِ خداوندی سے تعبیر کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شر میں خیر دیکھنا بصیرت نہیں حماقت ہے۔ وہ خدا کی طرح مذہب کے وجود کو بھی بے سود تصور کرتے تھے بلکہ اس لحاظ سے مضر بھی کہ مذہب بین الاقوامی امن و امان اور صلح و آشتی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آدمی پر دنیوی فرائض ہی کا بوجھ کم نہیں کہ اس پر مذہب کی طرف سے عبادت و ریاضت کا بوجھ بھی لاد دیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی مذہب کے پیغمبر اور ایک اہلِ نظر میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی رتبے کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح گنگا اور زمزم کے پانی میں بھی کوئی فرق نہیں۔ آبِ زمزم کو جو تقدس یا تطہیری حیثیت حاصل ہے اس کی بنیاد محض عقیدت یا عقیدے پر ہے۔ ان خیالات و تصورات سے متعلق یگانہ کے کچھ اشعار دیکھتے چلئے ؎

ایک جھلک ہی دکھلا دے تو دور سے جھک کے سلام کروں اُس پار جگت کے ہوگا کوئی اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں

حسنِ بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے کان بھی ہیں نامحرم، آنکھ بھی ترستی ہے

قیامت تک یہ کالے کوس روشن ہو نہیں سکتے عبث ہے ہر کتابِ کافر و دیں دار ہو جانا

کون جانے نالۂ حق کیا ہے کس خدا کی زبان میں آئی

وہ کیوں سر کھپائے تری جستجو میں   جو انجامِ فکرِ رسا جانتا ہے

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے   کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر   تو بندگانِ ضرورت کا آفریدہ سہی

ایسے ہنگامہ نا دستی میں   ایک اللہ کا نام کیا کرتا

آندھیاں رکیں کیونکر زلزلے تھمیں کیونکر   کارگاہِ فطرت میں یا سمائی رب کیا

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا   خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

صلح ٹھہری تو ہے برہمن سے   کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ

برائی میں بھلائی دیکھتا جاؤں مگر کب تک   یہ کیسی دولتِ عرفاں کہ نازل ہوتی جاتی ہے

دنیا کے ساتھ دین کی بیگار الاماں   انسان آدمی نہ ہوا جانور ہوا

ہم پیمبر نہیں یگانہ سہی   اس سے کیا کسر شان میں آئی

نہا لیتے گنگا بکھیڑا تھا پاک   گناہوں کو زمزم سے دھویا تو کیا

میں یگانہ کو متشکک ملحد یا لاادریہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ شاید اس معاملے میں وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا ذہن تشکیک، الحاد اور لاادریت ان تینوں عناصر کی رزمگاہ بن گیا تھا لیکن انہوں نے جبر و قدر کے مسئلے میں انسان کے مجبور ہونے پر اپنے عقیدے کو جس طرح ظاہر کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں خدا کے وجود پر ان کا ایمان پوشیدہ تھا۔ فلسفۂ جبر کا قائل ہونے کے لیے خدا کا قائل ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ ملحد ہونے کے باوجود انسان کو مجبور مانتے ہیں وہ انسان کو خدا کی مشیت کا تابع نہیں بلکہ ماحول کے مؤثرات کا تابع سمجھتے ہیں۔ یگانہ نے ایک شعر میں موخر الذکر نقطۂ نظر کا بھی اظہار کیا ہے ؎

خاک کا پتلا ہے رفتارِ نمو سے مجبور
ہمہ تن سنگ بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے

یعنی انسان اپنی رفتارِ نمو یا اپنی نشو و نما پر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ نیک یا بد بننے میں اس کی آرزو یا ارادے کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی ساری نشو و نما ماحول پر منحصر ہے۔ ماحول چاہے تو اسے پتھر کی طرح سخت یا دل کی طرح نرم بنا دے۔ لیکن عام طور پر یگانہ ماحول کی بجائے خدا کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ خدا کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے اس کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسا شاعر جو تشکیک، الحاد اور لاادریت تینوں کا شکار رہا ہو۔ اس کا فلسفۂ جبر کے معاملے میں خدا کے وجود کو تسلیم کر لینا فکری تضاد کا کھلا ہوا ثبوت ہے اور یہ تضاد اس وقت اور بھی حیرت انگیز بن جاتا ہے۔ جب یگانہ کی شاعری عزم و عمل اور جدوجہد کا درس دینے کے باوجود انسان کی وہ تصویر پیش کرتی ہے۔ جس میں وہ مجبورِ محض نظر آتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یگانہ اپنے ذہنی تضادات کو حل نہ کر سکے۔ شاید وہ انہیں محسوس بھی نہ کر سکے۔ بہر حال یہ دیکھئے کہ فلسفۂ جبر کے بیان میں ان کی فکر نے کسی تازہ کاریوں سے کام لیا ہے ؎

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا   پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

دے کچھ تو داد طبعِ ندامت شعار کو   کیا دیکھتا ہے لغزشِ بے اختیار کو

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر — سمجھاؤں کیا ضمیرِ ملامت شعار کو
اللہ رے اختیار کہ آمادہ کر لیا — فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو
انوکھا گنہگار یہ سادہ دل انسان — نوشتے کو اپنا کیا جانتا ہے

بندۂ فطرت مجبور ہوں مختار نہیں — ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں
ارادے سے عمل تک کچھ تو اپنا دسترس ہوتا — بغل میں پالتے کیوں پاس دل سے دشمنِ جاں کو
جان دے کر ایک حکمِ آخری مانا تو کیا — لکھ دیا جب سرکشوں میں کاتبِ تقدیر نے
اپنی ضد اپنی مشیت پہ جو آجائے کوئی — پاس سب حسنِ عمل دفترِ باطل ہو جائے
صلح جوئی نے گنہگار مجھے ٹھہرایا — جرم ثابت جو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے

غزل کی شاعری بڑی حد تک عشقیہ شاعری کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یگانہ کے یہاں صحیح معنی میں عشقیہ ہے ہی نہیں۔ غالب کے ایک ذہین نقاد آفتاب احمد نے ان کی عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ غالب نے کامیاب عشقیہ شاعری تو ضرور کی ہے لیکن اپنی انانیت، خود پسندی اور خود پرستی کے باعث وہ بلند پایہ عشقیہ شاعری نہ کر سکے۔ یگانہ کی انانیت، خود پسندی اور خود پرستی غالب سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ رہا کہ بلند پایہ عشقیہ تو ایک طرف وہ کامیاب عشقیہ شاعری بھی نہ کر سکے۔ یگانہ کا ایک شعر ہے ؎

مجھ سے معنی شناس پر ہا دو
حسن صورت حرام کیا کرتا

اس شعر کے محض شیخی ہونے میں کیا شبہ جبکہ اقبال جیسا معنی شناس یہ کہہ رہا ہو کہ ؎

حسن کی تاثیر پہ غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

ممکن ہے حسن کو صورت حرام کہنے میں عشقِ ناکام کی تلخیوں کو دخل ہو۔ خود ان کا یہ شعر اس قیاس کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ ؎

محبت کا مزہ بگڑا کہ نیت بھر گئی اپنی
طبیعت جانے کیوں تلخی پہ مائل ہوتی جاتی ہے

یگانہ کے یہاں حسن و عشق سے متعلق جو اشعار ملتے ہیں وہ ان کی نیت کے بھر جانے سے زیادہ محبت کے مزے کے بگڑنے کا پتا دیتے۔ اگر کسی کی شاعری سے اس کی زندگی کے واقعات کا اندازہ لگانا غلط نہیں تو یگانہ کی شاعری یہ بھی بتاتی ہے کہ محبت میں ان کی مایوسی کا سبب محبوب کا حد سے بڑھا ہوا پندارِ حسن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یگانہ کا منتقمانہ مزاج حسن کی طرف بھی انتقامی رویہ اختیار کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ ؎

سراپا غرق ہو کر لذتِ ترکِ تماشا میں — دکھاؤں گا تماشا ایک دن حسنِ پشیماں کو
بتاؤں کیا تمہیں بازار کا آثار چڑھاؤ — بنا رہتا ہے گاہی بھاؤ دن ڈھلے کیونکر
نشۂ حسن کو اس طرح اترتے دیکھا — عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیماں ہو جائے

ان اشعار میں یگانہ حسن کے زوال پر مسرور نظر آتے ہیں اور اس رباعی میں اس زوال کے منتظر ؎

حسن اپنی نظر سے گر چلے گا کہ نہیں　　　ہاتھ اپنے زوال پر ملے گا کہ نہیں
دورِ فلک انتقام لے گا کہ نہیں　　　چڑھتا ہوا دن کبھی ڈھلے گا کہ نہیں

یگانہ کی داستانِ محبت بیان کرنا میرا مقصد نہیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ ان کے یہاں عشقیہ شاعری کے نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ انہوں نے کسی سے محبت ہی نہیں کی۔ محبت تو ضرور کی۔ مگر ناکام رہے۔ پھر ناکامی کے باوجود ان کے یہاں عشقیہ شاعری کیوں نہیں ملتی۔ اس کیوں کا جواب ان کی افتادِ طبیعت میں ملے گا۔ وہ آدمی ہی ایسے تھے کہ کسی کا حسن ان کو دیوانہ نہیں بنا سکتا تھا اور عشقیہ شاعری بغیر دیوانگی کے ممکن نہیں۔ یگانہ کے دل پر حسن کا جو اثر ہوتا تھا اسے انہوں نے وحشیانہ صاف گوئی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے ؎

صورت ہی ایسی پیاری دیکھو تو رال ٹپکے
فطرت کا اقتضا ہے بندے کی کیا خطا ہے

پیاری صورت کو دیکھ کر رال ٹپکنا فطرت کا اقتضا سہی لیکن یہ بڑا عام اور عامیانہ ردِعمل ہے۔ اس ردِعمل کے سہارے بڑی عشقیہ شاعری تو ایک طرف اچھی عشقیہ شاعری بھی ممکن نہیں۔ یگانہ کے نزدیک حسن کا زیادہ سے زیادہ مصرف یہ تھا کہ اسے دیکھ کر طبیعت ہری رہے تاکہ نئی نئی سوجھتی رہے ؎

کوئی چشمِ شوق کے سامنے ہو تو سوجھتی ہے نئی نئی
ترے دم قدم کی بہار تھی کہ طبیعت اپنی ہری رہی

طبیعت ہری رکھنے کے لیے حسن پر مرمٹنے کی ضرورت نہیں۔ اسے صرف دیکھ لینا کافی ہے۔ چنانچہ ان کا مشورہ بھی یہی ہے ؎

دُور سے دیکھو تو حسینوں کو
نہ بنانا کبھی گلے کا ہار

حسن کو گلے کا ہار بنانا اس لیے ٹھیک نہیں کہ ؎

عشق ہی عین زندگی تو نہیں
ہاں مگر زندگی کا آلۂ کار

یہ تو صحیح ہے کہ عشق عین زندگی نہیں، لیکن زندگی کے کسی دور میں عشق جب تک عین زندگی نہ بن جائے۔ وہ اس کا آلۂ کار بھی نہیں بن سکتا۔ عشق سے کچھ پانے کے لیے اس میں کچھ کھونا بھی تو شرط ہے۔ عشق سے متعلق یگانہ کے مشورے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ ان کے پاس عشق کے تجربے نہ تھے۔ میری مراد گہرے تجربوں سے ہے۔ انہوں نے دل کی کوئی گہری چوٹ نہ کھائی تھی۔ نہ کھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہیں محبت سے والہانہ لگاؤ تو ایک طرف جمالیاتی دلچسپی بھی کچھ یوں ہی سی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق سے متعلق ان کی شاعری مضمون بندی اور معنی آفرینی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بلند پایہ اور بڑی عشقیہ شاعری میں جذبات کی جو شدت، خود سپردگی، خود گزاشتگی، حسن کا والہانہ احترام اور شاعرانہ مشاہدہ، درد و غم کے شدید تجربے، دل کا اضطراب، روح کا کرب، نشاط و غم کے سائے، ناز و نیاز کی لطیف حکائتیں، محبت کی مختلف کیفیتوں کے اثر سے حیات و کائنات کی گھٹتی بڑھتی دلکشی، دل گرفتگی و دل کشائی، جنسی جذبات کی طغیانی کے باوجود جنسی جذبات کی تہذیب، روح کی جسمانیت اور جسم کی روحانیت کا تجربہ، جمالیاتی احساسات کی بیداری اور بالیدگی پائی جاتی ہے۔ وہ یگانہ کے یہاں نظر نہیں آتی۔ بلند پایہ اور بڑی عشقیہ شاعری کے نقطۂ نظر سے ان اشعار میں کیا رکھا ہے ؎

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو　　　دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے — خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا
لاش کمبخت کی کعبے میں کوئی پھکوا دے — کوچۂ یار میں کیوں ڈھیر ہو بیگانے کا
سرِ شوریدہ کجا عشق کی بیگار کجا — مگر اللہ دے دل آپ کے دیوانے کا
بس ایک سایۂ دیوارِ یار کیا کم ہے — اٹھا لے سر سے مرے سایہ آسماں اپنا
عشق کا حسنِ طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے — ہچکی بندھ جائے گی مطلب ادا ہو جائیگا
تو حسن کا ہے دیوتا میں عشق کا پیمبر — دیکھیں تو کون اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے
تو یہ بھی بھول گئے عشق میں وہ مار پڑی — ایسے اوسان گئے ہیں کہ خدا یاد نہیں

یگانہ کی شاعری اپنی بعض بڑی کوتاہیوں کے باوجود انفرادیت سے خالی نہیں۔ ان کی انفرادیت کے جہاں اور بہت سے پہلو ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے لیے ایک نئی زبان ایجاد کی۔ زبان کے اعتبار سے ان کے یہاں دو قسم کے شعر ملتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی قدر فارسیت آمیز ہیں جن کی سب سے بڑی خوبی نئی اور معنی خیز ترکیبوں کی تراش ہے۔ اگرچہ ان ترکیبوں میں وہ خوش آہنگی نہیں جو غالب، مومن، حسرت اور اقبال کی ترکیبوں میں پائی جاتی ہے لیکن ان میں عموماً وہ ثقالت اور بھدا پن بھی نہیں جس کی بنا پر غالب اور مومن کے کلام کا ایک حصہ ہمیشہ بدنام رہے گا۔ کچھ مثالیں دیکھئے ؎

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں — مسافر در وطن خانہ بدوشِ رہگزر ہو کر
زمانے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں — بسر کرتا ہے جن کو زندگی لوٹے رائیگاں ہو کر
دیدار تو دکھائے کہیں صبحِ منتظر — حاضر ہے سر بھی سجدۂ بے اختیار کو
یاد آئی آشیانۂ پُرخار کی خلش — دل ڈھونڈھتا ہے پھر اسی اجڑے دیار کو

یگانہ کے یہاں زبان کے اعتبار سے دوسری قسم کے شعر وہ ہیں جن کی زبان سادہ ہے مگر روزمرہ اور محاورات سے مزین۔ ویسے روزمرہ اور محاورات یگانہ کے ان اشعار میں بھی پائے جاتے ہیں جن میں فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو سادہ اور بامحاورہ ہے روزمرہ اور محاورے کے استعمال میں ذوق اور داغ سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن یگانہ کے یہاں روزمرہ اور محاورے کے استعمال کا طریقہ اور مقصد ذوق اور داغ سے مختلف ہے۔ انہوں نے محاورے کو صرف محاورے کی خاطر استعمال نہیں کیا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے یا کلام میں کچھ چاشنی یا چٹخارہ پیدا ہو جائے۔ انہوں نے محاورات کے استعمال کو اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار دیکھئے اور سوچئے کہ ان میں یگانہ کی شخصیت کے جو نقوش نظر آ رہے ہیں ان کے چمکانے میں محاورات کو کتنا دخل ہے ؎

برابر بیٹھنے والے بھی کتنے دور تھے دل سے — مرا ماتھا جبھی ٹھنکا فریبِ رنگِ محفل سے
ارادے نے عمل کی راہ پائی کتنی مشکل سے — الٰہی خیر لو ہے لگ گئے پہلی ہی منزل سے
دلِ طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے — بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے
پڑ چکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے — موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا
میں سمجھ لوں گا دوست سے تو کون — مجھے رہ رہ کے تاننے والا
جلایا الٰہی لیوں نے جبھی تو ناک میں دم ہے — ہم ایسے خاکساروں کو ستاؤ تو دھواں کیوں ہو

الٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی　　میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

یگانہ نے ایک نئی زبان کی تخلیق یا ایک نئی زبان کے تجربے میں جن چیزوں سے کام لیا ہے ان میں فارسی ترکیبوں اور اُردو محاوروں کے علاوہ روزمرہ اور ہندی الفاظ کا استعمال بھی ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں گفتگو کے ٹکڑوں اور ہندی کے ان لفظوں یا محاوروں کو جو اب تک غزل میں استعمال ہی نہیں ہوئے تھے۔ یا بہت کم استعمال ہوئے تھے۔ بڑی خوبصورتی سے کھپایا ہے۔ مثلاً ؎

کارِ مرگ کے دن کا، تھوڑی دیر کا جھگڑا　　دیکھنا ہے یہ ناداں جینے کا ہے کرتب کیا

رلا رلا کے غریبوں کو ہنس چکا کل تک　　مری طرف سے اب اپنی دسا پہ ہنستا جا

کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو　　جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا

عجیب بھول بھلیاں ہے منزلِ ہستی　　بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا

کون ٹھہرے سمے کے دھارے پہ　　کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

بول بالا رہے یگانہ کا　　نام باجے جگت کے چاروں دانگ

ہنستے ہنستے بنے تھے پریم جگت　　دل لگی بڑھتے بڑھتے لائی رنگ

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان اشعار کی زبان یگانہ کی ایجاد ہے اور صرف یگانہ کی ایجاد۔

زبان کی طرح یگانہ کا اندازِ بیان بھی دوسرے تمام شاعروں سے مختلف ہے۔ یہاں اس حقیقت پر زور دینا غالباً ضروری نہیں کہ اندازِ بیان صرف زبان کو ایک مخصوص طریقے سے استعمال کرنے کا نام نہیں۔ اس کی تعمیر میں شاعر کی پوری شخصیت کارفرما ہوتی ہے۔ اندازِ بیان شاعر کے اسلوبِ فکر، طرزِ احساس اور طریق کار تینوں سے عبارت ہوتا ہے۔ یگانہ نے "نشترِ یاس" کے دیباچے (ماہیتِ شاعری) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک ہی بات ہے کہ محض سیدھی سادی ترکیبوں سے ادا کر دی گئی اور مطلب سمجھ میں آگیا۔ مگر اسی بات کو کسی پاکیزہ محاورے، کسی خاص بانکپن، کسی نرالے انداز سے یوں بیان کر دیا اور کوئی ایسی آڑی کن لگا دی کہ دل بے چین ہو گئے۔ اسی کن دینے کو شاعری کہتے ہیں۔" اور اس کن دینے کی مثال کے طور پر اسی دیباچے میں دوسری جگہ انہوں نے آتش کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا

رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

اس شعر میں "طالعِ بیدار" کی ترکیب نے وہ کام کیا ہے جسے یگانہ آڑی کن لگانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ شاعری صرف آڑی کن لگانے کا نام ہے پھر بھی اس میں شک نہیں کہ شعر گوئی کے جہاں اور بے شمار اور بہ نام طریقے ہیں۔ وہاں ایک طریقہ یہ کن لگانا بھی ہے اور یہ طریقہ یگانہ کے اندازِ بیان کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے۔ کچھ مثالیں دیکھئے ؎

پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک　　حقیقت کھل نہ جائے اضطرابِ رازداں ہو کر

زمانے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں　　بسر کرنا ہے جن کو زندگی دوبھر رائیگاں ہو کر

نظر آئے گا کیا ظلمت کدے میں چشمِ حیراں کو　　اندھیرا کا اُجالا جانئے خوابِ پریشاں کو

وادیِ حشر کچھ نہ پوچھ دردِ شباب کا مزا　　شہدِ بہشت تھا مگر دستِ بخیل کا دیا

لحد سے بڑھ کے نہیں کوئی گوشۂ راحت　　قیامت آئی جو اس گھر سے میہماں نکلا

گرفتارانِ ساحل کو دبیرتے ڈر نکل جاتا کبھی تو زیست مشکل آزماتی مرگِ آساں کو

زندگی کی طرف یگانہ کا رویہ وہی تھا جو ایک طنز نگار کا ہوتا ہے۔ چنانچہ طنز ان کے اندازِ بیان کا بڑا نمایاں عنصر ہے۔ یگانہ کا طنز ہر جگہ لفظوں سے ظاہر ہو یا نہ ہو۔ لیکن شعر کے لب و لہجے سے ضرور مترشح ہوتا ہے۔ ان کی پوری شاعری میں طنز کی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ ان کا طنز حد درجہ تیز بھی ہے اور تمسخر آمیز بھی۔ یگانہ نے "ماہیتِ شاعری" میں معیارِ تغزل کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غزل کی بنا محض جذبات پر ہے۔ اور جذبات میں جذباتِ غم نسبتاً زیادہ مؤثر اور دلکش ہوتے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے اپنے خیال میں جذباتِ غم ہی کی شاعری کی ہو لیکن فی الحقیقت ان کی شاعری غم کی نہیں، غصے کی شاعری ہے۔ ان کے بیشتر اشعار غصے کے زہر میں بجھے ہوئے تیر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

الوکھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے حقیقت تھی جو کل تک آج باطل ہوتی جاتی ہے

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

ترکِ لذتِ دنیا کیجیے تو کس دل سے ذوقِ پارسائی کیا فیض تنگ دستی ہے

خدا کے سامنے دامن پسارنے والے وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے

حاصل نگر نارسا کیا ہے تو خدا بن گیا بڑا کیا ہے

بہالے گیا گھر بھی ابرِ کرم جو لو یا تو کیا اور نہ بویا تو کیا

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہو جائے گا

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

زبان و بیان کے معاملے میں یگانہ کے کلام کی بعض خامیاں اس کی خوبیوں کا کچھ کم واضح نہیں۔ ان کے یہاں مومن و غالب کی سی پیچیدہ بیانی تو نہیں ہے لیکن کہیں کہیں ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال ضرور ملتا ہے۔ جس میں غزل کی لطافت و نزاکت برداشت نہیں کر پاتی۔ مثلاً ؎

آنکھ جھک جاتی ہے خار و گل کو باہم دیکھ کر دیدنی و نا دیدنی دونوں کو توام دیکھ کر

یہ آب نشیں ہے اور یہ دریا خونِ ناحق کا گر نفسِ شقی کی پیاس میں تسکیں نہیں ہوتی

فریبِ چشمِ احول سے ہوس دونی ہوئی آخر مگر کیا دسترس دنیا کے رنگا رنگ خرمن پر

شکستِ نشۂ کیفِ ندامت واہ کیا کہنا بہانے سے ٹپکنا ہے زلالِ اشک دامن پر

یہ عیب ہے کہ مٹائے سے مٹ نہیں سکتا وہ حسن ہے جو سریع الزوال ہوتا ہے

ان اشعار کے مضامین اچھے سہی لیکن یہ اشعار ہرگز اچھے نہیں۔ یہاں مجھے آل احمد سرور کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "ایک بہت اچھے مضمون کے معمولی شعر سے ایک معمولی مضمون کا اچھا شعر بدرجہا بہتر ہے۔" غزل میں نامانوس الفاظ و تراکیب سے کام لینا گناہ نہیں۔ لیکن نامانوس کو مانوس بنا دینا ضروری ہے۔ اس نکتے کا جیسا علم اور اس نکتے پر جتنا عمل اقبال کے یہاں نظر آتا ہے۔ اتنا اردو کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔ یگانہ کی شاعری میں اعلیٰ درجے کی شعریت کی جو کمی پائی جاتی ہے اس کا ایک سبب محاورات کا استعمال بھی ہے۔ محاورات کا استعمال یگانہ کی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اس سے ان کی شاعری کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور نقصان بھی۔ اس نے ان کی انفرادیت کی تعمیر میں بھی حصہ لیا ہے اور ان کی شاعری کو بے کیف بنانے میں بھی۔ مثلاً ان اشعار کو دیکھیے جو صرف محاورے کی وجہ سے کہیں بے مزہ اور کہیں بدمزہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ؎

کیوں نقشِ قدم دیکھ کے کھاتے ہو پچھاڑیں — کیا قافلے سے کوئی بچھڑ کر نہیں ملتا

کس سادگی سے میں نے بڑھایا تھا دستِ شوق — ہنسنے سے بدمزاج یکایک اکھڑ گیا

منہ زوریوں کا جو عامل سرکارِ حسن سے ہے — آخر پڑی وہ مار کہ چہرہ ادھڑ گیا

یگانہ کو محاورات سے جو گہری دلچسپی تھی اس کی بنا پر انہوں نے نہ صرف ایسے محاورات استعمال کئے جن سے شعریت مجروح ہوئی بلکہ ایسے محاورات بھی استعمال کر گئے جو عام اور عام فہم نہیں ہیں۔ مثلاً ؎

چشم کیوں نہ ہو جائے مانگے کی آنکھ — کہ عینک سے دھاگا پرو دیا تو کیا

رنگ لائی گرم بازاری ہوائے گرم کی — رو دئے گل تو تماشا ہوا ہے قحطِ شبنم دیکھ کر

سنبھل کے ترکِ تلوار دیکھئے ہشیار — کہیں کلائی پہ دستِ ہوس نہ گہہ بیٹھے

کہو وہ بات دو ٹوک کہ یوں بھی ہو وہاں بھی — زباں وہ کیا جو حقیقت کی پردہ دار نہیں

ممکن ہے دلی اور لکھنؤ کی طرف کے عام لوگ بھی ان محاورات سے واقف ہوں اور ان اشعار سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ محاورے والی زبان کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے بلکہ ختم ہو چکا ہے اس لیے محاورے والی شاعری کی دلکشی کا محدود ہوتے جانا یقینی ہے۔ یگانہ اگر مضمون اور محاورے کے امتزاج کی بجائے معنی اور موسیقی کے امتزاج کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو اس کا نتیجہ ان کی شاعری کے حق میں بہتر ہوتا۔ ان کی غزلوں کی زمینیں ان کے مزاج کی سختی اور صلابت کی ترجمانی تو کرتی ہیں لیکن اردو شاعری کے MUSICAL PATTERNS میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں۔

یگانہ کے یہاں ندرتِ فکر اور جدتِ بیان کی کمی نہیں لیکن انہیں بیان کا وہ انداز بہ کم ہاتھ آتا ہے جو شعر کو زبان زدِ عام بنا دیتا ہے۔ خود یگانہ کے قول کے مطابق شعر کی تعریف یہی ہے کہ شعر وہ ہے جو وقت پہ یاد آئے۔ لیکن وقت پر یاد آنے کی جتنی صلاحیت غالب کے اشعار میں پائی جاتی ہے اتنی یگانہ کے اشعار میں نہیں۔ یہاں غالب کا نام اس لیے لے رہا ہوں کہ یگانہ اپنا مقابلہ غالب ہی سے کیا کرتے تھے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ یگانہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود غالب کو نہیں پہنچتے۔ یا یوں سمجھئے کہ غالب اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود یگانہ سے بدرجہا بہتر شاعر ہیں۔ یگانہ اگر معنی آفرینی میں غالب کو چھو بھی لیتے ہیں۔ جب بھی اندازِ بیان کی جادو آفرینی میں ان تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یگانہ کے یہاں مضمون کی ندرت اور اسلوب کی بلاغت کے باوجود اعلیٰ درجے کی شعریت نہیں ملتی۔ اپنی اس کوتاہی کو محسوس نہ کر سکنے کی وجہ سے ان کو اپنا ہر شعر حسنِ خیال اور حسنِ بیان کا مثالی نمونہ نظر آتا تھا بلکہ سوز و گداز کا سرچشمہ بھی۔ مثلاً یگانہ کے ان اشعار کو پڑھئے جن کے سوز و گداز پر "آیاتِ وجدانی" میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ دیکھئے کہ آپ پر ان کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں ؎

خدا کسی کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے — قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی — قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

خزاں کے دور میں دل کی لگی بجھتی تو کیا بجھتی — ہمیں خود آشیاں سے اڑ گئے ہوتے دھواں ہو کر

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا — گرفتارِ قفس پر یا گرفتارِ نشیمن پر

یہ اشعار نفسِ مضمون کے اعتبار سے دلدوز اور پُرسوز ہوں تو ہوں لیکن اندازِ بیان کے اعتبار سے ہرگز نہیں حالانکہ اندازِ بیان صناعی سے خالی نہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یگانہ دلکش اور مؤثر صناعی کے اعتبار سے غالب تو غالب، فانی اور جگر سے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میر کے پرستار کی حیثیت سے وہ اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کرنے کے بڑے آرزو مند رہے لیکن اس میں انہیں کامیابی بہت کم نصیب ہوئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی شاعری بے اثر ہے۔

دراصل وہ اپنے مزاج کی مناسبت سے جس اثر کے پیدا کرنے میں کامیاب رہے وہ غم کا سوز و گداز نہیں بلکہ طنز کی تلخی اور ترشی ہے۔ کلام کی تاثیر کے معنی صرف سوز و گداز کے کیوں لیے جائیں۔ یگانہ کی شاعری کا بہترین، کامیاب ترین اور مؤثر ترین حصہ وہی ہے جس میں ان کی طنز اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا۔ اس سے یگانہ آرٹ کی حدود واضح ہو چکی ہوں گی۔ ان کے فن میں جمال سے زیادہ جلال، تغزل سے زیادہ تفکر، بیان کی رعنائی سے زیادہ خیال کی گہرائی، عشق کے تجربات سے زیادہ عشق کے تصورات، جنون سے زیادہ شعور، داخلیت سے زیادہ خارجیت، ترنم سے زیادہ توانائی اور مہذبانہ کم بیانی سے زیادہ وحشیانہ کم صاف گوئی پائی جاتی ہے۔ اُردو غزل کی طویل تاریخ میں جن شاعروں نے غزل کی مرکزی روایت اور اس کے بنیادی مزاج کے خلاف بغاوت کر کے اس کے امکانات کو وسیع کر دیا ہے۔ وہ اقبالؔ اور یگانہ ہیں۔ غزل اپنی مرکزی روایت کے اعتبار سے حسن و عشق کی شاعری ہے اور اس کا بنیادی مزاج رومانی انفعالیت ہے۔ اقبالؔ اور یگانہ کی غزلوں میں نہ تو حسن و عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے نہ ان کی غزلوں کے مزاج میں رومانی انفعالیت پائی جاتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ حسن و عشق کے موضوع سے کسی شاعر کا انحراف کوئی قابلِ فخر بات نہیں اور کسی شاعر کے یہاں اچھی اور بلند پایہ عشقیہ شاعری کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ شاعری کے سب سے حسین موضوع اور زندگی کے سب سے لطیف پہلو کو نظر انداز کر گیا۔ سو اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ اور یگانہ دونوں کی شاعری (غزلوں) میں یہ کمی ضرور ہے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے شاعرانہ اجتہاد نے غزل کو دل کی جانی پہچانی دنیا سے نکال کر فکر و شعور کی نئی وادیوں میں پہنچا دیا ہے تو ہمیں یہ سودا گراں محسوس نہیں ہوتا۔ نئی سمتوں میں چلنے کے لیے پرانی سمتوں کی دل آویزیوں سے کنارہ کشی ضروری ہے۔ اقبالؔ اور یگانہ کی غزلیں اسی کنارہ کشی کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں خیالات اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے اُردو غزل میں ایک ایسی تبدیلی کا پتا دیتی ہیں جس کی مثال ان سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اقبالؔ کی غزلیں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے یگانہ کی غزلوں کے مقابلے میں اور زیادہ نئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان پر اُردو غزل کے صدیوں پرانے مروجہ مضامین و اسالیب کا پرتو بالکل نظر نہیں آتا۔ اکبر کے بعد اقبالؔ اُردو کے دوسرے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے لیے صرف ایک نئی زبان ایجاد نہیں کی۔ بلکہ شاعری میں اپنی وضع کی ہوئی اصطلاحات سے بھی کام لیا۔ اقبالؔ کی غزلیں ایک نئی زبان اور مخصوص اصطلاحات کے باوجود اپنے اندر وہ تمام حسن اور حلاوت رکھتی ہیں جو اعلیٰ درجے کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یگانہ کی غزلیں شعری محاسن کے اعتبار سے اقبالؔ کو نہیں پہنچتیں۔ ان دونوں شاعروں کا فرق بڑا واضح ہے۔ اقبالؔ فطانت GENIUS کے مالک تھے اور یگانہ صلاحیت TALENT کے۔ اقبالؔ نے فلسفے کو شاعری بنا دیا اور یگانہ نے شاعری کو فلسفہ بنانے کی کوشش کی۔ اقبالؔ اور یگانہ کے مزاج اور مرتبے کا فرق مسلم لیکن دونوں میں اتنی بات مشترک ضرور ہے کہ دونوں اُردو غزل کے مجتہد ہیں —— اس لحاظ سے سب سے بڑے مجتہد کہ انہوں نے غزل کی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی روح (مضامین) اور اس کے جسم (زبان و بیان) دونوں کو یکسر بدل دیا۔ لیکن غزل کے سب سے بڑے مجتہد ہونے کے معنی سب سے بڑے غزل گو ہونے کے نہیں۔ یہ منصب میرؔ و غالبؔ کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ جن کی شاعری زندگی کے ساتوں رنگ سے عبارت ہے۔

یگانہ کا شاعرانہ کمال صرف ان کی غزلوں میں نہیں رباعیوں میں بھی ظاہر ہوا ہے۔ "گنجینہ" میں غزلوں کے علاوہ ۱۴۳ رباعیاں بھی ہیں۔ ان رباعیوں پر مختصر سے مختصر تنقید یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح فانیؔ کی رباعیاں ان کے مخصوص رنگ و آہنگ کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح یگانہ کی رباعیاں بھی ان کی تمام تر امتیازی خوبیوں کی حامل ہیں۔ اگرچہ اُردو کا کوئی شاعر صرف رباعیوں کا شاعر نہیں کہا جا سکتا لیکن یگانہ کو ان شعرا میں ضرور شمار کیا جانے جنہوں نے اس فن کو سنجیدگی کے ساتھ برتا اور جن میں اس فن کو برتنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان کی کچھ رباعیاں دیکھیے ؎

کرنا جو کچھ تھا کر چکے اپنے حساب   بھرنا جو کچھ تھا بھر چکے اپنے حساب
اب دل ہی نہیں تو موت کا ڈر کیسا   مرنا برحق ہے مر چکے اپنے حساب

کعبے کی طرف دور سے سجدہ کر لوں — یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا — ایک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

ان مردہ پرستوں کا ہے مذہب کیسا — ہر حال میں بدحالی یہ مشرب کیسا
کل تک تو اسی کل سے آزردہ تھے — گزرے ہوئے کل کا ذکر خیر اب کیسا

مشکل کوئی مشکل نہیں جینے کے سوا — خاموش لہو کا گھونٹ پینے کے سوا
کھلتے ہیں جبھی جوہرِ تسلیم و رضا — جب کوئی سپر ہی نہ ہو سینے کے سوا

دنیا سے الگ جا کے کہیں سر پھوڑو — یا جیتے ہی جی مردوں سے ناتا جوڑو
یوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار — بڑھنا ہے بڑھو نہیں تو رستہ چھوڑو

بیداری موہوم کا پردہ نہ ہٹا — کٹنے کے لیے وقت بہت خوب کٹا
کیا جانیے کل سے آج تک کیا گزری — پانی کتنا بہا ہے پل کتنا گھٹا

ناکامیوں سے حوصلہ ہوتا نہیں پست — جیسا بھی سہی حال میں اپنے ہیں مست
لکھی تھی میرزا یگانہ کے لیے — باطن کی فتح اور ظاہر کی شکست

یگانہ کا آخری مجموعۂ کلام "گنجینہ" ہے جو ان کی وفات سے برسوں پہلے شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کی شعر گوئی کا سلسلہ آخر دم تک جاری رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ "گنجینہ" کے بعد والی شاعری کا کتنا حصہ منظرِ عام پر آ سکا۔ میں نے صرف دو تین غزلیں "آج کل" اور "ماہِ نو" میں دیکھی تھیں اور چند رباعیاں "افکار" میں۔ تو کیا یگانہ جیسے منفرد اور ممتاز شاعر کے آخری دور کی گراں قدر شاعری ہم لوگوں کی دسترس سے باہر ہی رہے گی؟

ڈاکٹر سید عبداللہ

ظفر علی خاں

کسی شاعر کی شاعری کے جائزے میں علمِ جغرافیہ سے مدد حاصل کرنا بظاہر بے تکی بات معلوم ہوگی مگر میں آج جغرافیے کی مدد لینے پر تلا ہوا ہوں، میرا جغرافیہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت، ایبٹ آباد کے ایک چشمے سے مشابہ ہے جس کو لوگ چشمہ الیاسی کہتے ہیں۔ اس چشمے کے پانی کی روانی اور فراوانی عجب بہار دکھاتی ہے، مگر اس کے پیچھے کا پہاڑ اور اس کی چٹانیں ہیبت اور جلال کا کچھ ایسا سماں پیش کرتی ہیں جن سے کائنات کی سطوتوں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ظفر علی خاں کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی ہے اور ان کی شخصیت کے منبع سے شاعری اور ادبی اظہار کا جو سرچشمہ رواں دواں ہوا ہے وہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ان کی پُرشور، طوفان انگیز اور بڑے بڑے خطرات اور بڑے بڑے منصوبوں اور سرگرمیوں میں گھری ہوئی زندگی کا تصور کرکے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ پُرخطر لمحات میں بھی ان کی تخلیقی قوت، کس سہولت اور بے ساختگی سے، فوارے کی طرح ابل ابل کر بہار دکھا جاتی ہے۔ اور پھر ظفر علی خاں کا طرزِ زندگی بھی تو قابلِ غور ہے، تقدس اور پاکیزگی کا نمونہ، بے اعتدالیوں سے پاک، ہر وقت نیک ارادوں سے معمور ــــ ان کے شب و روز بے لوث ــــ نیت اور عمل کا کوئی دھبہ ان کے کردار کو داغ دار کرتا نظر نہیں آتا۔

ظفر علی خاں ان لوگوں میں سے تھے جو خلوت میں بھی جلوت کے ہنگاموں کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کی جلوت بھی کچھ ایسی ہوتی تھی کہ اسی میں خلوت کی سی تنہائی بھی انہیں میسر تھی۔ فنِ شاعری کچھ بھی ہو ایک حد تک تنہائی کی ریاضت ہے مگر ظفر علی خاں کو وہ جلوت بلکہ عین "معرکۂ کارزار" میں بھی تنہائی مل جاتی تھی ــــ اور جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا ان کی بدیہہ گوئی ان کی شخصیت کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے

ظفر علی کی یہ ذہنی یکسوئی ان کی طبیعت کی ایک دوامی کیفیت ہے۔ کسی جلسے میں ہوں یا دفترِ صحافت میں، رضاکاروں کے جیش کی سالاری کر رہے ہوں یا زنداں کی کال کوٹھڑی میں ــــ ذہنی یکسوئی کی دولت انہیں ہر وقت میسر تھی ــــ ان کی زندگی حوادث و مصائب سے لبریز نظر آتی ہے۔ مگر ان کا دل بھرا بھرا تھا۔ اس گلشن کی مانند جس میں کسی گل چین کو یہ کہنے کا موقعہ نہیں ہوتا کہ اب چننے کے لئے کوئی پھول باقی نہ رہا ــــ سدا بہار کشادگیٔ طبیعت ظفر علی خاں کی ایک خاص صفت اور سیرت تھی۔

مولانا ظفر علی خاں بیسویں صدی کے نامور ادیبوں اور صحیفہ نگاروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز نے ان کے ادیبانہ کام کا واضح تصور پیدا نہیں ہونے دیا۔ بہت سے لوگ مولانا ظفر علی خاں کو محض سیاسی لیڈر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یا پھر ایک صحیفہ نگار کی حیثیت سے ــــ حالانکہ ان حیثیتوں کے علاوہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ محفوظ ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میدانِ خاص میں بھی انہوں نے اردو کے ادبی ارتقا کی ایک ایسی خدمت انجام دی ہے جس کو نہ ماننا ادبی ناشکر گزاری ہی نہیں ایک شدید قومی یا اخلاقی جرم بھی ہے۔

ظفر علی خاں کے تخلیقی مزاج کی بھی عجب شان ہے کہ کوئی ایک رنگ ان سے مخصوص نہ تھا۔ وہ کچھ ہمہ رنگ قسم کا مزاج تھا، طلسماتی انداز کا۔ کہ اس کی بوقلمونی کے اندر سے ہر قسم کا رنگ ابھر اچلا آتا تھا، بالکل طلسماتی طریقے پر ——! ابھی شاعری کر رہے ہیں، ابھی نثر لکھ رہے ہیں، پھر تھوڑی دیر میں خطیبانہ انداز ہے۔ پھر مزاح و ظرافت ہے، پھر ہجو ہے، کبھی سنجیدگی کا یہ عالم کہ کوہساروں کی سکوت افزا متانت یاد آجائے، کبھی بے تکلفی کا یہ رنگ کہ پھول کانٹے، پتھر کنکر جھڑتے اور کبھی —— اُڑتے نظر آئیں ——!

یہ سب کیا ہے۔؟ اس راز کی کلید اس حقیقت میں ہے کہ ظفر علی خاں ایک خاص تخلیقی عظمت کے لئے پیدا کئے گئے تھے جو یک رنگ نہ تھی فہانت جودتِ طبع، طراری، تیزی، شوخی —— تخلیق کا ہمہ گیر جوہر ان کے پاس تھا، مگر طبیعت میں وہی اپنے استاد شبلیؔ کی طرح، جوش، اشتعال، ہنگامہ خیزی ہیجان اور بے قراری بہت تھی جو کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کرتی رہتی تھی، مگر جلد جلد کچھ کر گزرنے کا میلان بھی تھا۔ اس پر زمانہ بھی ایسا پایا جس میں ہر طرف اضطراب و اضطرار کی کیفیت تھی۔ نتیجہ یہ کہ ان کی ہمہ رنگی، اس مرکزی امتزاجی عنصر تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک مادۂ سیال کی مانند کبھی ادھر کبھی ادھر بہہ بہہ کر کچھ ضائع اور کچھ نمودار ہوتی رہی —— اس معنی میں ظفر علی خاں، بیسویں صدی کے ادبِ اردو کا ایک المیہ ہیں —— یعنی ایک ایسی عظمت جو اپنے مقدّر کو نہ پا سکی۔

مجموعی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ظفر علی خاں استعداد کے اعتبار سے ایک شاعر کا دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ ان کی ادبی نثر تو اپنی ساخت یا مزاج کے اعتبار سے شاعرانہ شان کی مالک ہے۔ ان کی صحافتی تحریروں کا لہجہ بھی شاعرانہ زیادہ اور اخباری کم ہے اور اگر شاعری کے دو بڑے رکن جذبہ اور تخیّل ہیں تو اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کی نثر میں یہ دونوں عناصر بافراط موجود ہیں اور بعض اوقات تو ان کی نثر میں آہنگ کی ایسی صورتیں ملتی ہیں جو شعر ہی سے مخصوص ہیں۔ مگر اس وقت مجھے یہ بتانا ہے کہ ظفر علی خاں صحافی سے زیادہ شاعر اور ادیب تھے۔ اور اگرچہ اردو صحافت میں بھی ان کی جگہ ممتاز اور پہلی صف میں ہے پھر بھی ان کی صحافت کی ساری قوت، ان کی ادبی قابلیتوں کی شرمندۂ احسان تھی۔ یعنی ان کے ادب نے اردو صحافت کو بہت کچھ دیا۔ البتہ ان کی صحافت نے ان کے ادب کو نقصان پہنچایا —— اس معنی میں کہ ان کی شاعری صحافت کی پریشاں نگاری کے نیچے دب کر رہ گئی اور ہمیں شاعری میں ان سے وہ کچھ نہ مل سکا جو مل سکتا تھا۔ وہ بہت بڑے شاعر ہو سکتے تھے مگر بہت بڑے شاعر بن نہ سکے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کی ذمہ داری اوّل تو اس زمانے پر ہے جس نے انہیں کبھی مترجم بنایا اور کبھی خطیب، پھر کبھی صحیفہ نگار بنا کر ان سے خطابت اور اخبار نویسی کرائی۔ مگر زیادہ تر اس کی ذمہ داری، ان کی اپنی طبیعت پر بھی ہے جس نے اثر پذیری اور تلوّن کے میلان کی وجہ سے ان کی شاعری کا کوئی مستقل نظریہ اور مستقل مسلک قائم نہ ہونے دیا اور وہ محدود، وقتی، ہنگامی، شخصی اور مقامی مباحث میں الجھ کر رہ گئے اور اپنے عظیم اندازِ بیان کے قالب میں ایسے مضامین بھرتے گئے جن کو پڑھ کر بعض اوقات آدمی حیران ہو کر کہہ اٹھتا ہے ہائیں! یہ خوبصورت CASKET اور اس میں بھرتی کا یہ معمولی حال ——! یہ دراصل ان کی طبیعت کی وقتیت اور ہنگامیت کا نتیجہ تھا کہ وہ بالکل چھوٹے چھوٹے واقعات کو جن کی طبعی عمر چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہو سکتی اپنی شاعرانہ صنائع کے ذریعے چمکا کر اپنی صحافت کو مقبول بنا لیتے تھے مگر آج کا قاری یہ دیکھ کر ناخوش ہے کہ صحافت کی خاطر بڑے ہنر ور کو کتنی عظیم و جسیم قربانی پیش کرنی پڑی۔ ان کی حیاتِ ادبی کی ابتدا کتنے درخشاں شاعرانہ کارناموں سے ہوتی ہے۔ مگر صحافتی مشاغل کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں وہ قوت اور توانائی نہ رہی جو ابتدا میں کسی عظیم نابغہ کے مستقبل کا یقین دلا رہی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ شاعر جس نے موسیٰ ندی کی طغیانی پر ہمیں "شورِ محشر" جیسی نظم دی، "جنگل میں منگل" کے نثری لباس میں پُر آہنگ شاعری کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ یا "سفرِ لندن" کی جزئیات نگاری سے روشناس کرایا، وہی شاعر بعد میں قریبی موضوعات اور مقامی تجربات میں پھنس

گیا۔ بایں ہمہ ظفر علی خاں کی شاعری کو اپنے صناعانہ اندازِ بیان اور بعض دوسرے انفرادی پہلوؤں کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس کو یہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کہ یہ محض وقتی یا اخبار نویسانہ نظم گوئی ہے۔ بالیقین ظفر علی خاں کو شاعری کے کچھ جوہر ایسے بھی ہیں جو راکھ کے اندر سے چمک کر ادب کے ہر انصاف پسند مورخ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

ظفر علی خاں کی شاعری کی خصوصیتیں چند در چند ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ظفر علی خاں کی شاعری میں بیک وقت کئی رنگ یا کئی ذائقے ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں یکرنگی اور یکسانیت کی اداسی اور اکتاہٹ موجود نہیں، اس میں کہیں شبلی کا رنگ ہے جو ان کی تاریخی اور سیاسی نظموں میں ظاہر ہوا ہے کہیں اکبر کا ڈھنگ ہے جو ان کی طنزیات و مضحکات میں نظر آتا ہے، کہیں وہ چکبست کی نرم سیاسی نظم گوئی کو اپنے تیز اور تند لہجوں میں بدل دیتے ہیں اور پھر کہیں وہ اقبال کی رجزیہ نظموں کی، اپنے خاص انداز میں پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کئی کئی ذائقے (خواہ ان کا ذائقہ ظفر علی خاں کی زبانِ قلم پر آکر قدرے مختلف ہی کیوں نہ ہو گیا ہو) ہیں بڑے پُرلطف اور ان میں زیادہ مزے دار بات یہ ہے کہ انہی کے اندر کم و بیش پچاس برس کی سیاسی اور شخصی تاریخ منضبط قاعدہ روزنامچے یا ڈائری کی شکل میں گویا منظوم ہو گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے عربی شاعری کو الشعر دیوان العرب کے نام سے یاد کیا تھا۔ ظفر علی خاں کی شاعری کو اس لحاظ سے اس زمانے کی تاریخ الہند کہہ دیا جائے تو شاید تواریخی صداقت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ظفر علی خاں پر شبلی کا بہت اثر تھا۔ چنانچہ ان کے تتبع میں انہوں نے بھی تاریخ اسلام کے بعض واقعات کو منظوم کیا لیکن اس واقعہ پر تعجب نہیں ہو گا کہ شبلی کی نظمیں ظفر علی خاں کی نظموں سے لہجے کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ شبلی کی تاریخی نظموں میں بہت ٹھہراؤ ہے۔ ان میں ایک مورخ کا ذمے دارانہ سکون اور وقار پایا جاتا ہے۔ شبلی کے یہاں لفظوں کا انتخاب اور عبارت کا اختصار و ایجاز کمال کی حد تک پہنچ کر ایک فنِ خاص بن گیا ہے، وہ تھوڑے الفاظ میں بہت سے معانی کو بیان کر دینے میں مشاق ہیں۔ شبلی ایمائی اور اشاراتی طرزِ بیان کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل ایمائی کیفیتوں سے لبریز ہے اور واقعہ نگاری میں بھی وہ طوالت کو جائز نہیں رکھتے۔

ان کے مقابلے پر ظفر علی خاں فراوانیٔ الفاظ کے سرمایہ دار شاعر ہیں۔ شبلی اپنے جوش کو کنائے کے بطن میں چھپا لیتے ہیں۔ ظفر علی خاں اپنے جوش کو الفاظ و تراکیب کی نمائش میں جلوہ گاہِ عام پر لے آتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی نظم فسطاط کا مقابلہ شبلی کی نظم خلافتِ فاروقی سے کر دیکھئے فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اس غرض کے لئے فسطاط کا مطالعہ بہت مفید ہو گا۔ ظفر علی خاں کی سیاسی نظموں میں تمسخر اور ہجو کا جو رنگ موجود ہے وہ شبلی کی سیاسی نظموں میں نہیں ——— شبلی سیاسی نظموں میں نقاب اوڑھ کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ظفر علی خاں ہجو میں کھل جاتے ہیں۔ یہاں بھی شبلی اپنے علمی وقار اور وضع داری پر قائم ہیں، ظفر علی خاں جو کبھی کبھی نقاب بھی اوڑھ کر سامنے آتے ہیں۔ نقاب و بے نقاب ہر موقعے پر کھلی بات کرنے کے عادی ہیں۔ شبلی صحیفہ نگارانہ مجبوری سے بھی آزاد تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ انہیں اپنی علمیت اور فاضلانہ حیثیت کا ہمیشہ احساس رہا اور اس وقت بھی جبکہ وہ دلائل کی جنگ لڑ رہے ہوتے تھے یا تو طنزِ خفی سے کام لیتے تھے یا مبالغہ انگیز استعارے سے شب خون مار کر مخالف کو بے دست و پا کر دیا کرتے تھے اور آخر میں یہ کہ شبلی کی نظموں کے پس منظر میں خلوت کدے کا مورچہ موجود ہے اور ظفر علی خاں کی سیاسی قیادت نے ان کو ایسا کوئی مورچہ نہ بنا دیا۔ وہ خلوت میں بھی جلوتی ہیں۔

اقبال کی تاریخی نظمیں جوش انگیزی سے زیادہ حکمت آموزی اور بصیرت افروزی کے مقصد سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم بلال ——— یہی رنگ ان کی سیاسی نظموں کا ہے کہ ان میں بھی مقصدیت دانش کے کسی نکتے کو سامنے لاتی ہے۔

ظفر علی خاں اور اکبرؔ میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں مگر یہاں بھی ایک بہت بڑا فرق ہے۔ اکبرؔ کے یہاں ایک مستقل زاویہ نظر ہے اور وہ اس پر مسلسل لکھتے جاتے ہیں یعنی معاشرتِ جدید کی تنقید ـــــ مگر ظفر علی خاں کے یہاں یہ موضوع منجملہ دوسرے موضوعات کے ہے اس لئے وہ اس موضوع کا پورا حق ادا نہیں کر سکے۔

ان دونوں شاعروں میں یہ فرق بھی ہے کہ ظفر علی خاں ہجو اور تمسخر کو ذریعہ بناتے ہیں اور اکبرؔ کے یہاں وہ شئے لطیف موجود ہے جس کو مزاح کہتے ہیں جس کی چبھتی ہوئی صورتیں بھی لطف سے خالی نہیں ہوتیں اور طنز میں کبھی کھلی ڈھیلی ہجو کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی

اکبرؔ نے سرسید کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر ظفر علی خاں کی اس نظم کی طرح کی ایک نظم بھی ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ جب ہجو کرنے لگتے ہیں تو بہت کھل جاتے ہیں اور مخاطب کا کوئی پاس انہیں نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ نظم ملاحظہ ہو جس کا ایک مصرعہ یہ ہے

ع قوم کی لٹیا ڈبو دی، کس نے سراقبال نے

ممکن ہے کہ بعض احباب یہ کہہ اٹھیں کہ واقعاتِ روزمرّہ کا منظوم بیان اپنی جگہ بہت اچھا مشغلہ سہی مگر اس میں معمولیات نگاری یا قطعہ نگاری نے ظفر علی خاں کی شاعری کی عزت و توقیر میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ـــــ مگر اس حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ظفر علی خاں ہی وہ اولیں شاعر ہیں جن کے یہاں جذبات گلے میں پھنسے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کی شاعری، ان کے سچے جذبے کی کھلی اور بے خوف آواز ہے۔ ان کی بے خوفی اور بے لاگ حق گوئی نے ان کے الفاظ کو آہنی عزم اور یقین کا آئینہ دار بنایا ـــــ ظفر علی خاں سے پہلے قومی شاعری میں حالیؔ کی حیثیت تسلیم مگر حالیؔ کی شاعری میں مرثیت اور رُلا رُلا کر غیرت دلانے کے ڈھنگ پائے جاتے ہیں ـــــ حالیؔ غزل میں بھی انفعالی آواز رکھتے ہیں اور ان کی قومی شاعری کی دُھن بہت دھیمی دھیمی، دبی دبی، سہمی سہمی سی ہے۔ وہ مری ہوئی آواز والے شاعر ہیں ـــــ ان کی آواز بھرّائی ہوئی اور پھٹی ہوئی ہے۔ غرض ظفر علی خاں ہی پہلے شخص ہیں جن کی آواز میں سطوت اور دبدبے کا سماں پایا جاتا ہے۔ ان کے رجز کی قوت زمانے کے مجموعی پرجوش احساسات اور ان کے طرزِ اظہار کی نمائندگی کرتی ہے اور ایک لحاظ سے اس کو نقارے کی چوٹ بھی کہہ دیا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ بہرحال آواز کا یہ رعب اور نعرہ کی یہ کڑک نہ اکبرؔ میں ہے نہ اقبالؔ میں ـــــ اکبرؔ میں اس لئے نہیں کہ وہ بقول خود ... تھے اور اقبالؔ میں اس لئے نہیں کہ ان کی شانِ حکمت کی پاسداری پر مجبور تھی!

ع کہ درسِ فلسفہ‌ام دادو عاشقی ورزید

اس کے علاوہ ان کی صدا کی تندی و تیزی، ان کی آفاقیت کی لپیٹ میں آکر مقامی شدت سے محروم ہوگئی ہے لہٰذا مقامی طور پر اقدامِ جارحیت کا فرض، اس گزرے زمانے میں ظفر علی خاں سے زیادہ کسی نے ادا نہیں کیا ـــــ سیاسی آزادی سے پہلے آوازِ آزادی اور نوا کا جو داب جس شاعر نے قائم کیا ان میں شبلیؔ کو بھی ایک مرتبہ خاص حاصل ہے۔ مگر شبلیؔ کتب خانے کی الماریوں کی آڑ میں شاعری کرتے تھے۔ زیچ کھینچ کی شاعری انہوں نے نہیں کی تاہم ظفر علی کو راستہ دکھانے والے وہی تھے۔ پھر بھی ظفرؔ ظفر تھے، اور شبلیؔ شبلیؔ۔

بہر صورت یہ مسلّم ہے کہ قومی رجز نگاروں میں ظفر علی خاں کا رتبہ محفوظ ہے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی وجہ سے پہلے پہل ہماری شاعری کے لہجے میں مردانہ پن پیدا ہوا اور شاعری ضعف و سہل نگاری یا مرثیت کے بجائے کارہائے عظیم اور مہماتِ خطرناک کے سرگرم کار وسیلہ ...

ظفر علی خاں کی انفرادیت کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ انہوں نے شاعری اور عشق کے قدیم رشتوں میں اور ان کے تصورات میں بنیادی تبدیلی پیدا کی اور وہ یہ کہ عاشقی کو اس کی رسمیت سے نکال کر اس کا محور بدل ڈالا ـــــ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ظفر علی خاں کے کلام میں عاشقانہ جذبات یا تو آں حضرت (صلعم) کی نعتوں میں ظاہر ہوتے ہیں یا پھر وہ لیلائے آزادی، قوم کی محبت میں مگن نظر آتے ہیں ـــــ اور تجرید کی ...

ہے کہ ظفر علی خاں نے غزل سے مطلقاً اعتنا نہیں کیا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ان کے نزدیک صرف مرد و زن کی محبت ہی اعلیٰ قدرِ زندگی نہیں بلکہ محبت کے کچھ ارفع موضوع بھی موجود ہیں جن سے عہدِ وفا باندھا جا سکتا ہے ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا :

بعض لوگوں کو ظفر علی خاں کی اس انفرادی روش پر تعجب ہوا ہے اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ کوئی شخص مشرقی روایات میں پل کر کیونکر غزل سے الگ تھلگ رہ سکتا ہے اور واقعی بات بھی کچھ ایسی ہی ہے، مگر گہری سوچ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ظفر علی خاں کی نعت ایک ایسے قلب کی آواز ہے جو یقیناً محبت سے آشنا ہے ——— نعت تو خیر محبت ہی کا ایک رنگ ہے ——— ان کی عام شاعری کے لہجے اور اظہارات سے بھی ان کے درد پسند دل کے راز ظاہر ہو رہے ہیں ——— نعت کا موضوع بڑا نازک موضوع ہے مگر بصد استغفار دو توبہ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ کوئی وہ شخص عشقِ رسول کی شاعری نہیں کر سکتا جو محبت کے کرب و درد اور انہماک اور مرکزیتِ توجہ سے باخبر نہ ہو ——— خیر! جو کچھ بھی ہو ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری بیک وقت محبت کی شاعری بھی ہے اور عقیدت کی شاعری بھی ——— یہ تو ظفر علی خاں کا پاسِ ناموسِ عشق ہے کہ انہوں نے عشقِ رسول (صلعم) کا دم بھرنے کے بعد اپنی دوسری محبتوں کو تذکرے کے لائق خیال نہیں کیا ——— ورنہ ان کی شاعری محبت کے ہر پاکیزہ جذبے کی ترجمان بن سکتی تھی۔ اور میں تو ذاتی طور ان کی مندرجہ ذیل نعت کو بھی غزل ہی کہوں گا۔ بشرطیکہ احباب غزل کو صرف "گفتگوئے محبت با زناں" تک محدود نہ کر دیں۔ اس نعت کا متغزلانہ انداز دیکھئے ؎

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہیں تو ہو — ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہیں تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے — اُس نورِ اوّلیں کا اُجالا تمہیں تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا — سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمہیں تو ہو

اس محفلِ شہود کی رونق تمہیں سے ہے — اس محفلِ نمود کی لیلیٰ تمہیں تو ہو

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر — اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہیں تو ہو

جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا — اے رہ نوردِ جادۂ اسریٰ تمہیں تو ہو

ظفر علی خاں کی شخصیت کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو غم اور خوف کا ترجمان نہیں بننے دیا اور ظاہر ہے کہ عشقِ رسول (صلعم) کے سوا ہر دوسری محبت جہاں لذت بخش ہے وہاں الم آفریں بھی ہے اور یہی وہ شے ہے جس کو ظفر علی کا مزاج کبھی گوارا نہ کر سکا۔

ظفر علی خاں نے غم اور الم کے اس تصور کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے جو اردو شاعری کی روایت میں شامل ہے یہاں تک کہ زمانۂ اسیری کی نظموں میں بلکہ مرثیوں میں بھی ان کا لہجہ ایک حزیں اور رنجور انسان کا نہیں اگرچہ تنہائی کے ان لمحات میں طبیعت کا مغلوبِ غم ہو جانا یقینی تھا ——— اور شاید کبھی کبھی وہ مغلوب بھی ہوتے ہیں مثلاً اپنے پوتے منصور کو دیکھ کر یہ کہا تھا ع

جانِ بابا اس سیہ خانے میں تم کیوں آ گئے

تاہم زبانِ قلم سے غم کی داستان بیان کر کے اپنی شاعری کو نوحہ بنا دینے کا ننگ کبھی گوارا نہیں کیا ——— لاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون ہی ان کا مسلکِ زیست تھا اور یہی مسلک ان کی شاعری میں ثابت قدمی اور استواری کی لفظی تصویر بن کر نمودار ہوا ہے۔ اگرچہ اس مختصر مضمون میں، ظفر علی خاں کے تصورِ شاعری پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں مگر یہاں ان کی ایک مختصر سی نظم سنا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں جس میں

انہوں نے شاعری کی ماہیت اور اس کے موضوعات کی نشان دہی کی ہے۔ نظم یہ ہے ؎

شعر کیا ہے؟ خیال کی تصویر　　بال اور اس کی کھال کی تصویر
نہ فقط نقشِ عارضِ زیبا　　نہ فقط خط و خال کی تصویر
بلکہ کُل کائنات کی رونق　　اور اس کے جمال کی تصویر
ملّتوں کی حیات کا معنی　　اُمتوں کے مآل کی تصویر
چند الفاظِ دلکش آجائیں
بن کے سحرِ حلال کی تصویر

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ظفر علی خاں کے نزدیک شاعری کو انفرادی اور قومی ہر قسم کے جذبات کا ترجمان ہونا چاہیئے اور انہوں نے ایک محدود حد تک اس پر عمل بھی کیا ہے ـــــ مگر صحیح یہ ہے کہ ظفر علی خاں کے یہاں خدوخال کی تصویریں مطلقاً موجود نہیں۔ البتہ قومی اور سماجی زندگی کے مناظر واقعات کی صورت میں خوب جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں نعت کا سرمایہ بھی بہت قیمتی متاع ہے اور پھر وہ نظمیں بھی جو وقتی سی مگر ان کو مستقل اور دیر پا اہمیت دی جاسکتی ہے۔ اور ان میں وہ گداز بھی ہے جو شاعری کی جان اور ان سے روحانی ہم کلامی کا بھی پتہ چلتا ہے جس کے بغیر کسی شاعر کا سطح اونچی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ظفر علی خاں کی شاعری کی ایک سطح ایسی بھی ہے جس کا کردار واضح ہے۔ اس میں وہ لذتِ غم بھی ہے جو حیاتِ فکری وغیرہ کے علاوہ زندگی کی ہر صورت کے لئے ایک وسیلۂ ارتقا ہے، حیاتِ انسانی میں الم ایک ایسی عین حقیقت ہے جس کی بنیادیں ازل اور ابد کے ستونوں پہ کھڑی ہیں۔ ہماری روحوں کو الم کا ذوق فطرت سے عطا ہوا ہے اور یہی ذوق، زندگی کی لذت بھی ہے اور رونق بھی ـــــ ظفر علی خاں اس ذوق سے بالکل خالی نہ تھے ـــــ بلکہ میرا خیال ہے کہ ظفر علی خاں کے غم کی تہ بہت گہری اور پاتال میں جمی ہوئی ہے جس پر مٹی کے پہاڑ تہ بر تہ جمے ہوئے ہیں۔ ان کی طبیعت ان کہساروں سے مشابہ ہے جن کی تہ میں پانی کی لکیر اس کے نکاس سے بہت دور ہو بالکل اسی چشمۂ الیاسی کی مانند جس کی اصل کہا جاتا ہے کہ نکاس سے صدہا میل دور واقع ہوئی ہے، اندر سے ظفر علی خاں ایک غم زدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ان کی ریاضت تھی کہ انہوں نے ظاہری سطح پر الم کے پانی کو زیادہ ابھرنے نہیں دیا ـــــ مجھے ظفر علی خاں کے غم سے اس لئے زیادہ ہمدردی ہے کہ اس میں ضبط و تحمل کی بڑی شدت ہے اور اس درد کو صرف وہی کوئی جان سکتا ہے جس نے زندگی میں صبر و تحمل کا تجربہ کیا ہے۔ بالیقین ظفر علی خاں ایک مہیب کہسار تھے، جن کے سینے پر رنگا رنگ کے پھول کھلے تھے مگر سینے کے اندر درد، الم کے بے شمار چشمے ہر وقت رواں دواں تھے۔ یہ اور بات ہے کہ پانی کی لکیر ذرا دیر سے نظر آتی ہے۔

اب میں ظفر علی خاں کے موضوعات اور ان کی شاعری کی مردانہ نوا کے تذکرے سے ہٹ کر ان کی شاعرانہ صناعی کا اجمالی ذکر کرتا ہوں کیونکہ یہ وہ خصوصیت ہے جو ان کی شاعری کو، شاعرانہ زبان کے ارتقا میں ایک اہم رتبہ دلواتی ہے۔ میں تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اشاروں میں بات کرتے ہوئے عرض کردوں گا کہ ظفر علی خاں کا اندازِ بیان حالی کے نیچرل اور پسندِ عوام طرزِ بیان کے خلاف ایک طرح کا احتجاج کرتا سنائی دیتا ہے۔ ظفر علی، بارعب، باوقار اور عالمانہ فاضلانہ لفظوں کے شاعر ہیں اور ان کے ذوق کو معمولی زبان کے استعمال سے تسلّی نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں پرخروش الفاظ بڑی قیمت پاتے ہیں۔ اگرچہ ہجو و طنز میں وہ پامال سے پامال لفظ بھی لے آتے ہیں۔

ظفر علی خاں اپنی صنعت گری کے لئے اختراع اور ندرت کی خاص ضرورت محسوس کرتے ہیں چنانچہ وہ خاص موقعوں کے لئے

خاص ترکیبیں گھڑتے اور سنگلاخ الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں ظفر علی خاں کی اس ندرت پسندی کو ان کی الفاظ دانی نے بڑی تقویت پہنچائی ہے چنانچہ ان کی بعض نظموں میں الفاظ کی فراوانی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اسی طرح مشکل قوافی اور ردیفوں پر ظفر علی خاں کو خاص قدرت حاصل تھی اور اس میں ان کے مقابلے کے اردو شاعری میں صرف دو تین شاعر کھڑے ہو سکتے ہیں یعنی انشا، نظیر اور اکبر ــــ اور بدیہہ گوئی میں تو یہ بھی ان کے سامنے نہیں لائے جا سکتے۔ ظفر علی خاں کے نغموں کا آہنگ (RHYTHM) ان کی شاعری کی روح کے عین مطابق ہے، اس کی رجز یہ کیفیت کا یہ خاص اثر تھا کہ ان کی نظمیں فوراً یاد ہو جاتی تھیں اور ایک دن کے اندر اندر بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں ظفر علی خاں کے قوافی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سوانگت ہے نرالا سائیں کا ۔۔۔ پھٹا آتے ہی گولا ڈھائی من کا

ظفر علی خاں کی شاعری میں فلسفیانہ تجزیہ اور حقائق فکری کا بیان بہت کم ہے اسی وجہ سے اس کی گہرائی اور فکری سطحیت کی لوگوں کو شکایت ہے مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ ان کی شاعری میں کوئی علمی فضا موجود نہیں، ان کی نظموں کے موضوعات کچھ بھی ہوں، ان کے اظہار میں علمیت کا عنصر اکثر پایا جاتا ہے اور اس کا باعث کچھ تو شبلی جیسے استادِ کامل کی شاگردی کو بڑی حد تک، ان کی اپنی تحصیلات بھی ہیں جن کا عکس ان کی نظموں میں موجود ہے اور ان سب سے زیادہ یہ کہ ان کو اردو فارسی شاعری کی روایات اظہار و بیان سے پوری باخبری تھی جس کے سہارے انہوں نے اپنی نظموں میں صناعی کا کمال دکھایا ہے۔

مولانا ظفر علی خان کو بعض اہل تنقید نے جدید قصیدہ نگار کا خطاب دیا ہے، یہ لقب بھی فنی لحاظ سے بُرا نہیں مگر قصیدہ نگاری کے ساتھ بہت سی عیب کی باتیں منسوب ہیں۔ ہاں ایک بات ہے کہ قصیدے کا ساز و بیان اور ٹھاٹھ اور دبدبہ ان کے کلام میں ضرور ہے اور اگر مولانا کے تقدس، پاک نظری اور مقصد کی سنجیدگی کا خیال مجھے نہ روکے تو میں ان کو شاہ اور ذہانت و طراری کے لحاظ سے، انشا کا مماثل قرار دے دوں ــــ مگر جہاں انشا ایک بگڑے ہوئے شاعر تھے وہاں ظفر علی خاں کو کوئی بگڑا ہوا شاعر نہیں کہہ سکتا۔ ہاں ہجو کی رکالت کبھی کبھی ظفر علی خاں کو بہکا دیتی ہے ــــ مگر مجھے عادتاً عیبوں کے مقابلے میں خوبیاں اچھی لگتی ہیں، میں بچپن میں جگنو پکڑنے کا عادی تھا یہ مشغلہ مجھے آج بھی عزیز ہے ــــ لہٰذا خوبیوں کے جو جگنو میں نے پکڑے ہیں میں ان سے مطمئن ہوں ــــ! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ظفر علی خاں کی نظم کو صحافت کہہ کر اس کو ٹال دینے کے عادی ہیں۔

غرض ظفر علی خاں کی شاعری میں ظاہر کے لحاظ سے مجھے تین باتیں نمایاں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل فراوانیٔ الفاظ، دوم ندرت اور طرفہ پسندی کی آرزو، سوم موسیقی اور آہنگ سے خاص محبت ــــ ان کی شاعری کے آہنگ کے لئے ان کی تین قسم کی نظموں کو ملاحظہ کیجئے:۔

شمع حرا

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں ۔۔۔ اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر ۔۔۔ وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینا زاروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو ۔۔۔ یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا ۔۔۔ وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
ہم حق کے علم برداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی ۔۔۔ بادل کی گرج تکبیروں میں بجلی کی تڑپ تلواروں میں

تخت یا تختہ

ڈر جاتے ہیں ایک ہی بھبکی سے دیتے ہیں پیام آزادی کا
مرجاتے ہیں ایک ہی دھمکی میں اور لیتے ہیں نام آزادی کا

سودائے شہادت سر میں نہیں اللہ کی ہیبت دل میں نہیں
پھر کہتے ہیں تاکہ ہو نہ سکا دنیا میں نظام آزادی کا

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

دریائی گائے کی لوری

میرے بچے شور مت کر کر ہے رات اندھیری سر پہ
پڑا ارتا ہے موجیں بڑے ٹھاٹھ سے سمندر

وہ کھلی افق کی کھڑکی وہ چمک کے چاند نکلا
لیا ہم کو دیکھ سوتے لب ساحل اس نے آ کر

بنیں نیلی نیلی لہریں ترا نرم نرم تکیہ
بنا اُجلا اُجلا پانی ترا گرم گرم بستر

میرے پیارے ننھے بچے تو مزے سے پڑ کے سو رہ
نہ تجھے بھنور کا خطرہ نہ تجھے نہنگ کا ڈر

مولانا ظفر علی خاں کی ایک بہاریہ نظم "نو بہار" کے چند شعر

یہ مژدہ سنایا ہے مرغ سحر نے
کہ طرفِ چمن سے خزاں آ رہی ہے

ہجوم گل و لالہ و یاسمن میں ،
خراماں خراماں بہار آ رہی ہے

ہری ہو رہی ہیں درختوں کی شاخیں
نظر شانِ پروردگار آ رہی ہے

گرھے غلطاں کا آویزہ شبنم
بنا گوشِ سنبل میں لٹکا رہی ہے

جگایا ہے سبزے کو موجِ حیا نے
نسیم آ کے لانے کو بھکا رہی ہے

بہار آفریں ہے یہ نظم مرصع ،
جسے ساری خلقِ خدا گا رہی ہے


سید صفدر حسین


عرش صدیقی


حیات اللہ انصاری

مظہر سلیم


سلیم طاہر




رضیہ فصیح احمد



احسن احمد اشک

سالنامہ ادب لطیف ۶۲ء



خاطر غزنوی



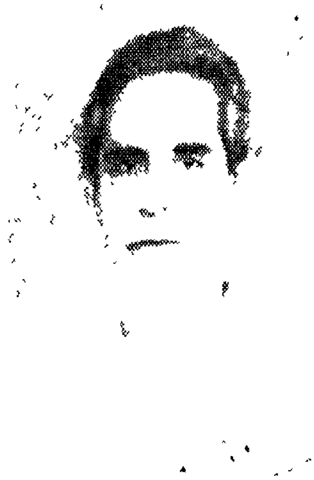
نظیر صدیقی



گوہر ہوشیارپوری



وارث کرمانی



سید سبط حسن

سالنامہ ادب لطیف ۶۲ء



یونس جاوید



شہریار



عباس اطہر



سلیمان اریب



موجد (آرٹسٹ)



عبدالعزیز خالد



سلیم اختر



صفدر اجمیری

باقی صدیقی

ہر طرف بکھرے ہیں رنگیں سائے — راہرو کوئی نہ ٹھوکر کھائے
زندگی حرفِ غلط ہی نکلی — ہم نے معنی تو بہت پہنائے
دامنِ خواب کہاں تک پھیلے — ریگ کی موج کہاں تک جائے
تجھ کو دیکھا ترے وعدے دیکھے — اونچی دیوار کے ہلکے سائے
پھر نکل آیا ہے سورج گویا — یاد ایسے وہ سرِ شام آئے
بند کلیوں کی ادا کہتی ہے — بات کرنے کے ہیں سو پیرائے
دل کا انجام جو ہوگا، ہوگا — شکر ہے آپ نظر تو آئے
وقت نے ہم کو لُبھانے کے لئے — پھول پتھر کی طرح برسائے
موت کا تجربہ کرنے والو — کہیں دُنیا نہ کھنڈر بن جائے
ہر نئے دور کی عظمت کے لئے — وقت نے حادثے کچھ دہرائے

کھیتیاں چونک اُٹھی ہیں باقی
گردِ کوہ اُٹھی کہ بادل چھائے

یوسف جمال انصاری

O

احساسِ زندگی کی مجھی پرا ساس ہے
یعنی جو ما سوا ہے وہ میرا قیاس ہے

عرفانِ زندگی بھی ہے میرے جنوں کا نام
یاں مقصدِ حواس شکستِ حواس ہے

ہے کوئی جو سراب میں دریا کو دیکھ لے
کس کی نگاہ اتنی حقیقت شناس ہے

صہبا کا جام اور ہے، نشّے کا جام اور
اِک دستِ مے فروش میں اِک میرے پاس ہے

کتنے ہی جام، کتنے ہی ساقی بدل گئے
مدت سے پی رہا ہوں کہ مدت کی پیاس ہے

اے خوابِ آرزو! تجھ پہ قربان جائیے
نغمہ ہے تیرا جسم تو نکہت لباس ہے

کس دشت کا غبار ہوں، کس گُل کی بُو ہوں میں
آوارگی ہی میری طبیعت کو راس ہے

عارف عبدالمتین

○

دیکھو تو کرشمے آرزو کے
عالم میں ہیں جو عملے نمو کے

ٹپکیں تو فروغِ گلستاں ہوں
یہ قطرے حقیر سے لہو کے

جھلسے بھی برگ و بارِ راحت
جھونکے وہ چلے الم کی لو کے

تحلیلِ فضائے عیش ہو گا
دیکھو کبھی دردِ غم کو چھو کے

قطعہ ۱

افسردہ دل سے شغل کیجے
احساں نہ اٹھائیے سبو کے

دامن کو سدا دریدہ رکھیے
محتاج نہ ٹھہریئے رفو کے

ہے دستِ طلب وہ تیغ جس سے
کٹ جاتے ہیں رشتے آبرو کے

قطعہ ۲

ملتا ہے سراغ خامشی کا
تیور ہیں عجیب گفتگو کے

افتاد کہاں کی آ پڑی ہے
آداب ہیں عشقِ روبرو کے

ہے کچھ تو بنائے سرگرانی
آپ ایسے بُرے نہیں تھے خو کے

قطعہ ۳

پانی میں گرا رہا ہوں کنکر
بیٹھا ہوں کنارے آبجو کے

گل ہیں کہ چمن میں شاخچوں پہ
جلتے ہیں چراغ رنگ و بو کے

افسونِ سکوت پر فشاں ہے
خوابیدہ ہیں فتنے ہاؤ ہو کے

قطعہ ۴

صحرائے جنوں میں ہیں خراماں
آتے ہیں خیال کاخ و کو کے

پھیلے ہوئے سائے آگہی کے
سمٹے ہوئے دشت جستجو کے

ہم اپنے رقیب بن گئے ہیں
ہم میں سبھی ڈھنگ ہیں عدو کے !

رضا ہمدانی

○

یہ کیا طرفہ تماشے ہو رہے ہیں! — نگاہیں خندہ زن، لب رو رہے ہیں
سدا جن سے ملے ہیں خار ہم کو — ہم ان کے واسطے گل بو رہے ہیں
جنونِ آبلہ پائی مدد کر! — کہ خارِ دشت پیاسے ہو رہے ہیں
شعورِ زیست شاید ہو چلا ہے — جو زیرِ دامِ طائر سو رہے ہیں
وہ میکش ہیں کہ اپنے آنسوؤں سے — بساطِ میکدہ کو دھو رہے ہیں
نگاہِ سرمگیں کیا کہہ گئی ہے — کہ دیوانے مزے سے سو رہے ہیں
قمر بے نور ہے تیرے کرم سے! — ستارے خون کے آنسو رو رہے ہیں
رہِ الفت میں ہے اب تو یہ عالم — ہم اپنی وضع داری کھو رہے ہیں
سیہ پلکوں کے شوخ و شنگ تیور — ہمارے دل میں کانٹے بو رہے ہیں

جلائے گوہرِ مقصود پا کر
رضاؔ ہم آبرو بھی کھو رہے ہیں

○

غلام ربّانی تاباںؔ

○

کسی کی سعیِ کرم رائیگاں مگر جائے
وفا وہ گل ہے جو بادِ سحر سے ڈر جائے

حیات کہئے کہ طوفانِ آرزو کہئے
اُٹھے جو موج تو سر سے گزر گزر جائے

ہر ایک موڑ پہ جلتے ہیں منزلوں کے چراغ
تھکا ہوا یہ مسافر کدھر کدھر جائے

خطا معاف یہ جلوہ بھی کوئی جلوہ ہے
کبھی تو شوق کا دامن گلوں سے بھر جائے

نظارے اور بھی ہیں عارض و جبیں کے سوا
اٹھاؤ سر کہ ذرا دور تک نظر جائے

کہاں وہ ظرف جو لازم ہے تشنگی کے لئے
یہ میکدہ تو سنورنے کو کل سنور جائے

جفائے دوست کہ آلامِ زندگی تاباںؔ
ہمارے قتل کا الزام کس کے سر جائے

○

اختر ہوشیارپوری

○

زخمِ سینے کا ہوا جاتا ہے عریاں کوئی — یوں بھی کرتا ہے کہیں چاک گریباں کوئی

حُسن میں عشق کے انداز کہاں سے آئے — اپنے سائے سے بھی رہتا ہے گریزاں کوئی

زلف آوارہ، قبا چاک، نظر وارفتہ — زندگی ہے کہ مرا خوابِ پریشاں کوئی

اُن کو دیکھا کہ کوئی خوابِ جوانی دیکھا — رات بھر رہتا ہے پہلو میں غزل خواں کوئی

اپنی آواز سے ہی گونجتے رہتے ہیں کھنڈر — دل سا دیکھا نہ کہیں قریۂ ویراں کوئی

جرسِ غنچہ کی آواز پہ چل پڑتے ہیں — ہم نے دیکھا کبھی گلشن نہ بیاباں کوئی

قافلے آتے ہیں، رُکتے ہیں، چلے جاتے ہیں — دل ہے اپنا کہ گذرگاہِ غزالاں کوئی

نکہت و رنگ کے انداز پتہ دیتے ہیں — ابھی ٹھہرے گا یہاں جانِ بہاراں کوئی

دل کے صحرا میں کوئی نقشِ قدم دن کو کہاں — رات آتی ہے تو ہوتا ہے خراماں کوئی

آخرِ شب وہ کسی یاد کا عالم اختر
جیسے جلتا ہو چراغِ تہہِ داماں کوئی

○

سلیمان ادیب

○

جو تیرے حسن میں نرمی بھی بانکپن بھی ہے
وہ کیفِ تازہ بھی ہے نشۂ کہن بھی ہے

مجھے تو چین سے رہنے دے اے دلِ وحشی
کہ دشت بھی ہے ترے سامنے چمن بھی ہے

کہاں کی منزلِ مقصود، راستہ بھی نہیں
سفر میں ساتھ خدا بھی ہے اہرمن بھی ہے

وہ ایک لمحۂ پرّاں، وہ ایک ساعتِ دید
حنا بدست بھی ہے، لالہ پیرہن بھی ہے

بچشمِ شبنمِ گریاں اگر کوئی دیکھے
ترا لباس ہی اے گُل ترا کفن بھی ہے

وہ ایک گوشۂ جنّت جسے دکن کہئے
نگارِ شاعرِ بدنام کا وطن بھی ہے

جمیل ملک

○

کھلے رستوں میں ہم تنہا کھڑے ہیں
اُمیدوں کے نگر سُونے پڑے ہیں

اِدھر بھی اِک نظر، حُسنِ گریزاں
یہاں اِک موڑ پر ہم بھی کھڑے ہیں

یہی ہے زندگی، تو موت کیا ہے؟
زمیں کی کوکھ میں زندہ گڑے ہیں!

صلیبیں راستہ روکے کھڑی ہیں
وفا کے مرحلے کتنے کڑے ہیں!

جمیلؔ ان کے سہارے جی لئے ہم
ہمارے حوصلے ہم سے بڑے ہیں

○

رشیدہ سلیم سیمیںؔ

○

جب سے نہیں کرتے ہیں ترا ذکر کسی سے
افسانے بنا ڈالے ہیں لوگوں نے جبھی سے

یوں گزرے ہیں ان گلیوں سے سہمے ہوئے کچھ لوگ
ڈرتے ہوں وہ جیسے سحرِ جادوگری سے

کس دیس چلے جائیں کہ تو یاد نہ آئے
اے دوست! کہیں کیا تری بیگانہ روی سے

معلوم نہ ہو جائیں کسی کو تری راہیں
خاموش گزر جاتے ہیں ہم تیری گلی سے

جب سے تری خوشبو سے سجائے ہیں در و بام
دل سوختہ جانوں کے سُلگتے ہیں جبھی سے

آجا! کہ یہ فرصت کی گھڑی پھر نہ ملے گی
بچھڑے تو نہ مل پائیں گے پھر اپنی خوشی سے

سیمیںؔ نظر آتے ہیں ابھی نور کے آثار
مایوس نہ ہو زیست کی اس تیرہ شبی سے

○

صفدؔر اجبری

دل و نظر کی جب آپس میں بات بنتی ہے
حیات جلوہ گہِ التفات بنتی ہے
پھر ایک ساغرِ رنگیں کا اہتمام کرو
یہ چیز وہ ہے کہ جس سے حیات بنتی ہے
یہ برہمی کی ادا اِک ہمیں سے ہو تو کہیں
رقیب سے بھی بصد مشکلات بنتی ہے
بایں نگارشِ پیہم مجھے فریب نہ دو
دلوں کے ربط سے الفت کی بات بنتی ہے
بس اک تبسّمِ رنگیں خریدنے کے لئے
حیات مرکزِ صد حادثات بنتی ہے
فریب کھا کے بیابانِ ہوش کے پیہم
سکون بخش سدا تیری ذات بنتی ہے
کسی کی یاد ضیا بار ہو اگر صفدؔر
شبِ فراق بھی دلچسپ رات بنتی ہے

مشفق خواجہ

○

سب حقائق نظر آنے لگے افسانہ ہمیں
وحشتِ دل نے کسی کام کا رکھا نہ ہمیں

ناز فرماتے تھے ہم ارزانیٔ دل پر کیا کیا
نگہِ لطفِ خریدار نے پوچھا نہ ہمیں

ہم گدایانِ رہِ شوق سراپا دل تھے
دیکھنے والے نے افسوس کہ سمجھا نہ ہمیں

گردشِ جام سے بے نام تعلق کے سبب
گردشِ دہر نے دیکھا ہے رقیبانہ ہمیں

سیلِ وحشت درودیوار سے رُکتا ہے کہیں
بستیوں میں بھی ملی رونقِ ویرانہ ہمیں

کس توقع پہ کریں تیری تمنّا ہم لوگ
ڈھونڈنے پر بھی ملا جب کوئی خودسا نہ ہمیں

حاصلِ عشق ہیں وہ تلخ حقائق مشفقؔ
یاد آتیں گے جو افسانہ در افسانہ ہمیں

شہاب جعفری

○

زندگی غم ہی سہی، غم بھی ہمارا نہ رہا
اب محبت کا ہمیں کوئی سہارا نہ رہا

ہم چراغ اپنے جلاتے رہے ساحل ساحل
تجکو طوفاں سے پلٹ آنے کا یارا نہ رہا

تیرہ و تار سمندر کا سفر تیری طلب!
آسماں پر تری آواز کا تارا نہ رہا

موج لے جائے کدھر سارے افق ڈوب گئے
ایسا طوفان اٹھا کوئی کنارا نہ رہا

تجھ سے بچھڑے ہیں کچھ اس طرح کہ ملنا معلوم
اک افق کا تھا سہارا سا، سہارا نہ رہا

زندگی تیرا دلاسا تھی کہ دُکھ دیتی تھی
لے تری راہ میں وہ درد کا مارا نہ رہا

آرزو نام کی اک زندگی گذری تھی شہابؔ
ہائے جس کو مرا مرنا بھی گوارا نہ رہا

○

مسعود قریشی

○

منزلِ محبت کا تھا کٹھن سفر یارو!
حُسن راہزن یارو، حُسن راہبر یارو!

بزمِ گیسو و لب میں سال ایک پل یارو!
عمر مختصر یارو۔ عمر مختصر یارو!

التفاتِ دلبر بھی اک عجیب جنّت ہے
پھول کی مہک میں ہے آگ کا اثر یارو!

شام تیری قربت سے جام بن کے آتی ہے
صُبح سے خمار اُس کا، نشّہ تا سحر یارو!

چاندنی سے آتی ہے جسمِ یار کی خوشبو
ہے یہیں کہیں شاید وہ گُلِ قمر یارو!

دوستی ہے دم کے ساتھ عشق چار دن کی بات
چار دن میں آتا ہوں میں بھی لوٹ کر یارو!

○

نسیم شبمالد پوری

○

نہ قربِ دوست کی خوشبو، نہ دیدِ یار کے پھول
نصیبِ دل ہیں ابھی زخمِ انتظار کے پھول

سکوتِ درد میں ڈوبی ہوئی تھی شامِ فراق
ہوا چلی تو کھلے زلفِ مشکبار کے پھول

کسی کے دل کا مقدر، کسی کے رُخ کا نصیب!
مری خزاں کے اندھیرے، تری بہار کے پھول

کچھ ایسی بات تھی سحرِ خزاں نہ ٹوٹ سکا
اگرچہ پاس ہی تھے خندۂ بہار کے پھول

وہ بجھتے چاند کا منظر بھی کیا قیامت تھا
کھلے تھے تا بہ نظر اشکِ تابدار کے پھول

○

جعفؔر شیرازی

○

جگنو نظر پڑے، کوئی اختر دکھائی دے
اِس گھورِ شب میں کوئی تو رہبر دکھائی دے

اب کوئی کیسے سرحدِ غم پار کر سکے
جب تیرا در ہی سدِّ سکندر دکھائی دے

آخر کوئی فریب کی حد لے سرابِ زیست
صحراؤں میں پھریں تو سمندر دکھائی دے

پایاب پانیوں کا سہی عکس اشکِ غم
اس بحر کا کوئی تو شناور دکھائی دے

اے دردِ آنسوؤں میں فروزاں ہی رہ کہ ہے
شعلہ وہی جو آب کے اندر دکھائی دے

کیا دیکھنے کی تاب ہو جعفؔر اُتر کے جب
مہتاب اُس مکان کی چھت پر دکھائی دے

○

ظفر اقبال

○

خون کی رتیلی دیوار گرائے نہ کہیں
دن مجھے توڑ کے باہر نکل آئے نہ کہیں

رات روشن ہے، اسے دل کا نظارا کر لو
صبح پڑ جائیں کسی ابر کے سائے نہ کہیں

عیدِ نظّارہ ہوئی تیز ہوا کے دم سے
دیکھ پائے نہ کہیں، پردہ گرائے نہ کہیں

آج تنہائی میں جو عہد کئے ہیں خود سے
دل بہت سادہ ہے، جا اس کو بتائے نہ کہیں

پھر وہی میں ہوں، وہی شہرِ خموشانِ خیال
پھر کوئی قبر سے باہر نکل آئے نہ کہیں

مجھ میں یہ کون ہے، اے حسرتِ تعمیرِ حیات
تو نے جو نقش بنائے ہیں مٹائے نہ کہیں

زہر جو سینے میں ہے اے خس و خاشاکِ نشاط
باہر آئے نہ کہیں، آگ لگائے نہ کہیں

دل کا دربان بنا بیٹھا ہوں اور دیکھتا ہوں
کوئی اُمّید، کوئی خواب در آئے نہ کہیں

سبز جنگل سے گزرتا ہوا ڈرتا ہوں ظفرؔ
پھر کوئی شاخ مجھے پاس بلائے نہ کہیں

خلیقؔ احمد خلیق

○

خورشید بن کے آؤ، کہ مہتاب کی طرح
آغوشِ دل بھی وا ہے یہاں باب کی طرح

کیا کیا توقعات ترے غم سے تھیں، مگر
اس نے بھی آنکھ پھیر لی احباب کی طرح

گردِ نگاہ بھی نہ ترے رُخ پہ جم سکی
دیکھا تو نے تجھے، پہ کسی خواب کی طرح

ہوگا وہ رنگ و بو کا سفینہ یہیں کہیں
چکرا رہا ہے دل مرا گرداب کی طرح

سب کچھ ہے میرے سامنے، کچھ بھی نہیں مگر
بیدار ہوں میں "دیدۂ بے خواب" کی طرح!

ہر لمحہ ایک تازہ تخیّل کی زد میں ہوں
حیراں ہوں میں بھی "آج کے مہتاب" کی طرح

دیوار و در میں ہے، کہیں محراب طاق میں!
عالم بدل رہا ہے کسی خواب کی طرح

اُف یہ مذاقِ زیست۔ کہ "میں" اور مرا خیال
تیغ آزما ہیں رستم و سہراب کی طرح

ملتے ہیں اہلِ ظرف ہی اب تو خلیقؔ سے
وہ تُند ہو گیا ہے مئے ناب کی طرح

گوہر ہوشیار پوری

○

پل میں دریاؤں کی صورت، پل میں خشک جزیروں سی
آنکھوں کی ساری باتیں ہیں پہنچے ہوئے فقیروں سی!

یادوں کے کُہرے میں ڈوبے، خوابوں میں مستور ہوئیں
کیا رنگوں سے نکھرے منظر، کیا شکلیں تصویروں سی

دُکھ کی دھول جمی دیکھی ہے پھول سے کِھلتے چہروں پہ
پائل کی جھنکار ہوئی ہے، اپنی ہی زنجیروں سی

مانگ میں تارے بھرلو ورنہ روشنیوں کو ترسو گے
ڈھلتی شام کے سایوں میں ہیں تیرگیاں تقدیروں سی

پھر نقطہ سا لہرایا اک دیر سے بند جھروکے میں
پھر کہنہ کاغذ پہ پھیلی اک تحریر لکیروں سی

ڈوب چلے سینوں میں دھڑکتے دل رہگیر نگاہوں کے
رستے گھائل کرتی جائے چال میں تیزی تیروں سی

جب بھی برف کے تودے پگھلے ماضی کے کہساروں سے
ذہن کی سطح پہ تیر گئیں شفّاف جبینیں ہیروں سی

○

افضل احسن

○

اب یہاں کس کے بھلا ساتھ چلا جائے ہے
ہر کوئی راہ میں دیوار بنا جائے ہے

زندگی ہاتھ میں پتھر لئے پھرتی ہے یہاں
کس سے شیشے کے گھروندے میں رہا جائے ہے

رات بھر میں یا تری یاد کے ظالم سائے
شام ہوتے ہی مرا رنگ اڑا جائے ہے

ایسا صحرا کہ نکلنے کو نہ دروازہ ملے
تیری چاہت میں مرا جسم جلا جائے ہے

کون احسان اٹھائے گا تری آنکھوں کے
کس سے ویران مکانوں میں بسا جائے ہے

روشنی تیز ہو تو آنکھ کہاں کھلتی ہے
مجھ سے کب تک ترے پہلو میں رہا جائے ہے

وقت نے کردئے دربند تو نکلوں کیسے
ورنہ کیا خانۂ ہستی میں جیا جائے ہے

آنکھ کہ بحر بھی پایاب ہے اس کے آگے
جسم کہ رنگ کا دریا سا بہا جائے ہے

دل کہ جو آگ کا طوفاں تھا کبھی، آج احسنؔ
ایک شعلہ ہے جو رہ رہ کے بجھا جائے ہے

ڈاکٹر وزیر آغا

نظم اور اُس کا پس منظر

جس طرح ہر فرد کی روح کی ایک اپنی شخصیت، صورت اور مزاج ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے الگ اور جُدا کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہر صنفِ ادب اپنی ہیئت، خوشبو اور مزاج کے باعث دوسری اصنافِ ادب سے علیٰحدہ نظر آتی ہے۔ پھر بات محض ہیئت اور مزاج تک ہی محدود نہیں۔ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ کسی صنفِ ادب کے پیکر کی تراش اور مزاج کی تشکیل کن اثرات کے تحت ہوئی۔ یعنی وہ کون سے سماجی، سیاسی اور ارضی محرکات تھے جو اس صنفِ ادب کی نمو میں ممد ثابت ہوئے۔ اس طریقِ کار کو اگر اختیار کیا جائے تو ہر صنفِ ادب کے ارضی اور روحانی پس منظر کی تفتیش ہو سکتی ہے۔ نظم کی مخصوص ہیئت، خوشبو اور مزاج کو سمجھنے کے لئے بھی اس قسم کی تحقیق کارآمد ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ایسا کیا جائے یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے صنفِ شعر کے بارے میں بعض بنیادی باتیں طے کر لی جائیں۔ اس لئے بھی کہ نظم بنیادی طور پر ایک صنفِ شعر ہے۔ اور جب تک ہم شعر کی تعریف، اس کی حدود کا تعین اور اس کے اثرات کا محاکمہ نہ کریں، نظم کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا یا نظم کے مزاج کو متعین کرنا مشکل ہوگا۔

شعر کیا ہے؟ ـــــ یعنی اس بات کے باوجود کہ شعر انہی الفاظ سے ترتیب پاتا ہے جو نثر کا بھی سرمایہ ہیں، یہ کیا بات ہے کہ شعر قاری کے لئے احساسات کو ایک پُراسرار طریق سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور نثر کی بہ نسبت کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اہلِ نظر کے ایک گروہ نے اس سلسلے میں لفظ کی اہمیت سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اصل چیز تو شعر کی روح ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ لفظ تو محض اس روح کو قاری تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اعلیٰ خیالات اور لطیف احساسات تو نثر میں بھی ادا ہو سکتے ہیں لیکن شعر میں لفظوں کی ایک خاص ترتیب سے جو داخلی اور خارجی آہنگ پیدا ہوتا ہے نثر میں ممکن نہیں اور اس لئے نثر کی بہ نسبت شعر کی تاثیر زیادہ ہے۔ دونوں طبقوں کے خیالات اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ اگرچہ حقیقت کے ادراک میں دونوں نے سچائی کا صرف ایک حد تک ساتھ دیا ہے۔ شعر کا تاثر محض اس کی روح یا محض اس کی ہیئت کا مرہونِ منت نہیں۔ بلکہ ان دونوں کے عجیب و غریب امتزاج اور آویزش سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ شعر میں خیال اور لفظ کا صحیح رشتہ کیا ہے، تو اس کی طرف ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے شعر کے سلسلے میں لفظ کی کارکردگی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ لفظ کیا ہے؟ زبانوں کی ارتقائی تاریخ یہ بات سمجھاتی ہے کہ آغازِ کار میں ہر لفظ ایک تصویر کا مماثل تھا۔ لیکن جیسے جیسے اظہارِ بیان کی ضرورتیں بڑھتی چلی گئیں، ان تصویروں کو مختصر کرنا ضروری ہو گیا تا آنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ تصویر کی جگہ محض ایک علامت نے لے لی۔ یہ لفظ کا آغاز تھا۔ پس لفظ اپنے آغاز میں ایک تصویر کو پیش کرتا تھا۔ اور اگرچہ زبانوں کے ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تصویریں اس درجہ بے شمار اور ان سے وابستہ احساسات و خیالات اس درجہ گنجلک اور پیچیدہ ہو گئے کہ لفظ اپنی مجرد حیثیت میں کسی خاص تصویر کا مماثل نہ رہ سکا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ آج بھی لفظ یا لفظوں کی ایک خاص ترتیب ان تصویروں ہی کو گرفت میں لینے کا اہتمام کرتی ہے جو ذہنِ انسانی میں منجمد ہیں۔ اس مقام پر ایک نہایت موزوں سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا انسان کا ذہن لفظوں میں سوچتا ہے؟ غور کیجئے تو آپ کہیں گے کہ ہرگز نہیں! ذہن کی دنیا میں الفاظ بے معنی ہیں۔ الفاظ تو ہم نے اپنی سماجی ضروریات اور ایک دوسرے سے ہم کلام ہونے کے لئے شعوری طور پر ترتیب دیئے ہیں۔ ذہن تو تصویروں کے ذریعے سوچتا ہے۔ خواب اس کی بہترین مثال ہے کہ ہر رات ہم واقعات و حادثات کو ایک فلم کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہماری ساری یادداشت تصویروں کی صورت ہی میں ذہن میں محفوظ ہے۔ لفظ کا کام یہ ہے کہ وہ ان تصویروں، خیالوں، یادداشتوں اور جو ان کے ساتھ

وابستہ احساسات کو بڑے پُراسرار طریق سے دوسروں تک پہنچانے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان نے اس مقام تک پہنچنے کے لئے بے حد ریاضت کی ہے اور لفظوں کی تعداد، تنوع اور نوکیلی کیفیت کے سلسلے میں خاص اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ جتنی کوئی زبان وسیع اور توانا ہوگی۔ اور اس کے الفاظ تعداد ہی میں نہیں۔ بلکہ اپنی لچک، قوت اور لطافت میں بھی زیادہ ہوں گے، وہ تصورات اور احساسات کو بہتر طریق سے دوسروں تک منتقل کرنے کے قابل ہوگی پس لفظ ایک طرح کا کچا مواد یا حربہ ہے۔ جو تصورات کے ابلاغ اور مطالب کی ترسیل کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ لفظ کوئی بیجان حربہ نہیں۔ بلکہ ہر لفظ کی ایک مجرد حیثیت بھی ہوتی ہے۔ اور وہ ایٹم کی برقی لہروں کی طرح متحرک اور سیماب پا ہوتا ہے۔ دوسرے ہر لفظ کا ایک احساسی حلقہ EMOTIONAL-FIELD بھی ہوتا ہے، جو ایک دائرہ نور کی طرح لفظ کو اپنے آغوش میں لئے ہوتا ہے، یہ احساسی حلقہ ترسیل مطالب کے دوران میں لفظ کے ساتھ ہی منتقل ہونے کی سعی کرتا۔ اور یوں اظہار و ابلاغ کے راستے میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ موسیقی میں احساسات و جذبات کا اظہار نسبتاً آسان ہے۔ کہ موسیقی لفظ کی بجائے سُر کے حربے کو استعمال کرتی ہے۔ اور سُر کے ساتھ کوئی تلازمۂ خیال وابستہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ موسیقی میں احساسات و جذبات کا مکمل ابلاغ ممکن ہے۔ مثلاً آپ دیکھئے کہ جب ستار سے کوئی لے ابھرتی ہے تو فی الواقعہ یہ لے کسی دل کی تہوں سے ابھرتی اور بغیر کسی رکاوٹ، لڑکھڑاہٹ یا حجاب کے ایک سیدھی لکیر پر چلتی ہوئی سامعین کے دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ لیکن شعر میں یہ بات نہیں۔ شعر میں تصورات اور خیالات کا ابلاغ الفاظ کے حربوں کا رہینِ منت ہے۔ اور ہر لفظ ایک زندہ، متحرک، سیماب پا ہستی ہے جو تصورات کو ایک سیدھی لکیر پر چلنے اور قاری تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بلکہ قدم قدم پر اصل کو مڑنے، بدلنے اور کیا سے کیا ہو جانے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس لئے فنون میں شاعری سب سے مشکل چیز ہے کہ یہ ابلاغ، اظہار کے لئے رنگ، سنگ یا سُر کی بجائے لفظ کے زندہ پیکر کو استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ شاعری میں کبھی ابلاغ سو فیصد نہیں ہوتا۔ تاہم چونکہ یہ ابلاغ ناقص حربوں کے باوجود ہوتا ہے۔ جس حد تک ہوتا ہے قوت، تنوع اور وسعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کا ذائقہ بھی بے پایاں اور لامحدود ہے۔ اور جو لوگ شعر سے تحصیلِ مسرت کے قابل ہیں، اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں۔

شعر کی دنیا میں تصورات اور محسوسات کو قاری تک منتقل کرنے کے عمل میں بھی لفظ کی کارکردگی اور طریق کار قابلِ غور ہے۔ یہ طریق کار مچھلی پکڑنے کے عمل سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ اس طرح کہ انسان کا اجتماعی لاشعور ایک بحرِ ذخار کی مانند ہے۔ جس کی وسعت اور گہرائی کی کوئی حد نہیں۔ اس بحرِ ذخار میں نہ صرف نسلِ انسانی کا سارا سرمایہ بعض علامتوں (ARCHETYPES) کی صورت میں محفوظ ہے۔ بلکہ یہ سمندر خیالات، تصورات اور تخلیقی عناصر کی بھی آماجگاہ ہے تشبیہ کو ذرا وسعت دیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے تجربات و حوادث اپنے قیمتی سرمائے کو ساتھ لئے ندیوں، نالوں اور دریاؤں کی صورت اس سمندر میں ازل سے گر رہے ہیں۔ اور ابد تک گرتے چلے جائیں گے۔ شاعر کا کام اجتماعی لاشعور کے اس سمندر سے خیالات، تصورات اور تخلیقی عناصر کو اپنی گرفت میں لینا ہے۔ لیکن وہ اس عمل میں کامیابی کے لئے کیا جتن کرے؟ اس مقام پر لفظ اُس کے کام آتا ہے۔ اور وہ لفظ کو BAIT کے طور پر ڈور کی مدد سے سمندر میں لٹکا دیتا ہے لفظ کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنی مخصوص لذت، آہنگ اور خوشبو کی مدد سے خیال کو اپنے ساتھ چپکا کر بالکل اسی طرح باہر لے آتا ہے۔ جیسے کانٹے کے ساتھ مچھلی باہر آجاتی ہے۔ لیکن اس تشبیہ کے کچھ اور پہلو بھی قابلِ غور ہیں۔ مثلاً یہ کہ تخلیقِ شعر کا سارا عمل دراصل غواصی کا عمل ہے اور ڈور جس قدر لمبی اور لفظ جس قدر لمبا، نوکیلا اور توانا ہوگا۔ اُسی نسبت سے وہ مچھلی کے نادر اور نایاب نمونوں کو گرفت میں لے سکے گا۔ پس شعر کی تخلیق میں غواصی کا عمل ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس غواصی کے سلسلے میں لفظ کی اہمیت مسلّم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دراصل فنکار یا شاعر کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اشیا کے مابین ایک ایسا ربط دریافت کرتا ہے جو اس سے قبل دریافت نہیں ہوا تھا۔ غواصی کا عمل بھی اسی لئے قابلِ قدر ہے کہ یہ سمندر کی سطح اور سمندر کی گہرائی کے درمیان آمد و رفت کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کرتا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر شاعر اس ربط کو دریافت کرتا ہے جو فرد کی خارجی زندگی اور اس کے اجتماعی لاشعور کے درمیان پہلے سے

قائم تھا۔ تشبیہ جو فن کی مختصر ترین صورت ہے۔ اس کی بہترین مثال قائم کرتی ہے کہ دراصل تشبیہ میں محض اس ربط کو اجاگر کیا جاتا ہے جو پہلے سے دو اشیا میں موجود تھا۔ لیکن جس کا احساس اس سے قبل کسی کو نہیں ہوا تھا۔ دریافت کا یہی عمل فنکار کی تخلیق ہے۔ مثلاً اگر برف کے گالوں کو کسی پیڑ کی گرتی ہوئی نورانی پتیوں سے تشبیہ دی جائے تو محسوس ہوگا کہ دراصل برف کے گالے بھی پہلے سے موجود تھے۔ اور پیڑ سے گرتی ہوئی پتیوں کا بھی ہر کسی نے مشاہدہ کیا تھا۔ لیکن شاعر نے چونکہ سب سے پہلے ان دونوں کے ربط کو محسوس کیا۔ اس لئے اس کا یہ عمل ایک شعری تخلیق قرار پایا۔ اور اس تخلیق نے ناظر کی جمالیاتی حس کو تسکین بہم پہنچانے کا قابلِ قدر فریضہ سرانجام دیا۔ بہر حال عواطف اور ربط کی دریافت کے اس عمل میں لفظ کی اہمیت سے انکار مشکل ہے کہ اس کے بغیر یہ تجربہ اور یہ دریافت مادی پیکر میں سامنے نہیں آ سکتی۔

اب اس مقام پر لفظ اور خیال کے رشتے کا تعین ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لفظ اور خیال کا وہی رشتہ ہے جو لباس اور جسم کا ہوتا ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ جسم تو لباس سے بے نیاز بھی رہ سکتا ہے دوسرے، لباس زیادہ سے زیادہ جسم کے نشیب و فراز کو واضح کر سکتا ہے۔ روح کا پیکر نہیں بن سکتا۔ دراصل لفظ اور خیال کا رشتہ لباس اور جسم کا رشتہ نہیں بلکہ جسم اور روح کا رشتہ ہے۔ جس طرح جسم کے بغیر روح اپنا اظہار نہیں کر سکتی۔ اور نہ کسی مادی پیکر میں ہی ڈھل سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح لفظ کے بغیر دونوں کے تعلق سے، خیال کا ابلاغ ناممکن ہے۔ اور نہ خیال کی کوئی مادی صورت ہی سامنے آ سکتی ہے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ روح جسم میں اس طرح چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ جیسے مثلاً ڈولے میں دلہن، بلکہ جسم کے ایک ایک عضو میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ اور جسم کو جہاں سے بھی چھوئیں روح کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ جسم کے عضو میں، روح کو قبول کرنے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے ورنہ روح اس عضو جسم میں داخل ہونے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہی حال لفظ کا ہے کہ یہ لفظ کے پیکر میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے۔ اور اس پیکر کو جہاں سے بھی چھوئیں، خیال کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ لیکن جسم کے بعض مفلوج حصوں کی طرح جن میں روح داخل ہونے سے انکار کر دیتی ہے۔ بعض مردہ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو خیال کے آہنگ اور خوشبو کو گرفت میں لینے کے قابل نہیں ہوتے۔ اور اسی لئے خیال کے ابلاغ میں کار آمد ثابت نہیں ہوتے۔ یہی حال ان روابط کا ہے جو پامال تشبیہوں اور استعاروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ ہر اچھا فنکار لفظوں کے استعمال میں اور تشبیہوں اور استعاروں کی تخلیق میں جدت سے کام لیتا ہے اور انہیں گھسی پٹی لفظی صورتوں (CLICHES) کے طور پر استعمال نہیں کرتا۔ دراصل اچھا فنکار دوسروں کی نظر سے ماحول کا جائزہ نہیں لیتا۔ بلکہ آنکھیں کھول کر خود ہر شے کو دیکھتا ہے۔ اس کی حالت اس سیاح کی سی ہے۔ جسے کسی نئے ملک میں داخل ہوتے ہی ایسے بہت سے مظاہر صاف نظر آ جاتے ہیں۔ جو عادت اور تکرار کے باعث اہلِ نظر کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ پھر چونکہ فنکار احساس اور خیال کی سرزمین کا ایک سیاح ہے۔ اس لئے اُسے نہ صرف نئے مظاہر فی الفور نظر آ جاتے ہیں۔ بلکہ وہ ان مظاہر اور ان مظاہر سے وابستہ تصورات اور محسوسات کو اپنی "زبان" اور اپنے "طریق" سے بیان کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اسی لئے لفظ کو ایک نئے اور نوکیلے انداز میں استعمال کرتا ہے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ فنی تخلیق میں خیال کی لطیف اور نرم صورت لفظ ہی کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اور اسی لئے جب کثرتِ استعمال سے لفظ یا لفظ سے مرتب شدہ تشبیہات و استعارات کے کنارے کُند ہو جاتے ہیں۔ اور یہ خیال کو جسم عطا کرنے کی بجائے محض ایک لباس عطا کرتے ہیں تو خیال کا ابلاغ ممکن نہیں ہوتا۔ اور فنی تخلیق وجود میں نہیں آ سکتی۔ خیال اور لفظ کے اس رشتے کو اے سی بریڈلے نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب آپ نظم کو تنقیدی یا تجزیاتی مطالعہ کے لئے نہیں۔ بلکہ محض اکتسابِ حظ کے لئے پڑھتے ہیں تو آپ کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس میں خیال اور پیکر دو مختلف چیزیں ہیں۔ دراصل خیال اور اس کا پیکر ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہو چکے ہیں کہ ان میں کوئی حدِ فاصل قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے۔ جیسے آپ کو کسی حسین سی مسکراہٹ کا سامنا ہو۔ اور آپ اس بات کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوں کہ چہرے کی کن لکیروں نے اس حسین مسکراہٹ کو جنم دیا ہے۔ فی الواقعہ یہ مسکراہٹ ان لکیروں کے بغیر جنم نہیں لے سکتی۔ اور مسکراہٹ کے بغیر یہ

لکیریں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ اگر پیدا ہوں تو مصنوعی، بے کیف اور بے معنی ہوں گی۔ لفظ اور خیال کے رشتے کا اس سے بہتر تعین اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہاں تک لفظ کی اہمیت اور خیال کے ربط باہم کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن ابھی شعر کی دنیا میں خیال کی اہمیت اور نوعیت کو اجاگر کرنا باقی ہے۔ یہ اس لئے کہ بیشتر اوقات ابلاغ ناقص نہیں ہوتا، اور خیال اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ لفظوں میں منتقل بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عظیم شاعری معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ شعر کی دنیا میں ابلاغ و اظہار کو کم حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ فی الواقعہ شعر کی تخلیق کے سلسلے میں ابلاغ و اظہار کی کامیابی کو ایک بنیاد قرار دے کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ شعر کے ضمن میں یہی پہلی شرط ہے۔ تاہم اگر ابلاغ کے باوجود شعر بلند نہیں تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ خیال اور معنی کی نوعیت ہی ارفع اور بلند نہیں۔ اس بات کو ذرا اور وضاحت سے بیان کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابلاغ و اظہار کا مسئلہ، ملکۂ خداداد کے علاوہ محنت اور ریاضت کا بھی دست نگر ہے لیکن خیال اور معنی کا مسئلہ قطعاً انسانی شخصیت اور روح سے متعلق ہے۔ اور اسی لئے شعوری کوشش سے اس میں رفعت اور عظمت پیدا نہیں ہو سکتی یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ اس کی روح یا بنیادی شخصیت تبدیل ہو جائے جب کہ یہ روح یا شخصیت اس کی شعوری کوشش یا دسترس سے قطعاً باہر ہے۔ کیا ہمیں اپنے جذبات پر اختیار ہے؟ یا ہم اپنے تصورات، محسوسات، زندگی کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے اور ایک خاص موقع پر ایک خاص قسم کے غیر شعوری ردِ عمل کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ بے شک شعوری کوشش سے ہم اپنی آرزوں، امیدوں اور طبعی رجحانات کو دبا لیتے ہیں۔ لیکن انہیں ختم نہیں کر سکتے اور یہ ہمیشہ اپنے اظہار کے لئے نئے نئے راستے اختیار کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال شاعر کو (اور شاعر انسان ہی تو ہے) اپنی شخصیت اور روح پر کوئی قابو نہیں۔ اس لئے جب وہ شعر میں ایمانداری اور خلوص سے اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے تو اس کی اصل ذات شعر میں منعکس ہوتی ہے۔ اور بس! اگر یہ شخصیت اعلےٰ، بلند اور توانا ہے اور اس سے وابستہ تصورات اور محسوسات متنوع، زندہ اور پائیدار ہیں۔ تو لا محالہ شعر میں خیال اور معنی کی سطح بھی بلند ہوگی۔ اور اگر شخصیت گھٹی ہوئی، پست اور "یک جہتی" (ONE SIDED) ہے تو لا محالہ شعر کی روح بھی گھٹی ہوئی اور پست ہوگی۔ بعض شعرا جن کے ہاں شخصیت کی گھٹن اور پستی موجود ہوتی ہے، لیکن جو شعر میں اس پست سطح کا اظہار نہیں کرنا چاہتے، اپنے لئے قطعاً شعوری طور پر عظیم اور اعلےٰ موضوعات منتخب کر لیتے اور پھر شعر میں ان پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نتیجہ معمولی قسم کی شاعری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شعر کی دنیا میں کسی قسم کی ریاکاری کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں خلوص کی کمی ہوگی، شعر خود اس کی غمازی کر دے گا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض عظیم شخصیتوں کے ہاں شعر میں عظیم مقاصد کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور چونکہ یہ مقاصد ان شعرا کی عظیم شخصیتوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور شعر میں ان کی نمو کسی شعوری عمل کے تابع نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی تاثیر بھی بے پایاں ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف جب بعض شعرا کسی سیاسی مسلک کے تحت یا محض نظریاتی تبلیغ کے لئے شعر کو آلۂ کار بناتے ہیں تو ان کی مساعی کا احساس قاری کو فی الفور ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایک ناگوار سے ردِ عمل کے ساتھ ایسی شاعری سے کنارہ کش ہو جاتا ہے ــــــ پس اگر شاعر کی شخصیت کو ایک کمرے کا بدل قرار دے دیا جائے تو پھر کمرے کا وجود براہِ راست اس کی شاعری پر اثر انداز ہوتا نظر آئے گا۔ کمرے (شخصیت) سے باہر کی زندگی کو دیکھنے کے کئی طریق ہیں۔ دروازے، کھڑکیاں، روشندان اور روزن ــ سب راستے موجود ہیں غور کرنے کی بات محض یہی نہیں کہ شاعر کی شخصیت میں باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لئے کس قدر کھڑکیاں، دروازے وغیرہ موجود ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ حقیقت کے ادراک میں ان میں سے کس شے کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اور پھر چونکہ شاعر کو نہ تو اپنی شخصیت کی تعمیر پر کوئی اختیار ہے اور نہ وہ اپنے اندازِ نظر پر ہی کوئی قابو رکھتا ہے۔ اس لئے شعر میں اس کے خیال کی بلندی اور پستی بھی قطعاً اس کے اختیار میں نہیں۔ اگر یہ بات اختیار یا صوابدید کے تابع ہوتی تو زمانے کو ایک عظیم شاعر کی آمد کے لئے سینکڑوں برس تک انتظار نہ کرنا پڑتا۔

شعر کی روح کو سمجھنے اور شعر کی حدود کو متعین کرنے کے بعد اب نظم کے مزاج کو پرکھنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ یہ اس لئے کہ جب ہم نظم کو بنیادی طور پر

پر ایک صنفِ شعر قرار دیتے ہیں۔ تو پھر قدرتی طور پر اس سے شعر کے بنیادی محاسن کے بھی متوقع ہوتے ہیں۔ اور یہ بات فرض کر لیتے ہیں کہ نظم صرف اس وقت نظم کہلانے کی مستحق ہے جب اس میں کوئی شعری کیفیت بیان ہوتی ہے۔ پھر چونکہ شعری کیفیت انکشافِ ذات کے عمل کے تابع ہے۔ نیز چونکہ اپنی مجرد حیثیت میں یہی کیفیت محض احساس اور تخیل کا بے محابا اظہار ہے۔ اس لئے جب نظم اپنے منبع سے دور ہٹ جاتی ہے۔ اور انکشافِ ذات کے عمل کی بجائے خارجی موضوعات کے بیان تک خود کو محدود کر لیتی ہے۔ تو اس فاصلے کی نسبت سے اس میں شعری کیفیات بھی رقیق DILUTE ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طویل نظموں میں خالص شعری حصہ بہت مختصر ہوتا ہے اور دراصل یہی حصہ نظم کو سہارا بھی دیتا ہے۔ باقی نظم کہانی کی مختلف کڑیوں کے ربط باہم کرداروں کی پیش کش اور واقعات کے بیان کے لئے وقف ہوتی ہے۔ اس میں حرج کوئی نہیں۔ لیکن دو باتیں پھر بھی قابلِ غور ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس قسم کی نظم میں خالص شعری کیفیت واقعہ اور کردار سے خود کو سہارا دیتی ہے۔ اور اس کے بغیر مشکل ہی سے زندہ رہ سکتی ہے فی الاصل شعری کیفیت کو خود اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیئے دوسری بات یہ ہے کہ آغازِ کار میں نثر سے کہیں پہلے شعر نے ترقی کی تھی۔ اور اس لئے شروع شروع میں شعر ہی بیشتر مقاصدِ ادب کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ افکار اور علوم بھی زیادہ تر صنفِ شعر ہی کا سہارا لیتے تھے۔ بعد ازاں جب نثر کو ترقی ملی تو اس نے آہستہ آہستہ اپنی حدود کو بڑھا کر ان تمام موضوعات کو اپنا لیا، جو عارضی طور پر نظم کے سپرد تھے۔ اور نظم سمٹ کر اپنے اس مقام تک آگئی جو دراصل اس کی "معطر تنہائی" کا مقام تھا۔ اور جہاں تک نثر ہزار کوشش کے باوجود پہنچ نہیں سکتی تھی یہ مقام خالص شعری کیفیت کے اظہار و بیان کا مقام تھا۔ اور اس کے لئے شعر کا آہنگ، مزاج اور سراپا ہی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آج جب ہم نظم کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد نظم کا وہ مخصوص پیکر ہے۔ جو انکشافِ ذات کے عمل کو جنبش میں لاتا۔ اور جذبے اور خیال کے چھپے ہوئے نوکدار پہلوؤں کو منظرِ عام پر لانے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ نظم کے مزاج کو پرکھنے اور اس کی حدود کو متعین کرنے سے پہلے اس بنیادی بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

نظم کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بحیثیتِ مجموعی نظم کو مغرب میں فروغ حاصل ہوا ہے۔ جب کہ غزل صرف "مشرق" کی پیداوار ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کو محض اتفاق پر محمول کر کے مسترد تو کیا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ہر صنفِ ادب نہ صرف شخصیت کا بے محابا اظہار ہے بلکہ اپنے ماحول، زندگی جغرافیائی حالات اور ان کے اثرات کو بھی پیش کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر صنفِ ادب دراصل اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کا مزاج اور پیکر اپنے ماحول کا دست نگر ہوتا ہے۔ پس اگر نظم نے مغرب (بالخصوص یورپ) میں مقبولیت حاصل کر لی اور شعری کیفیت کے اظہار کا بہترین وسیلہ قرار پائی تو یقیناً اس کے مزاج کو پرکھنے کے لئے مغرب کے مخصوص اندازِ نظر، فلسفہ، عمل، مزاج اور طریقِ کار کو سمجھنا ضروری ہے —— برِ عظیم یورپ میں بہت سے ممالک میں جو قدرتی رکاوٹوں مثلاً پہاڑ، دریا، سمندر وغیرہ کے باعث ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اور اسی لئے ان میں سے ہر ملک کا ایک اپنا کلچر ہے جو دوسرے ممالک کے کلچر سے علیحدہ نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جغرافیائی حالات نے ان میں سے ہر ملک کی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر فرد کی انفرادیت بھی نمایاں رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان ممالک میں ربط و مفاہمت میل جول اور آمیزش کی بجائے طویل تصادم، جنگ اور نظریاتی کشمکش ہمیشہ موجود رہی ہے اور جدید دور سے قبل یہاں تہذیب کا وہ عمل پورے طور سے منظرِ عام پر نہیں آیا۔ جو بعض مشرقی ممالک مثلاً ہندوستان میں بہت پہلے وجود میں آگیا تھا۔ کشمکش اور تصادم کی اس فضا نے فرد کے نوکیلے کناروں کو بھی قائم رکھا ہے۔ اور اسے مثالی نمونہ TYPE میں ڈھل جانے کی بجائے "کردار" کی صورت میں زندہ رکھا ہے۔ چنانچہ آج بھی مغرب نے انسان کے "نوکیلے کنارے" اسی طرح قائم ہیں اور اس کے ہاں مفاہمت میل جول، ضبط اور ایک دوسرے کے ساتھ "گزارہ" کرنے کا میلان بہت کمزور ہے۔ مغرب میں مشترکہ خاندان کا عدم وجود مختصر خاندان میں وابستگی اور اشتراک کی کمی اور فرد کے ہاں اپنی ذات، اپنی انفرادیت اور اپنی "انا" کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کا میلان براہِ راست اس تصادم اور کشمکش کی

پیداوار ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مغرب میں قدرتی وسائل کی کمی رہتی ہے۔ یہاں کی زمین زیادہ زرخیز نہیں اور نہ موسمی حالات ایسے ہیں کہ قدرتی طور پر اشیاء کی فراوانی ہو۔ چنانچہ مغرب کے انسان کو زندہ رہنے کے لئے کشمکشِ حیات کے عمل سے گزرنا پڑا ہے۔ اور اُسے زمین سے اناج حاصل کرنے، فطری عناصر سے نبرد آزما ہونے بلکہ زندہ رہنے کے لئے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔ جہد للبقا کا ایک قدرتی نتیجہ خود غرضی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے فرد نے اپنی ذات کے تحفظ کو دوسری تمام اشیاء پر مقدم جانا ہے۔ اور اسی لئے اس کے کردار کے نوکیلے کنارے بھی قائم رہتے ہیں پھر اشیاء کی عدم فراوانی کا ایک نتیجہ جذبۂ سیاحت کی صورت میں بھی نمودار ہوا ہے۔ اور مغرب کے انسان نے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے سمندروں کو عبور کر کے دوسرے ممالک دریافت کئے اور اپنے ہاں قدرتی وسائل کی کمی یا اشیاء کی درآمد سے پورا کرنے کی سعی کی۔ اس عمل نے بہت حد تک اس کے ہاں تصادم اور کشمکش کے عمل کو مہمیز لگائی۔ اور اس کے خود غرضانہ جذبات کو تحریک دے کر اس کے کردار کی انفرادیت کو بھی تقویت دی۔ ضروری بات ان تمام اعمال کا نچوڑ ہے۔ یعنی جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے، اپنے کلچر، ملک اور ذات کا تحفظ کرنے نیز زمین کے ہر ذرے اور ہر درخت اور ہر پتے کو اپنی بقا کے لئے استعمال کرنے کے رجحان نے مغرب میں فکر کے تحلیلی طریق کار INDUCTIVE METHD کو تحریک دی ہے۔ اور فرد نے اشیاء کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے "ثابت حقیقت" کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے اور تجزیئے اور تحلیل سے ان کی اندرونی تہوں تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ تقسیم، تجزیئے اور تحلیل کے اس رجحان کو جو ہر پا ٹکڑے کے تجزیاتی مطالعہ سے حقیقت کے ادراک کی طرف ایک قدم ہے، مغرب میں بہت فروغ حاصل ہوا ہے اور آج وہاں سائنس، طب، حیاتیات، فلسفہ، نفسیات اور دوسرے علوم کی حیرت انگیز ترقی اسی تحلیلی طریق کار کی رہین منت ہے۔

مغرب میں کردار کی "انفرادیت" کردار اور ماحول کا طویل تصادم (جو خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر نظر آتا ہے) اور اشیاء کی ماہیت کو پرکھنے کے لئے تحلیلی اندازِ نظر کا فروغ —— یہ تمام باتیں ارتفاع پا کر نظم کی صورت میں نمودار ہوئی ہیں۔ دراصل شاعر نے نظم کو اپنے جذبات اور محسوسات کی تہہ در تہہ کیفیات کے اظہار کے لئے وقف کر لیا ہے۔ چنانچہ نظم میں جو ایک خاص فرد کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے اور تجربے کی انفرادیت پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز ہوئی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ خود نظم کا خالق اُس ماحول سے وابستہ تھا جس میں جہد للبقا کے زیر اثر انفرادیت، خود غرضی، اشیاء سے شدید وابستگی اور اشیاء کی ماہیت کو دریافت کرنے کا رجحان بہت قوی تھا۔ چنانچہ نظم میں ایک ایسی انفرادیت، ایک ایسا تجزیاتی عمل موجود ہے جو غزل میں موجود نہیں۔ غزل سے مس ہوتے ہی شاعر کا ... ردِ عمل اور شخصی تاثر ایک عمومی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس میں گہرائی اور گیرائی کی بجائے وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا باعث غزل کا وہ مخصوص مزاج ہے جو نظم ہی کی طرح اپنے مخصوص ماحول سے تشکیل پذیر ہوا ہے چنانچہ نظم کے مزاج کو سمجھنے کے لئے غزل کے مزاج سے اس کا موازنہ ضروری ہے۔

غزل مشرق کی پیداوار ہے۔ بالخصوص ان مشرقی ممالک کی جہاں زمین کی وسعت آسمان کی وسعت سے ہم کنار ہے۔ ان ممالک میں سرسبز و شاداب حدِ نظر تک پھیلے ہوئے صحرا، زرخیز میدان اور گھنے جنگل ہیں۔ اور جدید دور سے قبل ان ممالک میں اشیائے خوردنی کی فراوانی فطرت کی فراخدلی کا ایک قدرتی نتیجہ تھی۔ پھر ان ممالک کی وسعت اور کشادگی نے تصادم اور کشمکش کی بجائے مفاہمت اور میل جول کو نسبتاً زیادہ تحریک دی۔ بے شک ان ممالک کو وقتاً فوقتاً خونخوار حملہ آوروں نے تاراج کیا۔ تاہم ان حملوں کے طویل درمیانی وقفے بالعموم سکون و عافیت، رواداری اور تہذیبی ارتقا کے زمانے تھے۔ اور ان میں رہتے ہوئے افراد کے نوکیلے کنارے بیضوی صورت اختیار کر گئے تھے۔ پھر چونکہ فرد کو زندہ رہنے کے لئے کسی خاص تگ و دو کی ضرورت نہیں تھی، نیز موسمی اور جغرافیائی حالات نے اس کی نظر میں بھی کشادگی اور وسعت پیدا کر دی تھی۔ اس لئے اُس کے ہاں حقیقت کے ادراک کے لئے استقرائی طریق فکر

(DEDUCTIVE REASONING) اختیار کیا گیا۔ اور تجزیے اور تحلیل کی بجائے الہام اور فکر کی جہت سے ادراکِ حقیقت کا طریق رائج ہو گیا۔ مشرق
سبب، صوفیانہ تصورات اور روایات کے فروغ کا باعث بھی یہی تھا۔ بالخصوص "ہمہ اوست" اور "ہمہ ازوست" کے تصورات ایسے ماحول کا لازمی نتیجہ تھے جس
میں کشادگی، وسعت اور ذہنی اور سماجی ارتقا کے زیادہ امکانات موجود تھے۔ چنانچہ استقرائی طریقِ کار نے شاعری میں اس صنفِ ادب کو جنم دیا۔ جسے ہم آج غزل
کے نام سے جانتے ہیں۔ نظم کے پیکر کی حقیقت اس کی اکائی ہوتی ہے۔ اور نظم کا ہر مصرعہ اپنی مجرد حیثیت سے محروم، محض ایک مرکزی خیال کی تعمیر میں صرف
ہوتا ہے۔ لیکن غزل متعدد بکھرے ہوئے اشعار کا مجموعہ ہے۔ اور غزل کا ہر شعر غزل کے پیکر سے اسی طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ جیسے درخت جنگل سے یا فرد
سماج سے۔ پھر غزل کا شعر نظم کی طرح کسی مخصوص تجربے کا تجزیاتی اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ جذبے اور تجربے کی عمومی صورت کو معرضِ وجود میں لاتا ہے۔ مشرقی
ممالک میں تہذیب کے ارتقا نے فرد کو سماج میں ضم کر دیا تھا۔ اور فرد اپنے مخصوص تجربے کے اظہار پر اپنے اور سماج کے اجتماعی تجربے کے اظہار کو فوقیت
دیتا تھا۔ چنانچہ غزل میں فرد کا مخصوص تجربہ بھی اجتماعی اور عمومی صورت اختیار کر گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ گویا جذبہ تہذیب سے مملو ہو کر ہموار، کشادہ
اور ہمہ گیر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں نظم فرد کی ذات کا آئینہ ہے۔ وہاں غزل ایک پورے دور کی کروٹوں اور ذہنی تحریکوں کی عکاسی کرتی ہے۔ غزل کا
مطالعہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک دور میں غزل کے موضوعات تمام شعرا کے ہاں تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ ان موضوعات
کی نوعیت بھی عام طور پر عمومی اور اجتماعی ہوتی ہے۔ جیسے مثلاً صوفیانہ تصورات، دردمندی اور آوارہ خرامی کا رجحان، زاہد پر چوٹ اور جدید دور میں رہبر اور رہزن
اور منزل کے تصورات غزل کے پیکر میں برقی رو کی طرح دوڑتے ہیں۔ اور ان کی عمومی حیثیت کو بڑی آسانی سے گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ محبوب کے ضمن میں
بھی غزل کا مخصوص ردِ عمل اسی عمومیت کا بیّن ثبوت ہے۔ نظم کی محبوبہ ایک ایسی گوشت پوست کی ہستی ہے جس کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ اور جس نے
شاعر کے محسوسات کو اپنے شخصی وجود سے متاثر کیا ہے۔ چنانچہ نظم کا شاعر جب اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے تو اس میں تجربے کی ساری کسک اور شخصی ردِ عمل کی ساری
تندہی اور وحشت سمٹ آتی ہے۔ اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی یہ محبوبہ ایک ایسی ہستی ہے جو اپنے مخصوص خدوخال، شخصیت اور کردار کے ساتھ پہلی بار
ہم سے متعارف ہوئی ہے۔ غزل میں بات اس کے برعکس ہے۔ غزل کی محبوبہ ایک "عمومی ہستی" ہے اور غزل کے کسی ایک دور میں تقریباً تمام غزل گو شعرا کے
ہاں محبوبہ کے ایک سے خدوخال اور ایک سے اوصاف اور محاسن ابھرتے ہیں۔ مثلاً ایک وقت تھا جب محبوبہ بادشاہ کے لئے علامت کے طور پر ابھری تھی
اور اس کے سراپا میں بادشاہ کی خونخواری، خوشامد پسندی، احساسِ برتری اور بے نیازی کے "اوصاف" جمع ہو گئے تھے۔ پھر جب معاشرے میں بادشاہ
کی جگہ طوائف نے لے لی تو غزل کی محبوبہ میں بھی طوائف کی ساری صفات سمٹ آئیں۔ اور اس نے ہرجائی پن، تحبب اور تصنع کا پوری طرح مظاہرہ کیا
بہرحال یہ بات طے ہے کہ غزل کے ان پہلوؤں کا اشیا، احساسات اور تخیلات توازن اور تہذیب سے مملو ہو کر ایک عمومی اور اجتماعی کیفیت میں ڈھل
جاتے ہیں جب کہ نظم میں اشیا، احساسات اور تخیلات کی نوکیلی کیفیت اپنی ساری نفاست کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ جناب کلیم الدین احمد صاحب نے
غزل کو ایک نیم وحشی صنفِ سخن قرار دے کر غزل کے اس مزاج سے ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ فی الاصل غزل تو اس معاشرے کی پیداوار ہے جس
میں تہذیب، میل جول اور مفاہمت اپنے پورے عروج پر ہے۔ اور جہاں سماج کا اشتراکِ باہم خاندانی نظم و ربط اور نظریاتی ہم آہنگی کی اساس پر استوار
ہے۔ اور اس لئے غزل اپنے مزاج، موضوع اور طریقِ کار کے لحاظ سے فرد کی بجائے سماج کے اجتماعی فکر کی عکاسی ہے۔ فی الواقعہ اگر "نیم وحشی صنفِ سخن" کی
ترکیب استعمال ہی کرنی ہے۔ تو اسے نظم کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ کہ نظم فرد کی شخصیت کا اظہار ہے اور جبلت کی تندی اور لاشعور کی گہرائی سے
براہِ راست متعلق ہے۔ لیکن میں نیم وحشی صنفِ سخن کی ترکیب کا استعمال ذم کے طور پر نہیں کر رہا ــــ جذبہ ہمیشہ نیم وحشی ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی عیب کی بات
نہیں۔ جب کوئی صنفِ سخن اس نیم وحشی جذبے کو اس کی شدت اور انفرادیت کے ساتھ لفظوں میں منتقل کرتی ہے تو دراصل زندگی کی عام سطح اور اجتماعی

لاشعور کی گہرائیوں کے درمیان ایک ایسا ربط پیدا کرتی ہے جو کسی اور صنفِ ادب کے بس کا روگ نہیں۔ نظم کی اہمیت کا اصل باعث یہی ہے۔

نظم اور غزل کے اس فرق کو ایک مثال سے واضح کریں تو بات شاید آئینہ ہو جائے۔ فرض کیجئے کہ آپ ایک بھرے بازار میں سے گذرتے ہیں۔ اور بازار کی گہماگہمی، تصادم، تحرک اور اشیاء کی چکاچوند اور فراوانی کا ایک مجموعی تصور آپ کے ذہن کے نقش پر ابھرتا ہے۔ یہ غزل کا طریق کار ہے۔ اب فرض کیجئے کہ آپ بازار میں آتے ہیں۔ اور پھر ایک دکان میں گھس جاتے ہیں، پھر آپ دکان کی کوئی الماری کھلواتے ہیں۔ اس الماری میں سے ایک ڈبہ نکالتے ہیں۔ اور پھر ڈبے میں سے کوئی چمکتا ہوا موتی نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیتے اور اس کی چکاچوند، حسن اور نفاست میں یکسر کھو جاتے ہیں تو آپ کا یہ عمل نظم کا عمل ہے دوسرے لفظوں میں غزل کے پیشِ نظر وسعت اور کشادگی ہے۔ لیکن نظم گہرائی، عمق اور تہ خانے سے متعلق ہے۔ حرکت دونوں میں ہے لیکن حرکت کی اطراف مختلف ہیں ——— بحیثیتِ مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ نظم ایک کہانی بیان کرتی ہے۔ کبھی یہ کہانی آپ بیتی کا روپ دھارتی ہے اور کبھی جگ بیتی کا۔ قدیم اردو نظم نے زیادہ تر جگ بیتی کی صورت اختیار کی ہے۔ اور اسی لئے اس میں شاعر کی اپنی ذات پورے طور سے منعکس نہیں ہوتی۔ لیکن جدید نظم آپ بیتی کے اظہار کی طرف مائل ہے اور اسی سے اس میں ایک انوکھی قوت اور انفرادیت نظر آتی ہے ——— یہی نہیں بلکہ اس نے اب فرد کی عام زندگی سے کہیں زیادہ اس کے باطن کے مدھر نغمے کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے برعکس غزل کہانی بیان نہیں کرتی بلکہ اشیاء اور واقعات سے ایک مجموعی تاثر قبول کر کے پیش کر دیتی ہے۔ چنانچہ غزل میں زمان و مکاں کی حدود ظاہر نہیں ہوتے باتیں مثلاً یہی دیکھئے کہ اشیاء، نام، مقامات وغیرہ جو نظم کے منفرد تجربے کو زمان و مکان کی حدود میں جکڑ کر پیش کرتے ہیں، غزل سے غائب ہیں اور غزل محض نقوش تک خود کو محدود رکھتی ہے۔ غزل میں منتشر جھلکیاں پیش ہوتی ہیں جب کہ نظم ایک ایک رنگ، کیفیت اور تجربے کا تجزیہ پیش کرتی اور تاثر کو زمان و مکان کا لبادہ پہنا کر پیش کرتی ہے۔ چنانچہ نظم مجموعی طور پر فرد اور اس کے باطن کی ایک کہانی ہے جب کہ غزل ذہن کے چند ٹیلے پر سے گزرتے ہوئے کارواں کو دیکھتے چلے جانے کا ایک زاویہ ہے ——— تاہم اگرچہ غزل زیادہ تر اجتماعی قدروں کو حرزِ جان بناتی ہے لیکن یہ باطن کی رمق سے بے نیاز نہیں رہتی۔ اس لئے یہ واحد صنفِ سخن ہے جو داخل اور خارج کی صراطِ مستقیم پر اپنے توازن کو قائم رکھتی ہے۔ جس طرح کلچر کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کو جب فروغ حاصل ہوتا ہے اور ان کا فیض تہذیب کی صورت اختیار کر کے عوام کے وسیع تر حلقے تک پہنچ جاتا ہے تو قدرتی طور پر یہ قدریں انحطاط پذیر اور زوال پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جب شعر کی وہ مدھر الاپ جو دراصل باطن کا تحفہ ہے، انبوہ اور عوام کے گونجتے اور تھرکتے ہوئے گیتوں کی صورت اختیار کرتی ہے تو اس کا جادو ایک بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے اور فن کے زینے پر اس کا مقام بلند نہیں رہتا۔ لیکن غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس نے مدھر الاپ اور گونجتے ہوئے گیت کے نقطۂ انضمام پر جنم لیا ہے اور اسی لئے اس میں فرد کے داخلی تجربے اور سماج کے اجتماعی تجربے میں مفاہمت کا احساس ہوتا ہے۔ بے شک اس کا پلڑا اجتماعی تجربے کی طرف واضح طور پر جھکا ہوا ہے تاہم یہ انفرادیت کی خوشبو سے بیگانہ نہیں ہے۔ فن میں یہ ایک نہایت مشکل مقام ہے اور اس تک پہنچنا کوئی معمولی بات نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غزل کے صرف چند شعر ہی اس معیار پر پورے اترے ہیں اور عظیم غزل گو شعراء کے ہزاروں لاکھوں اشعار میں سے صرف چند شعر ہی عظمت اور رفعت کے حامل قرار پائے ہیں۔ دوسری طرف نظم شخصیت کا والہانہ اظہار ہے اور یہ شخصیت سماجی اور سیاسی انقلابوں کے باوجود قائم رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شخصیت کے پسِ پشت اجتماعی لاشعور کا وہ بحرِ زخار بھی ہے جس میں نسلِ انسانی کا سارا ذہنی اور جذباتی سرمایہ سمٹا ہوا ہے۔ نظم اسی بحرِ زخار کی تخلیق ہے اور اسی سے قوت اور نکھار حاصل کرتی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی غزل سماج اور سماج کی اجتماعی قدروں کی آئینہ دار ہے لیکن نظم شخصیت اور روح کو پیش کرتی ہے۔ سماج بدلتا ہے اور ہر آن بدل رہا ہے۔ لیکن شخصیت اور روح کی بنیادیں بہت گہری ہیں۔ غزل کو اس لئے آج ایک خطرے کا سامنا ہے۔ اور نظم اسی لئے آج انکشاف اور دریافت کی ایک نئی سرزمین پر اپنا قدم رکھ رہی ہے۔

شادؔ امرتسری

تعبیر

ایک دن دیوتاؤں کے دربار میں ہم گئے
دیوداسی کے پاؤں ہمیں دیکھ کر تھم گئے
گھنگھروؤں کی چھنکتی ہوئی راگنی رُک گئی
دیوداسی کی پتلی لچکتی کمر جُھک گئی
چنگ و مردنگ کی دھیمی دھیمی صدا سو گئی
بانسری کی مدھر تان جانے کہاں کھو گئی
دیکھتے دیکھتے چند پرچھائیاں رہ گئیں
اور پھر یک بیک نور کی ندیاں بہہ گئیں
دور آکاش پر دودھیا بدلیاں چھا گئیں
چاندنی میں نہائی ہوئی داسیاں آ گئیں
موتیوں کے مُکٹ سر پہ رکھے ہوئے دیوتا
سو رہے تھے مگر یک بیک جاگ اٹھے دیوتا

رابندر ناتھ ٹیگور ــــ عبدالعزیز خالدؔ

گُلِ نغمہ

مجھے بیکار دنوں میں اکثر
وقت غفلت میں گنوا دینے کا افسوس ہوا
یہ مگر بھول تھی میری، یا رب!
وقت ہوتا نہیں برباد کبھی
میری اس عمرِ گریزاں کے سرشتے کا امیں
ہے ترا دستِ یمیں!

جذب ہو کر دلِ ہر چیز میں تو
تخم کے رنگ میں کرتا ہے نمو
تیرے ہی دم سے چٹکتی ہے کلی، پھول سے پھل بنتا ہے۔

اپنے بستر پہ میں تھک کر لیٹا
تو مجھے وہم ہوا، کام تمام
ہو چکا بند، ہر اک چیز ہے محوِ آرام
صبح بیدار ہوا تو دیکھا
آمد آمد ہے بغیچے میں نئے پھولوں کی!

ساری دنیا میں جو پھیلا ہے وہ ہے دردِ فراق

ہے اسی کے فیض سے
آسماں بر دِ مخطّط کی طرح
زرنگار و تابناک!

ہے یہی دردِ فراق
جھانکتا رہتا ہے شب بھر جو بک وتنہا دمات
تارے تارے کی نگاہِ خامش و مرموز سے!

ہے یہی نغمہ، لچکتی ڈالیوں
سرسراتے پات کا
جب سنکتی ہے ہوا
بھیگے ساون کے اندھیرے صحن میں!

ہے یہی پُرسوز، عالمگیر درد
باعثِ رخسارِ زرد و آہِ سرد
ہے اسی کے دم سے آباداں جہانِ رنگ و بُو
میلے گلیوں کے، گھروں کی ہا و ہُو

ہے یہی بہتے دلِ شاعر سے بنتا زندہ رود
چشمۂ آہنگ و ایقاع و سرود!

حمایت علی شاعر

پتّھر

یہ ایک پتّھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اِسے محبّت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اِسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

○

خوف

سہمی سہمی کھل رہی تھی اِک کلی
میں نے پوچھا۔ کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں، اِک دن خزاں تو آئے گی
کیا ہوا —؟ بالکل نہیں — سورج؟ نہیں
پھر؟... سُنا ہے..... اُس نے چپکے سے کہا
اُس چمن کا باغباں گُلچیں بھی ہے!

خاطر غزنوی

دو نظمیں

بھید :

کسی نے ننھی لکیروں کا جال سا بُن کر
بنا دیا خطِ تنسیخ سا لفافے پر
اگرچہ بھید کئے دل کے سر بمہر، مگر
جو آبگینہ بھرم کا تھا پاش پاش ہوا
شریر عطر کی چیخوں سے راز فاش ہوا

سنگھم :

آج فطرت پھر نظر آئی سجیلے روپ میں
جیسے ذرّے جاگ اُٹھتے ہیں سنہری دھوپ میں

پھر جنوں کے دیپ یوں انگڑائیاں لینے لگے
جیسے کوئی ناؤ طوفانوں میں بھی کھینے لگے

آج فطرت اور جنوں کی منزلیں ٹکرائیں گی
دو چراغوں کی لویں آپس میں گھل مل جائیں گی

عمر فیضی

رباعیات

قدغن کوئی رنگ پر لگائی نہ گئی
بیڑی آواز کو پہنائی نہ گئی
گُل تک ہی رہا دستِ ہوس آلودہ
خوشبو گلدان میں سجائی نہ گئی

○

سینے میں یہ کیسا داغ سا روشن ہے؟
پہلو میں یہ کیا ایاغ سا روشن ہے
کس چاند کی جستجو میں سرگرداں ہوں؟
ہر نقشِ قدم چراغ سا روشن ہے

○

آشفتہ و سرگراں پھرو گے ہر سو
با دیدۂ خوں فشاں پھرو گے ہر سُو
جُز خار کسے سایۂ گُل راس آیا؟
خوشبو ہو تو سرگراں پھرو گے ہر سُو

○

اُس کوچۂ پُرفسوں کا افسانہ کہو
اُس منزلِ بے سکوں کا افسانہ کہو
شاید دلِ گُم گشتہ کہیں یاد آجائے!
مجھ سے مرے جنوں کا افسانہ کہو

مجید امجد

مشاہیر

کیا لوگ تھے ، جن کی گردن پر
تلوار چلی! — اک سرد تڑپ
— اک خون میں لتھڑی ہوئی کروٹ
اور وقت کے سیمیں دھارے پر
اک سطر لہو کی چھوڑ گئے !

○

اچھّے تھے وہ جن کو، سُولی کی
رسّی سے لٹک کر ، نیند آئی،
اِک تیز کھٹک ! اک سرد تڑپ
اور وقت کی دُکھتی چیخوں میں
اِک شَبد کی شکتی چھوڑ گئے

○

مٹّی بھی اَب اُن ساوَنتوں کی
ان کھوتے ہوتے کھنڈروں میں نہیں
اِک سَطر لہو کی، کانپتی ہے۔!
اِک شَبد کی شکتی ڈولتی ہے!

تاریخ کی گلتی پُستک پر
اِک نام کا دھبّا باقی ہے!

○

کیا کُچھ نہ مِلا، اُن جیالوں کو
شعلوں پہ قدم رکھنے میں سکوں!
جینے کے لئے، مرنے کی لگن!
اے وائے وہ، جلتی روحیں، جنہیں
ہر درد مِلا، منزل نہ ملی!

○

کل اُن کی زِرہ پوش آرزوئیں،
جس آگ کی رَو میں بہتی ہوئیں
نیزوں کی انی پر ناچ گئیں،
وہ آگ، تمہاری دنیا ہے،
وہ آگ، تمہارے پاؤں کٹے
جنتوں کی لٹکتی جنّت ہے!

○

اِس اگنی سے، اِس جینے جگوں
کی کھلتی ہوئی پھلواڑی سے،
دو چار دہکتے پھول چنو،
اتنا ہی سہی، اتنا تو کرو،
تاریخ کی گلتی پُستک پہ
اِک نام کا دھبّا ہو کہ نہ ہو

عرش صدیقی

لیلائے فن کے نام

میں نے تیرے روپ کی خاطر گوندھے تشبیہوں کے ہار
تیرے نام کی لَو کو میں نے پہنائے شعروں کے تاج
تیری مانگ میں مَیں نے ڈالا تاروں کا اُجلا سیندور
جس کے نورِ رواں کے آگے کاہکشاں کو آئے لاج

دیوی تیری زلف کو سمجھا خوابوں کا روپہلا جال
اور ترے ہونٹوں کو جانا لال گلاب کے تازہ پھول
تیرے نام گذرگاہوں پہ اپنے خون سے سینچی دُوب
اور اپنے بالوں میں ڈالی روز ترے قدموں کی دھول

دل کے ساگر سے میں لایا جذبوں کے موتی انمول
سر سے خیال کی لڑیاں لے کر سہرے پروتے کتنی بار
جیون امرت یوں ٹپکایا جیسے نازک گھاس پہ اوس
اور ترے ماتھے پہ سجاتے جگمگ کرتے یہ سب ہار

زرنگار رنگ قبائیں میں نے تیرے جسم کو پہنائیں
اپنے بدن کا جی ترسایا ڈال کے اس پر اُلجھے تار
خونِ جگر کے اشک بناتے اور دُھلائے تیرے ہاتھ
نینوں کی سب جوت تجھے دی تاکہ سجے تیرا گھر بار

تیرا داس بنا پر تو نے بھیک نہ دی مجھ کو اک بار
پھر بھی آشا ساتھ ہے کھوئے بیٹھا ہوں ہر دے کا دوار

ڈاکٹر وحید اختر

کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

یہ عہدِ پُرآشوب کہ جو ہم کو ملا ہے　　اس بانیِ بیداد کا انداز نیا ہے
دن نکلے تو معلوم ہو، دل ڈوب رہا ہے　　شام آئے تو بُجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفس عمرِ عذابِ دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پہ گراں ہے

ہے قافلۂ وقت، رواں سیلِ فنا کا　　اُڑتے ہوئے لمحات کا رُکتا نہیں ریلا
اُمّید کا اک لمحہ بھی ہے خوابِ ندیدہ　　ڈھونڈو تو نشانِ کفِ پا بھی نہیں ملتا
اس راہ میں ہر موڑ کمیں گاہِ اجل ہے
جو پاؤں ہے مجروح ہے، جو ہاتھ ہے شل ہے

اک سمت یہ پروازِ ترقی ہے بشر کی　　ہے قبضۂ قدرت میں عناں شمس و قمر کی
افلاک میں ہے دھوم زمیں زادِ نظر کی　　منّت نہیں درکار دعاؤں کو اثر کی
ہر عقدۂ دشوارِ جہاں کھلنے لگا ہے
خورشید بھی ہم وزنِ خزف تُلنے لگا ہے

اور دوسری جانب ہیں غمِ زیست کے سائے　　اندیشۂ جاں سے نہ یہاں نیند بھی آئے
اس آگ کے طوفاں میں کوئی چین نہ پائے　　آنکھوں کے لئے خواب بھی اپنے ہیں پرائے
ذرّے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا
پرساں نہیں کوئی دلِ انساں کی تڑپ کا

انساں ہے انساں کی صحبت سے گریزاں　　نے پاسِ مروّت کا ہے، نے عشق پہ ایماں

اخلاص کے پھولوں سے بھی خوشبو ہے پرافشاں ہر نقشِ تعلق کا ہے خود آپ سے نالاں
اسرارِ زماں اور مکاں کے تو ہیں روشن
کھلتا نہیں کون اپنا ہے اور کون ہے دشمن

دل محض ہے اک آلۂ خوں فیضِ مشیں سے احساس کا رشتہ ہے نہ ماں سے نہ زمیں سے
دنیا سے تعلق، نہ علاقہ کوئی دیں سے ہے علم کا سینہ بھی تہی سوزِ یقیں سے
ہیں جسم کہ مرغوب بھٹکتے ہیں ہوائیں
ہیں ذہن کہ بے فیض بھٹکتے ہیں خلائیں

ہے شعبدۂ مکر فنِ اہلِ سیاست بک جاتی ہے لٹ جاتی ہے افکار کی عصمت
ممنوع ہے، معتوب ہے ذہنوں کی دیانت ممدوح ہے، مرغوب ہے، ایماں کی تجارت
یہ طرزِ ستم وقت نے ایجاد کیا ہے
ویران ہیں گھر، روضوں کو آباد کیا ہے

گر کوئی کرے عظمتِ انساں کا سبق یاد آوارہ وطن اور وہ ہے خانماں برباد
ہے فکرِ معاش اس کے لئے روز کی بیداد آئینِ فقیہانِ ہوس کرتا ہے ارشاد
تقدیسِ محبت کا بھی ذکر آنے نہ پائے
یہ شمع تہِ دامنِ فکر آنے نہ پائے

بیدار نگاہوں پہ ہے نظاروں کی قدغن حسّاس دلوں کے لئے ہر بات ہے الجھن
تابندہ دماغوں میں ہیں افکار کے مدفن فرخندہ جبینوں کا ہر اک سنگ ہے دشمن
اے بے ہنری! پاؤں اماں جاں کی تو بولوں؟
میزانِ مژہ پہ غمِ کونین کو تولوں؟
بازارِ زر و سیم میں کھولی ہے وہ دکاں جس جنس کی قیمت نہیں جز نالۂ حیراں
در در پہ گیا ہے کے میں شمعِ دلِ سوزاں ہے کون خریدارِ دُرِ اشکِ غریباں؟

جو آنکھ بھی چھلکے وہ مرا دیدۂ تر ہے
جو قلب ہو صد چاک، مرا لختِ جگر ہے

اس طور سے مضمونِ سخن جمع کیا ہے		ہر دامنِ گُل بن کے صبا میں نے سیا ہے
شبنم میں تھا جو زہر کرن بن کے پیا ہے		ہر ایک صدف کو دُرِ نایاب دیا ہے
تب فن نے بھی یوں میری مسیحائی ہے مانی
گر لفظ کو چھولوں تو پکار اُٹھیں معانی

اک عمر میں عقدہ یہ کھلا طبعِ رواں پر		سودائے سخن کی ہے بنا صرفِ زباں پر
نغمہ جو کوئی چھیڑیں تو بندش ہے زباں پر		دانش کے گہر رولیں تو بن جاتی ہے جاں پہ
پتھر سے جو سر پھوڑیں تو نغمات کا خوں ہو
سورج سے اگر رشتہ ہو، ذرات کا خوں ہو

اک عمر سے ہوں موردِ بیداریٔ جاں کاہ		جھپکی بھی ہو گر آنکھ تو شاہد ہے خود اللہ
اس دشتِ سیہ بخت میں سایہ نہ کہیں چاہ		بچھڑے ہوئے خوابوں کو جو ڈھونڈوں تو نہیں راہ
بے مونسِ دل شام بلا کاٹ رہا ہوں
تنہائی کی سفاک سزا کاٹ رہا ہوں

جو خواب بھی دیکھا وہ پریشاں نظر آیا		اپنا جسے جانا، وہ گریزاں نظر آیا
جس باغ کو سینچا وہی ویراں نظر آیا		پوچھا جسے وہ چاک گریباں نظر آیا
جو ہے ستمِ دہر سے فریاد بلب ہے
کلیوں سے سببِ چاکِ جیب کا جو پوچھیں تو غضب ہے

شمعِ سرِ رہ بن کے میں صدیوں سے ہوں بیدار		انداز سے ہر موجِ ہوا کے ہوں خبردار
ان آنکھوں نے دیکھی ہے زمانے کی بھی رفتار		محفوظ تصوّر میں ہیں ہر عہد کے آثار
آدم ہوں سفر میرا ازل تا ابد ہے
عیسیٰ ہوں، مرا گھر ہے، پتہ ہے نہ لحد ہے

تاریخ کے ہر صفحے پہ ٹوٹا ہے نیا قہر بن باس مِلے رام کو، گوتم کو غمِ دہر
عیسیٰ کو مِلے دار تو سقراط پیئے زہر پیاسا پسرِ ساقیِ کوثر ہو لبِ نہر
مہتابِ شبِ چار دہم چاندنی مانگے
چوکھٹ پہ اندھیروں کی سحر روشنی مانگے

خسرو کا محل دولتِ شیریں سے غنی ہو فرہاد کے تیشے کو غمِ خود شکنی ہو
جو شخص سرافراز ہے گردن زدنی ہو بوئے گُلِ تر وقفِ غریب الوطنی ہو
کانٹے تو لہو پی کے ہوں سیراب و سرافراز
شاہینِ فلک سیر ہو صیدِ غمِ پرواز

ہر عہد میں بوجہل ہے صاحبِ دولت پائی ہے تہی ذہنوں نے وسعت پہ حکومت
اندھوں ہی کو مانا گیا اربابِ بصیرت کم ظرفوں سے منسوب ہے حاتم کی سخاوت
کیوں اس کو جفا کاریِ دُنیا نہ کہیں ہم
جلّادوں کے آگے ہیں، نبیوں کے بھی سر خم

آزادیِ اظہار ہے قید نہیں ہے جو لب ہے حق آگاہ وہ خورسند نہیں ہے
سُن لے کوئی، امید یہ ہرچند نہیں ہے پھر بھی تو زبانِ شہدا بند نہیں ہے
کٹ جائے زباں، ہر بُنِ مو بول رہا ہے
سر تن سے جدا ہے تو لہو بول رہا ہے

کس منہ سے کہیں ہم کہ غلط بخش ہے فطرت کافی ہے ہمارے لئے افکار کی دولت
ہے روشنیِ ذہن ہی شاعر کی وراثت ہیں کون و مکاں اپنے، اگر دل میں ہے وسعت
بادہ طلبی شوق کی دریوزہ گری ہے
صد شکر کہ تقدیر ہی یاں تشنہ لبی ہے

عباس اطہر

میں اب بھی ننگا ہوں

میں اب بھی ننگا ہوں
کیا ہوا میرے سر کے بال اتنے بڑھ چکے ہیں
کہ مجھ کو پیڑوں سے گرتے پتوں سے جسم کو چھپانے کی بات بھی اجنبی لگے گی
کہ میں پہاڑوں، سمندروں، جنگلوں، ہواؤں کے سر پہ پاؤں
دھرے ہوئے اشو مدھ رچانے کی سوچ میں ہوں
یہ اور قصہ ہے میری بستی میں گیہوں کے زرد خوشے کم ہو گئے ہیں
آنکھوں کو انت لیکن نہیں ملا ہے۔

گھٹائیں، سورج، ہوائیں، شاہیں، دوپہریں دنیا — عجب کہانی
دو رویہ سانسوں کی راہگذر کے
کہیں گلابوں کے ڈھیر مہکیں
کہیں اداسی کی آگ، غم کے نکیلے کانٹے
مگر یہ دنیا کہ جادو جو سر پہ چڑھ کے بولے

○

یہ رنگتیں، یہ ہوائیں
شاید تمہاری تقدیر میں نہیں

آج ہم تمہیں موت کی اندھیری گپھاؤں میں پھینکنے لگے ہیں
کہ تم ابھی تک بدن کے زنداں میں قید ہو
جب نکل کے آجاؤ گے
ہمارے سروں میں سوچوں کی دھول، پاؤں میں ایک زنجیر اور ہوگی۔

○

ہمارے جسموں میں زرد سائے اتر چکے ہیں۔
ہمارے گھر میں تمہارے سواگت کو دھان، گیہوں، نہ شہد
چادر — کہ سر چھپائیں تو پاؤں ننگے

○

دوپہر جانے لگی ہے، آئے گی شام، مہکیں گے راستے
گوریاں بدن میں کھِلے ہوئے ریشمی لباسوں میں تن کے
خوشبو بکھیرنے آئیں گی
تمہیں کیا کہ تم ابھی تک بدن کے زنداں میں قید ہو
اور میری بستی میں گیہوں کے زرد خوشے کم ہو گئے ہیں
آنکھوں کو انت لیکن نہیں ملا ہے۔
میں اب بھی ننگا ہوں،

جلیل حشمی

نوحہ

ہر گمنام سپاہی کا

تم تو یہ کہہ کے آئے تھے ـــــ امّی نہ رو
لوٹ آؤں گا میں!
تم تو یہ کہہ کے آئے تھے ـــــ یوں مت کہو
لوٹ آؤں گا میں!
تم تو یہ کہہ کے آئے تھے ـــــ مُنّے ہنسو
لوٹ آؤں گا میں!
ماں نہ رو، پگلی یوں مت کہو، پیار دو
لوٹ آؤں گا میں پھوٹتی صبح کو!!

○

کر رہے ہو یہاں بَن میں کیا، کچھ کہو
لوٹتے کیوں نہیں
کٹ چکی رات بھی، ہو گئی صبح تو
لوٹتے کیوں نہیں
چھوڑ کر گھر کا آنگن یہاں سوئے ہو
لوٹتے کیوں نہیں؟!

○

ایک ماں ایک پگلی کو، اک پھول کو
دھوکا دے کر تم آئے تھے، اب جاگ اُٹھو

○

جاگ اُٹھو بھی، مرے ہاتھ میں ہاتھ دو
اجنبی مت بنو
میرے زانو سے انگڑائی لے کر اُٹھو
اجنبی مت بنو
کس سے روٹھے ہو تم پیارے موہن کہو!
اجنبی مت کہو
اُٹھو اتنا کہو ـــــ چاند اک پیار دو
لوٹ آیا ہوں، یوں مت کہو، ماں نہ رو!!

○

اکرم افگار

گیت

آری سکھی تورے مہندی رچاؤں
چندا سے ماتھے پہ بندیا لگاؤں
آری سکھی.....

نینوں میں ایسا جادو جگا دوں، سپنوں کی رانی بنا دوں
آنچل پہ جھلمل تارے سجا کے، گھونگھٹ میں چندا چھپا دوں
آشا کے مندر میں دیپک جلاؤں
آری سکھی......

آئیں گے سیاں تھامیں گے بیاں، جاگے گی بچپن کی پریت
تجھ بن سہیلی، میں رہ کر اکیلی، گاؤں گی برہا کے گیت
برہا کے گیتوں میں چاہت جگاؤں
آری سکھی......

بابل کے انگنا، بالم کا ڈیرا، دیکھے نہ سانجھ سویرا
جوبن کی مایا سکھی لوٹن آیا، اک البیلا لٹیرا.....
آ تو رے اُس کے نگر چھوڑ آؤں
جا ری سکھی......

بلراج کومل

شہرِ ویراں

اُس کھنڈر کے قریں
گوشۂ بے زباں کو جہاں چومتی ہے یہ بوڑھی زمیں
آج آئیں گے پامال
رنگیں بہاروں سے بچھڑے ہوئے
سب رفیقانِ غم
آتشِ نغمۂ گل جلے گی وہاں
مسکرائے گی اور خون روئے گی مجبور شمع زباں

شہرِ ویراں میں ہم
اجنبی تو نہیں
ہم بھی رنگیں بہاروں سے بچھڑے ہوئے
بے اماں لوگ ہیں
بے زباں لوگ ہیں

آج ہم بھی چلیں
اس کھنڈر کے قریں
ہمدموں سے ملیں
گوشۂ بے زباں کا فسانہ سُنیں
اور ساغر بکف
آتشِ جذبۂ بے کراں میں جلیں

ڈاکٹر وزیر آغا

اجنبی

اُون اُتری بھیڑ کے مانند پیڑ
مُنہ چڑاتی، دِل دُکھاتی چوٹیاں
دُور نیچے پتھروں کی سیج پہ
سر پٹختی، چیختی ندّی رواں

○

آسماں پہ مردہ بادل خیمہ زن
قہقہوں سے رعد کے ناآشنا
مہر جیسے کوئی مجبورِ ازل
ایک میلے جال میں اُلجھا ہوا

○

ملگجی سی روشنی میں ایک پیڑ
کانپتی اُنگلی سے مجھ پر خندہ زن
آسماں پر دائرے کے رُوپ میں
چیختے، روتے ہوئے بھوکے پرند
دم بدم غوطہ لگاتے میری اور
دم بدم مجھ پہ جھپٹتے مردہ خور!

شہریار

افسونِ امروز

ابھی صبحِ فردا کے قصّے نہ چھیڑو
ابھی دشتِ امروز میں خاک اُڑتی ہے
بھٹکے ہوئے قافلوں کی
ابھی آنکھ جھپکی نہیں فاصلوں کی
ابھی خیمۂ خواب، ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں سے
بچائے ہے خود کو
ابھی روح کو جسم کے غار میں کوئی کھٹکا نہیں
ابھی دل دھڑکتا ہے آنکھیں ہیں روشن
ابھی صبحِ فردا کے قصّے نہ چھیڑو!!

خلیل الرحمٰن اعظمی

شام

خوبصورت شام کہتی ہے کہ آؤ اب چلیں
چل کے اُن رستوں پہ ڈھونڈیں اپنی کچھ پرچھائیاں
کل جہاں چھوڑا تھا ہم نے رنگ و بو کا کارواں

چل کے پہچانیں کہ ان میں اپنی قبریں کون ہیں
اس خرابے میں پڑے ہیں جا بجا مٹی کے ڈھیر
جن کی قسمت کو نہ راس آیا دنوں کا ہیر پھیر

کتنی شامیں میں نے رو رو کر گزاری ہیں یہاں
کر چکا ہوں بارہا آکر یہاں پر خودکشی
یہ زمیں میرا لہو پی کر بھی ویسی ہی رہی

پھر کہیں یہ شام بھی جائے نہ اپنی رائگاں
آج چل کر اپنے قدموں سے یہ قبریں روند دیں
شاید اب کی فصل میں اس خاک سے پودے اُگیں

احسن احمد اشکؔ

میں مگر چُپ ہی رہا

شاہراہوں پہ کبھی شہر کی ہر شام ڈھلے
ہاتھ میں ہاتھ دئے دونوں پھرا کرتے تھے
دوستوں نے اسے بدنام کیا
مجھ پہ اوباشی کا الزام دیا
میں مگر چپ ہی رہا

اور پھر ایک قیامت آئی
جل گیا چاند کا روشن چہرا
میں بھٹکتا رہا تنہا تنہا
بند دروازوں نے کچھ بھی نہ کہا
لوگ ہمدردیاں کچھ اپنی جتانے آئے
اس بہانے مجھے غم اپنا سنانے آئے
میں مگر چپ ہی رہا

دیکھتے دیکھتے دس سال یونہی بیت گئے
اجنبی شہر میں اک رات یکایک اس سے
ایک کوٹھے پہ ملاقات ہوئی
ہاتھ میں ہاتھ لئے اس نے بہت کچھ پوچھا
میں مگر چپ ہی رہا

شاذ تمکنت

لذّتِ سنگ

رات سنسان ہو، زرد زرد چاندنی
سبز شیشوں سے چھن چھن کے آتی رہے
اوس کی آنچ سے پتیاں جل اٹھیں
نرم کہرے کی ضو جھلملاتی رہے
ایک چپ کا سماں ہو زمیں تا زماں
خامشی لوریاں سی سناتی رہے
ایسی ہی رات ہو ان کہی بات ہو
چاند ہو، زرد کرنوں کی برسات ہو
میں بچھڑ جاؤں تم سے بہ عذرِ سفر
طاق پہ شمع آنسو بہاتی رہے

راہ چلتے سفر میں اگر شب پڑے
آسماں نیلگوں سائباں تان دے
صبح سورج جگا دے کرن بھیج کر
لکۂ ابرِ آوارہ سایہ کرے
جھیل کا جھل جھلاتا ہوا آئنہ
مجھ کو یاد اپنا چہرہ دلاتا رہے
میں وہی ہوں جسے راس آتی نہیں
قربِ پابندگی، وصلِ آسودگی
جو تجھے چھوڑ کر چل پڑا ہو کہیں
جس نے سوچا نہیں تنگ ہے یہ زمیں

○

اور میں اجنبی دشت و در میں پھروں
کوئی مجھ سے نہ پوچھے کہ میں کون ہوں
پاؤں کی گرد کہہ دے مسافر ہوں میں
ایک تصویر ہوں، ایک پتھر ہوں میں

○

دن مہینوں میں تبدیل ہو جائیں گے
جب کڑی دھوپ کے تشنہ لمحات میں
سائے چھتنار پیڑوں کے کھو جائیں گے
رفتہ رفتہ مجھے یاد آؤ گی تم!

○

سوزنِ خار سے پاؤں کے آبلے
پھُوٹ کر خونِ تازہ میں نہلائیں گے
آ پڑیں گے جراحت کے جب مرحلے
رفتہ رفتہ مجھے یاد آؤ گی تم!

○

جب سرِ شام میداں سُلگنے لگے
اُڑکے طائر چلیں آشیاں کی طرف
چہچہاتے ہوئے پَر بہ پَر صف بہ صف
گونجتی، گنگناتی ہوئی ڈار سے
پیچھے رہ جائے تھک کر پرندہ کوئی
دُور چمکے اکیلا ستارہ کوئی
رفتہ رفتہ مجھے یاد آؤ گی تم!

○

دن مہینوں میں تبدیل ہو جائیں گے
جانے میں کس طرح یاد آؤں تمہیں
یہ نہ ہو کونے کونے رلاؤں تمہیں
جب بھی بالوں میں کنگھی اُلجھ جائے گی
جب بھی آنکھوں کو کاجل سے خوف آئے گا
بات ہم جولیوں کی بھی بُرمائے گی

میں تسلّی کے مانند یاد آؤں گا

○

کوئی ہم راز، چنچل حسینہ تمہیں
دے گی آواز جب، نام کو توڑ کر
تم کسی شمع طوفاں زدہ کی طرح
اپنے آنسو چھپا لو گی مُنہ موڑ کر
میں گھٹا بن کے آنکھوں پہ چھا جاؤں گا

○

یوں بھی ہو گا کہ بوندوں کی رُت میں کبھی
مینہ برسنے سے پہلے کی آندھی چلے
گھر کے رہ جاؤ تم گوشۂ کنج میں
کنکری سی کوئی آنکھ میں جا پڑے
اور میں بے سبب یاد آؤں تمہیں
ریزۂ خاک بن کر رلاؤں تمہیں

○

اَدھ پکے پھل ٹپک جائیں گے پیڑ سے
بور جھڑ جائے گا، اکھوے کُمھلائیں گے
شاخ جھولے کی از خود چٹخ جائے گی
پیچ رسّی کے برکھا میں جل جائیں گے
اَبر کے صفحۂ سُرمگیں پر تمہیں

میرے لکھے ہوئے گیت یاد آئیں گے
دن مہینوں میں تبدیل ہو جائیں گے

○

یوں بھی محسوس ہوگا تمہیں پچھلی شب
میرے نقشِ قدم چل رہے ہیں کہیں
کوئی پرچھائیں سی سنگِ دہلیز پر
کانپتا ہاتھ زنجیرِ در کے قریں
دن مہینوں میں تبدیل ہو جائیں گے

○

اور آئے گی پھر وہ سہانی سحر
میں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا
چارسُو جیسے اعجاز آرائی ہے
گیندا چھپائی ہوئی عرصۂ خواب کی
بن کے تعبیرِ بیدار لوٹ آئی ہے

○

میں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا
جیسے گونجی ہوئی کوئی آواز تھا
لب سے نکلا مگر راز ہی راز تھا

○

میں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا
جیسے بادل کا دل سوئے دریا چلے
جیسے گوکل میں بنسی کا لہرا چلے
دُھن میں قامت کی جس طرح سایا چلے
موج آواز دے اور کنارا چلے
میں تمہاری طرف یوں پلٹ آؤں گا

○

جانِ شاعر تصوّر کا یہ شہر بھی
سر بسر لطف ہے، سر بسر قہر بھی
کچھ خبر ہے تمہیں اے بہشتِ نظر
یہ محبت کبھی عادت سی کیوں بن گئی
یہ وفا کا چلن جیسے بیگار ہے
دلبری بھی مروّت سی کیوں بن گئی
لذّتِ قُرب و دیدار و گفتار بھی
ایک بے کیف راحت سی کیوں بن گئی
کوئی پرخاش ترکِ وزود شب سے نہیں
زندگانی اطاعت سی کیوں بن گئی
سوچتا ہوں یہی بنتِ شمس و قمر
میں بچھڑ جاؤں تم سے بہ عذرِ سفر
طاق پر شمع آنسو بہاتی رہے،

○

منظر سلیم

دل کی موت

رات پھر دل نے بڑے پیار سے، چپکے سے کہا
زندگی خوابوں کی چاہت میں گنوادی تم نے
ہر خوشی درد کی وادی میں لٹا دی تم نے
ورنہ شاید یہ حقائق کی کٹھن زنجیریں
پاؤں سے یوں نہ لپٹتیں کہ ٹھہر جاتے تم۔
ورنہ شاید غم و آلام کی یہ شمشیریں۔
ذہن پہ ایسے نہ منڈلاتیں کہ گھبراتے تم

○

اور بھی لوگ تھے اس دور میں خوابوں کے رفیق
وہ خرد والے جنہیں راہِ جنوں راس آئی
جن کے ارمانوں کی کھیتی نہ کبھی مرجھائی
سب جسے صحرا سمجھتے تھے وہاں بھی ان کو
زلف کی چھاؤں ملی، پیار کے میخانے ملے
موجِ مے بن کے ملی ریگِ رواں بھی ان کو
دار و زنداں کی جگہ حُسن کے کاشانے ملے

○

نشۂ عشرتِ امروز سے بوجھل آنکھیں
پھول کی طرح سے شاداب، جھلکتے چہرے
بادۂ ناب کی گرمی سے دمکتے چہرے
وسعتِ ذہن پہ آوارہ، سکوں کے بادل
ساغرِ دل سے چھلکتی ہوئی صہبائے حیات
مسکراتی ہوئی نظروں میں مسرت کی چمک
گنگناتے ہوئے ہونٹوں پہ غمِ دہر کی بات

اور اک تم ہو مری جاں کہ تمہیں کچھ نہ ملا
تلخ حالات کی، افکار کی دلدل کے سوا
بے یقینی کے سوا، کربِ مسلسل کے سوا
کچھ خیالات ملے جن سے ٹپکتا ہے لہو
جن سے ماحول کے افلاس کی بو آتی ہے
کچھ شعور اور کچھ احساس ملا جس کے طفیل
زندگی اور بھی دشوار ہوئی جاتی ہے

○

دورِ محرومی کے تاریک، گھنے جنگل میں
ہر تمنائے سحر لٹتی چلی جاتی ہے۔
دولتِ فکر و نظر لٹتی چلی جاتی ہے
ہائے وہ سرد، وہ خاموش و فسردہ لمحے
جب تمہیں حسنِ تکلم بھی برا لگتا ہے۔
پیار کی بات پہ بھی طنز کا ہوتا ہے گماں
اپنے بچے کا تبسم بھی برا لگتا ہے۔

ذہن کے زخموں کو تم پھول کہو، کچھ بھی کہو
یہ اگر بڑھتے رہے یونہی تو جانے کیا ہو
تیر پہ تیر لگے یونہی تو جانے کیا ہو۔
جانے کس راہ پہ لے جائے تمہیں ظلمتِ غم
جانے منزل کا تصور بھی کہاں کھو جائے
جانے کب خوابِ مسرت کا یہ دیرینہ چراغ
اپنی بے نوری سے اکتا کے فنا ہو جائے

○

رات پھر دل نے بڑے پیار سے چپکے سے کہا
کیوں نہ ان خوابوں کی لاشوں کو کہیں پھینک آئیں
کیوں نہ جینے کی نئی راہ کوئی اپنائیں
زندگی کانٹوں کو خون دیتے ہی گزری اب تک
کیوں نہ کچھ پھول کھلانے کی بھی تدبیر کریں
کیوں نہ پابندِ خرد کر لیں جنوں کو ہم بھی
کیوں نہ ممکن ہو تو کچھ روز سکوں سے جی لیں

سید صفدر حسین

مسدود راستے

ہم نشیں یاں کو نہ چل سامنے آئے گا نظر
وہی ایواں کہ جہاں کھائے ہیں الفت نے فریب
اُس کے دروازوں پہ استادہ ہیں گمبھیر درخت
پاسباں ملکۂ افرنگ کے در پر جیسے
کھڑکھڑاتے ہوئے پتوں میں بہ آہنگِ نقیب
دُور باش! آتی ہے آواز سماعت میں مری
راستہ کاٹتے ہیں میرا پُر اسرار پرند
ملک الموت کسی رُوح پہ جیسے منڈلائے
مرے احساس نے کھائے ہیں جو توہین کے داغ
متصل آتی ہے کچھ بوئے حقارت مجھ کو

خیر، مرضی جو یہی ہے تری چل مجھ کو کیا
میں بھی اک سجدۂ شکرانہ ادا کر لوں گا
اک نظر ڈال کے اس رنگ محل کی جانب
مرے جذبات کی تطہیر ہی ہو جائے گی
لے وہ آ پہنچا درِ دوست، ذرا مجھ کو سنبھال
دھڑکنیں دل کی مرے تیز ہوئی جاتی ہیں
ڈگمگاتے ہیں قدم، سانس اکھڑتا ہے مرا
سنسناتی ہے مری روح، نظر بس میں نہیں

میں نہ بے ربطیٔ انفاس! یا اس سمت بڑھوں
جس طرف حُسن پہ الزام ہے، تعزیریں ہیں
اس طرح میری نگاہوں سے چھپاتے ہیں انہیں
جیسے دیوانے کو ہو جاہ دکھانے سے گریز
جس طرف میز پہ رکھا ہوا ہے برق کا لیمپ
وہ دریچے میں نظر آتا ہے اک عکسِ جمیل
لے وہ بڑھنے لگا سایہ، وہ جھکا آنکھ کی نظر
مری قسمت کا ستارا وہ لب بام آیا
ہم نفس، دوست، مرے بھائی مجھے چھوڑ ہمیں
وہ نگہ منتظرِ دید نظر آتی ہے
چہرہ کمھلایا ہوا یاد مجھے کرتا ہے
سسکیوں کی مرے کانوں میں صدا آتی ہے
حُسن پہ آج بھی ہے جبرِ رسومات کہن
عشق رہ جاتا ہے کھوئے ہوئے خالی آغوش
عصرِ حاضر میں بھی افلاس و امارت میں ہے فرق
آج بھی نسل و عقائد کی حدیں قائم ہیں
آج بھی بنتے ہیں ناکامیٔ الفت کا سبب
اقربا کی کہیں ضد اور کہیں عزت کا فریب

اب بھی ناشائستہ ارماں نہیں عشرت کی امید
آج بھی ہے وہی دنیا کا ہم ناک مزاج

فارغ بخاری

یادوں کا افسوں

اجنبی دیس کی مٹی سے اُگائے ہوئے پھول!
اتنا مانوس نظر آتا ہے جیسے برسوں
اسی گلزار میں ہم رنگ رہا ہوں تیرا
مل کے ہم چہکے ہیں، مسکائے ہیں، لہرائے ہیں
ایک ہی ساز پہ نغماتِ جنوں گائے ہیں
موسمِ گُل نے کبھی آکے کیا شاد ہمیں
کر دیا فصلِ خزاں نے کبھی برباد ہمیں

جانے پھر بات ہوئی کیا کہ کبھی مل نہ سکے
لہلہائے نہ کبھی، ہنس نہ سکے، کھِل نہ سکے
کبھی شب بھر نہ چڑھائے مئے شبنم کے سبو
کبھی مل کر نہ گلستاں میں لٹائی خوشبو

اب اچانک جو تجھے دیکھا تو محسوس ہوا
میں کسی دَور میں ہم رنگ رہا ہوں تیرا

سلیم طاہر

بازگشت

پھر انہیں مست نگاہوں کا فسوں یاد آیا
مجھ سے بیگانہ سا ہے جن کا ہر اک جام ابھی
جن میں کھو جانے کی ہے آرزوِ خام ابھی
دل کبھی جن کے تصوّر سے جواں رہتا تھا
جن کے خوابوں کا فسوں، نورفشاں رہتا تھا
پھر انہیں مست نگاہوں کا فسوں یاد آیا
آج دل پر انہیں خوابوں کا فسوں پھر چھایا
زندگی جن میں کبھی کھوئی ہوئی رہتی تھی
آرزو جن میں سدا سوئی ہوئی رہتی تھی
جن کے آغوش میں پلتی تھیں تمنائیں کبھی
شوق پرسایہ گُداں جن کی تھیں پرچھائیں کبھی
آج دل پر انہیں خوابوں کا فسوں پھر چھایا
وقت گزرا ہوا شاید وہی پھر لوٹ آیا
دفن تھے جس میں محبت کے سنہری لمحے
جن میں آسودۂ راحت تھے وفا کے سپنے
اور مری زیست کو تھا زیست بتایا جس نے
مر کے جینے کا مجھے راز بتایا جس نے
وقت گزرا ہوا شاید وہی پھر لوٹ آیا

شبیر افضل جعفری

رانجھا

میں اَن دیکھی ہیر کا رانجھا — شرمیلی دلگیر کا رانجھا
نور بھری چنبیلی جیسی — گوری بنتِ شیر کا رانجھا
متوالی لچ پال بھنوؤں کی — چمکیلی شمشیر کا رانجھا
رسیلی گیلی مست نظر کے — راج دُلارے تیر کا رانجھا
سدا سہاگن کاہکشاں کی — موہن مانگ لکیر کا رانجھا
زلفوں کی لیلیٰ کا مجنوں — چہرے کے "چن پیر" کا رانجھا
گھور گھٹاؤں کی بوچھاڑیں ... — بہتے دیسے رت نیر کا رانجھا
چھاگن رات کے سنگیتوں کی — میٹھی کھانڈ اور کھیر کا رانجھا

عصمت کی سسّی کا پنّوں
خوشبودار ضمیر کا رانجھا

○

عصمت چغتائی

ہندستان چھوڑدو

"صاب مرگیا۔" جینت رام نے بازار سے سودے کے ساتھ یہ خبر لاکر دی۔

"صاحب! کون سا صاحب؟"

"وہ کانڑیا صاب تھا نا ـــ"

"اوہ کانا صاحب۔ جیکسن ـ بے چارا ـــ" میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کائی لگی پرانی جگہ جگہ سے کھنڈی بتیسی کی طرح منہدم ہوتی ہوئی دیوار کے اُس پار ادھڑے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر سلکھو بائی بیر بہارستے بیٹھی مراٹھی زبان میں بین کر رہی تھی۔ اس کے پاس ٹیپو اکڑوں بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ٹیپو یعنی پیٹر کالے گورے میل کا نادر نمونہ تھا۔ اس کی آنکھیں جیکسن صاحب کی طرح نیلی اور بال بھورے تھے۔ رنگ گندمی تھا جو دھوپ میں جل کر بالکل تانبے جیسا ہو گیا تھا۔

اسی کھڑکی میں سے میں برسوں سے اس عجیب و غریب خاندان کو دیکھتی آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر میری جیکسن سے پہلی مرتبہ بات چیت شروع ہوئی تھی۔

سن بیالیس کا "ہندوستان چھوڑدو" کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ گرانٹ روڈ سے دادر تک کا سفر ملک کی بے چینی کا ایک مختصر مگر جاندار نمونہ ثابت ہوا تھا۔ منگٹن روڈ کے ناکے پر ایک بڑا سا الاؤ جل رہا تھا جس میں راہ چلتوں کی ٹائیاں ہیٹ اور کبھی موڈ آجاتا تو پتلونیں اتار کر جلائی جا رہی تھیں۔ یعنی کچھ بچکانا سی مگر دلچسپ تھا۔ لچھے دار ٹائیاں نئے طرح دار ہیٹ، استری کی ہوئی پتلونیں بڑی بے دردی سے آگ میں جھونکی جا رہی تھیں۔ پھٹے چیتھڑے پہنے آتش باز نئے نئے کپڑوں کو نہایت بے تکلفی سے آگ میں جھونک رہے تھے۔ ایک لمحے کو بھی تو کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آ رہا تھا کہ نئی گیبرڈین کی پتلون کو آگ کے منہ میں جھونکنے کے بجائے اپنی ننگی سیاہ ٹانگوں پر ہی چڑھا لے۔

اتنے میں ملٹری ٹرک آگئی تھی جس میں سے لال بھبوکا تھوتھنیوں والے گورے ہاتھوں میں مشین گنیں سنبھالے دھما دھم کودنے لگے۔ مجمع ایک دم پھر سے نہ جانے کہاں اُڑ گیا تھا۔ میں نے یہ تماشا میونسپل دفتر کے محفوظ احاطے سے دیکھا تھا اور مشین گنیں دیکھ کر میں جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گئی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں بھی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بمبئی سنٹرل سے جب ریل چلی تھی تو ڈبے کی آٹھ سیٹوں میں سے صرف تین سلامت تھیں۔ لوئر پریل تک وہ تینوں بھی اکھیڑ کر کھڑکیوں سے باہر پھینک دی گئیں اور میں راستہ بھر کھڑی دادر آئی۔ مجھے ان چھوکروں پہ قطعی کوئی غصہ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ ساری ریلیں، یہ ٹائیاں، پتلونیں ہماری نہیں دشمن کی ہیں۔ ان کے ساتھ ہم دشمن کو بھی بھون رہے ہیں۔ اٹھا کر پھینک رہے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ ٹریفک روکنے کے لئے ایک پیڑ کا لمبا سا گدّا سڑک پر لمبا لمبا ڈال کر اس پہ

کوڑے کرکٹ کی اچھی خاصی دیوار کھڑی کردی گئی تھی۔ میں بہ مشکل اسے پھلانگ کر اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچا ہی تھی کہ ملٹری ٹرک آگئی۔ اور جو پہلا گورا مشین گن لئے دھم سے کودا تھا وہ جیکسن صاحب ہی تھا۔ ٹرک کی آمد کی خبر سنتے ہی سڑک پر روک باندھنے والا دستہ ادھر ادھر بلڈنگوں میں سٹک گیا تھا۔

میرا فلیٹ چونکہ سب سے نچلی منزل تھا لہذا بہت سے چھوکرے ایک دم ریلا کر کے گھس آئے۔ کچھ باورچی خانہ میں گھس گئے کچھ غسل خانہ اور سنڈاس میں دبک گئے۔

چونکہ میرا دروازہ کھلا تھا اس لئے جیکسن معہ دو مسلح گوروں کے مجھ سے ہی جواب طلب کرنے آگے آیا۔

"تمہارے گھر میں بدمعاش چھپے ہیں انہیں ہمارے سپرد کر دو"

"میرے گھر میں کوئی نہیں۔ صرف میرے نوکر ہیں" میں نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

"کون ہیں تمہارے نوکر؟"

"یہ تینوں ——" میں نے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو برتن کھٹر پٹر کر رہے تھے

"غسل خانہ میں کون ہے؟"

"میری ساس نہا رہی ہیں" میری ساس نہ جانے اس وقت کہاں ہوں گی۔

"اور پاخانہ میں؟" اس کے چہرے پر کچھ شرارت کی جھلکی آئی۔

"میری ماں ہوں گی یا شاید بہن ہو۔ مجھے کیا پتہ میں تو ابھی باہر سے آئی ہوں"

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہے غسلخانہ میں تمہاری ساس ہے؟"

"میں داخل ہوئی تو انہوں نے آواز دے کر مجھ سے تولیہ مانگا تھا"

"ہوں —— اچھا اپنی ساس سے کہہ دو سڑک روکنا جرم ہے!" اس نے دبی آواز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو جنہیں وہ باہر کھڑا کر آیا تھا واپس ٹرک میں جانے کو کہا۔

"ہوں —! ہوں ہوں" وہ گردن ہلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ننھے منے جگنو جھپک رہے تھے۔

جیکسن کا بنگلہ میرے احاطے سے ملحقہ زمین پر تھا مغربی رخ پر کمسنڈر لگا تھا۔ اس کی میم صاحب مع دو بچوں کے ان دنوں ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ بڑی لڑکی جوان تھی اور چھوٹی بارہ تیرہ برس کی۔ میم صاحب صرف چھٹیوں میں تھوڑے دنوں کے لئے ہندوستان آجاتی تھی۔ اس کے آتے ہی بنگلہ کا حلیہ بدل جایا کرتا تھا۔ نوکر چاق چوبند ہو جاتے۔ اندر باہر صفائی ہوتی، باغ میں نئے گملے سجائے جاتے۔ جو میم صاحب کے جاتے ہی پاس پڑوس کے لوگ چرانا شروع کر دیتے۔ کچھ مالی بیچ ڈالتا، اور دوبارہ جب میم صاحب کی آمد کا غلغلہ مچتا تو صاحب پھر وکٹوریہ گارڈن سے گملے اٹھوا لاتا۔ جتنے دن میم صاحب رہتی نوکر باوردی نظر آتے، صاحب بھی یونیفارم ڈالے رہتا یا نہایت عمدہ ڈریسنگ گاؤن پہنے صاف ستھرے کتوں کے ساتھ پھولوں کا بالکل اس طرح معائنہ کرتا پھرتا گویا وہ سو فی صد صاحب لوگوں میں سے ہے۔

مگر میم صاحب کے جاتے ہی وہ اطمینان کی سانس لے کر ڈھیلا پڑ جاتا۔ ڈیوٹی کے بعد نیکر اور بنیان پہنے چبوترے پر کرسی ڈالے بیئر پیا کرتا۔

اور شاید اس کا ڈریسنگ گاؤن اس کا بیرا چُرا لے جاتا۔ کتے تو میم صاحب کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ دو چار ٹیری کتے بنگلے کو یتیم سمجھ کر احاطے میں ڈیرا ڈال دیتے۔

میم صاحب جتنے دن رہتی ڈنر پارٹیوں کا زور رہتا۔ اور وہ صبح ہی صبح نیم سردیوں میں اپنی آیا کو آواز دیتی —

"آیو۔ وہ دو!"

"جی میم صاحب!" آیا اس کی آواز پر تڑپ کر دوڑتی۔ مگر جب میم صاحب چلی جاتی تو لوگوں کا کہنا تھا کہ آیا بیگم بن بیٹھی تھی۔ وہ اس کی خیر خواہی کیا بہت بھی بھٹکایا کرتی تھی۔ فلو مینا اور ٹیو اسی عارضی راج سے منتقل ہوتے تھے۔

وہ کچھ ہندوستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ اور کچھ میم صاحب اُٹھا لائی تھی۔ اس گند سے بچیچا تے ملک اور اس کے باسیوں سے۔ اس لئے وہ جلد ہی وطن سدھار گئی۔ انہیں دنوں میں میری ملاقات جیکسن صاحب سے اسی کھڑکی کے ذریعہ ہوئی۔

"تمہارا ماس بنا جیبا —؟" اس نے بمبئی کی زبان میں بدذاتی سے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں صاحب — تمہارا بھائی خون کا۔" کیا اس نے! میں نے تلخی سے کہا۔ چودہ پندرہ برس کے چند بچے کچھ ہی دن پہلے بحری فوج پر ہوئی چلائی تھی اس میں مارے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں کچھ دیسا بچے تھے تب ہوا اس دن جب ٹرک آئی تھی تو میرے گھر میں چھپ گئے تھے۔ مجھے صاحب سے گھن آنے لگی تھی۔ برٹش سامراج کا جیتا جاگتا ہتھیار میرے سامنے کھڑا ان بے گناہوں کے خون کا مذاق اڑا رہا تھا جو اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ میرا جی چاہا اس کا منہ نوچ لوں۔ اس کی کون سی آنکھ شیشے کی تھی یہ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل تھا۔ کیونکہ وہ شیشے والی آنکھ ولائتی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ تھی — اس میں ساری جیکسن کی سفید قوم کی جبلی نازی خصلت ابھری ہوئی تھی۔ احساسِ برتری کا زہر دونوں ہی آنکھوں سے ٹپک رہا ہوا تھا۔ میں نے و ہڑسے کھڑکی کے پٹ بند کر دئے۔

مجھے سکھو بائی پر بھی بہت غصہ آتا تھا۔ سور کی بچی سفید قوم کے ذلیل کتے کا تر نوالہ بنی ہوئی تھی۔ کیا خود اس کے ملک میں کوڑھیوں اور حرامزادوں کی کمی تھی جو وہ ملک کی غیرت کے نیلام پر تُل گئی تھی۔ روز جیکسن شراب پی کر اس کی ٹھکائی کرتا۔ ملک میں بڑے بڑے سر کے سر کٹے جا رہے تھے۔ سفید حاکم بس چند دنوں کے مہمان تھے۔

"بس اب یہ چلاؤ ہے ان کی علومت کا" کچھ لوگ کہتے۔

"ابھی یہ شیخ چلی کے خواب ہیں۔ انہیں نکالنا مذاق نہیں" دوسرے لوگ کہتے۔ اور میں ملک کے نیتاؤں کی لمبی چوڑی تقریریں سن کر سوچتی "کوئی جیکسن کانے صاحب کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سکھو بائی کے جھونٹے پکڑ کر پیٹتا ہے۔ فلومینا اور ٹیو کو مارتا ہے۔ جے ہند کے نعرے لگانے والے اس کم بخت کا کچھ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔"

مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پچھواڑے شراب بنتی تھی۔ مجھے معلوم تھا سب کچھ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سنا تھا کہ اگر ان غنڈوں کی رپورٹ کر دو تو یہ جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ بھی تو نہیں معلوم تھا کہ کس سے رپورٹ کروں۔ ساری بلڈنگ کے نل دن رات ٹپکتے تھے۔ موریاں سڑ رہی تھیں۔ مگر مجھے قطعی نہیں معلوم تھا کہ کہاں اور کس سے رپورٹ کی جاتی ہے۔ آس پاس رہنے والوں میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بدذات عورت اوپر سے سر پر کوڑے کا ٹین الٹ دے تو اس کی کس سے شکایت کرو۔ ایسے موقعوں پر عموماً جس کے سر پر کوڑا گرتا وہ منہ اونچا کر کے کھڑکیوں کو گالیاں دیتا کپڑے جھاڑتا اپنی راہ لیتا۔

میں نے موقع پاکر ایک دن سکھو بائی کو پکڑا ـــــ

"کیوں کم بخت! یہ پاچی تمہیں روز پیٹتا ہے تجھے شرم بھی نہیں آتی ــ"

"روج کبھی مارتا بائی ؟" وہ بحث کرنے لگی۔

"خیر وہ مہینے میں چار پانچ دفعہ تو مارتا ہے نا!"

"ہاں مارتا ہے بائی ـــــ سو ہم بھی سالے کو مارتا ہے ـ" وہ ہنسیں

وہیں چھوٹی ـــــ"

"ارے ٹپو کا سوگند ـــــ ہم تھوڑا مار دیا سالا کو پرسوں ؟"

"مگر تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ سفید چمڑی والے کی جوتیاں سہتی ہے ؟ میں نے ایک سچے وطن پرست کی طرح جوش میں آکر اسے لکچر دے ڈالا" ان لٹیروں نے ہمارے ملک کو کتنا لوٹا ہے ـــــ" وغیرہ وغیرہ

"ارے بائی کیا بات کرتا تم۔ صاب سالا کوئی کو نہیں لوٹا۔ یہ جو موالی لوگ ہے نا یہ بچارا کو دن رات لوٹتا۔ میم صاب گیا۔ پیچھے سب کٹلری پٹلری بیرا لوگ پار کر دیا۔ اکھا پاٹلون کوٹ ہیٹ اتنا فسٹ کلاس ہوتا ـــ سب کھتم۔ دکھبوجی کے بنگلے میں کوچھ بھی نہیں چھوڑا۔ تم کتنا چور رے صاب، ہم پونا ہم نہیں ہووے تو سالا اس کا بوٹی کاٹ لے کے جاوے اے لوگ۔"

"مگر تمہیں کیوں اس کا اتنا درد ہے ؟"

"کائیکو نہیں ہووے درد وہ ہمارا مرد ہے نا بائی ـــ" سکھو بائی مسکرائی۔

"اور میم صاحب ؟"

"ہم صاب سالی بکی چھنال ہاں ـــــ!" سکھو بائی نے فیصلہ کیا۔ "ہم اس کو اچھی طرح سے جانتا ـــ ہاں ـ لنڈن میں اس کا بوت یار ہے۔" ہاں سکھو بائی نے موٹی سی گالی دے کر کہا ـــ" وہیں مری رہتی ہے۔ آتی بی نہیں، پن آتی تو اکھا دن صاب سے کھٹ کھٹ کرکر دل سے کھٹ کرت۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب انگریز ہندوستان سے جا رہے ہیں۔ صاحب بھی چلا جائے گا۔ مگر وہ قطعی نہیں سمجھی۔ بھی کسی رنی "صاب ہم کو چھوڑ کے کیا جائے گا ـــ بائی اس کو ولایت ایک دم پسند نہیں۔"

کچھ سال کے لئے مجھے پونا رہنا پڑا۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ پھر واقعی انگریز چلے گئے ـــ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ سفید حاکم پٹی ہوئی چال چل گیا اور ملک خون کی لہروں میں نہا گیا۔

جب بمبئی واپس آئی تو بنگلہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ صاحب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بنگلے میں ایک ریفیوجی خاندان آ بسا تھا۔ باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک کوٹھڑی میں سکھو بائی رہنے لگی تھی۔ خلو مینا خاصی لمبی ہوگئی تھی۔ بٹو اور وہ ناٹم کے قریب ایک یتیم خانے میں پڑھنے جاتے تھے۔

جیسے ہی سکھو بائی کو میرے آنے کی خبر ملی فوراً ہاتھ میں دو چار مونگے کی پھلیاں لئے آن دھمکی

"کیسا ہے بائی ؟" انہوں نے رسماً میرے گھٹنے دبا کر پوچھا۔

"تم کیا ہے۔ صاحب کہاں ہے تمہارا؟ — چلا گیا نا لندن!"

"نہیں بائی —" سکھو بائی کا منہ سوکھ گیا۔ "ہم بولا ہی جانے کو پر نہیں گیا۔ اس کا نوکری بھی کھلاس ہو گیا تھا۔ آرڈر بھی آیا پر نہیں گیا"

"پھر کہاں ہے؟"

"ہسپتال میں!"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"ڈاکٹر لوگ بولتا — کہ مار و بہت پیا — اس کے کارن مستک پھر گیا — ادھر پاگل صاب لوگ کا ہسپتل ہے۔ اچھا ایک دم فرسٹ کلاس اُدھر اس کو ڈالا —"

"مگر وہ تو واپس جانے والا تھا —"

"کتنا صب لوگ بولا ہم بھی بولا — بابا چلا جاؤ —" سکھو بائی رو پڑیں — "پن نہیں، ہم کو بولا سکھو ڈارلنگ تیرے کو چھوڑ کر نہیں جائیں گا —"

نہ جانے سکھو بائی کو روتے دیکھ کر مجھے کیا ہو گیا — میں بالکل بھول گئی کہ صاحب ایک غاصب قوم کا فرد ہے جس نے فوج میں بھرتی ہو کر میرے ملک کی غلامی کی زنجیروں کو چوپیرا کر دیا تھا۔ جس نے میرے ہموطن بچوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ ننھے لڑکوں پر مشین گنوں سے آگ برسائی تھی۔ برٹش سامراج کے اُن گھناؤنے کل پرزوں میں سے تھا جس نے میرے دیس کے جانبازوں کا خون سڑکوں پہ بہایا تھا۔ صرف اس قصور میں کہ وہ اپنا حق مانگتے تھے۔ عزت سے جینا چاہتے تھے۔ مگر مجھے اس وقت کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ سکھو بائی کا "مرد" پاگل خانہ میں تھا۔ مجھے اپنے جذباتی ہونے پر بہت دکھ تھا کیونکہ ایک قوم پرست کو جابر قوم کے ایک فرد سے قطعی کسی قسم کی ہمدردی یا لگاؤ نہ محسوس کرنا چاہئے۔

میں ہی نہیں سب ہی بھول چکے تھے۔ محلے کے سارے لونڈے نیلی آنکھوں والی فلو بنیا پر خیر یہ سوچے سمجھے فدا تھے کہ وہ کیڑا جس سے اس کی ہستی وجود میں آئی سفید تھا یا کالا۔ جب وہ اسکول سے لوٹتی تو کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں اس کے جلو میں ہوتیں۔ کتنی ہی نگاہیں اس کے پیروں تلے بچھائی جاتیں۔ [illegible] قطعی یہ یاد نہ رہتا تھا کہ یہ اسی سفید درندے کی لڑکی ہے جس نے [illegible] کے ناکے پر [illegible] کے بچے کو خون میں ڈبو کر مارا تھا۔ جس نے ماہم چرچ کے سامنے نہتی عورتوں پر گولیاں چلائی تھیں کیونکہ وہ نعرے [illegible] تھیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو!"

جس نے چوپاٹی کی ریت میں جوانوں کا خون نچوڑا تھا اور سیکرٹریٹ کے سامنے سوکھے مارے ننگے بھوکے لڑکوں کے جلوس کو مشین گنوں سے درہم برہم کیا تھا۔ وہ سب بھول چکے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ گُندنی گالوں اور نیلی آنکھوں والی چھوکری کی کمر میں غضب کی لچک ہے۔ رس سے موٹے گدرائے ہوئے ہونٹوں کی جنبش میں موتی رُلتے ہیں۔

ایک دن سکھو بائی جھولی میں پرساد لئے بھاگی بھاگی آئیں۔

"ہمارا صاب آگیا" ان کی آواز لرز رہی تھی۔ آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔ کتنا پیار تھا اس لفظ "ہمارا" میں۔ زندگی میں ایک بار کسی کو یوں جی جان کا دم نچوڑ کر اپنا کہنے کا موقعہ مل جائے تو پھر جنم لینے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

"اچھا ہو گیا؟"

"ارے بابا! پاگل کبھی اچھا ہوا ہے صاحب۔ لوگ کہتا ہے کہ بھاگ آیا" — وہ [illegible] کے لہجے میں بولیں۔

میں ڈر گئی کہ ہو نہ ہو ایک تو پاگل ہوگا، پھر اوپر سے پاگل خانے سے بھاگا ہوا۔ کیوں نہ رپورٹ کر دوں۔ کیونکہ پولیس کے لفڑے میں کون پڑتا پھرے۔ ہوا کرے پاگل میری بلا سے۔ کون مجھے اس سے میل جول بڑھانا ہے۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ مجھے میل جول بڑھانا پڑا۔ میرے دل میں بھی کچھ ہمدردی تھی کہ [illegible] یہ [illegible] انگلستان اپنے بیوی بچے کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بھلا ایسا بھی کوئی انسان ہوگا جو فردوس کو چھوڑ کر یوں ایک کھولی میں پڑا رہے۔ اور ایک دن مجھے موقع مل ہی گیا۔ کچھ دن تک تو وہ کوٹھری سے باہر ہی نہ نکلا۔ پھر آہستہ آہستہ نکل کر چوکھٹ پہ بیٹھنے لگا۔ وہ سوکھ کر [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible] بندر — [illegible] سال چقندر رہا تھا جس کا رنگ حقنی ہو گیا تھا۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ پاگل خانے کی [illegible] بیان پڑھا ہے وہ بالکل ہندوستان کی گلیوں میں گھومتے پرانے لوگوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی نقلی اور اصلی آنکھ میں [illegible] معلوم ہوتے [illegible] اب بھی ویسا ہی [illegible] انگریز" تھا۔ مگر اصلی آنکھ گدلی بے رونق ہو کر ذرا سی رہ گئی تھی۔ عموماً [illegible] وہاں آنکھ سے بغیر [illegible] تا تھا۔ ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو وہ جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑا کھوئے کھوئے انداز میں کبھی زمین سے کوئی [illegible] بچوں کی طرح دیکھ کر مسکراتا پھر پوری طاقت سے اسے دور پھینک دیتا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور سر ہلانے لگا۔

"کیسی طبیعت ہے صاحب؟" تجسس نے اکسایا تو میں نے پوچھا۔

"اچھا ہے۔ اچھا ہے" وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرنے لگا۔

میں نے باہر جا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ جلد ہی وہ مجھ سے باتیں کرنے میں بے تکلفی سی محسوس کرنے لگا۔ پھر ایک دن میں نے موقع پا کر کریدنا شروع کیا۔ کئی دن کی جانفشانی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک [illegible] نواب زادی کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کے نانا نے ایک کسان کو کچھ روپیہ دلا کر پالنے پہ راضی کر لیا۔ مگر یہ معاملہ اس صفائی سے کیا گیا کہ اس کسان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس خاندان کا ہے۔ کسان [illegible] تھا اس کے کئی بیٹے [illegible] جو جیکسن کو طرح طرح سے [illegible] ستایا کرتے تھے۔ [illegible] اچھا لگتا تھا۔ اس نے بارہ برس [illegible] کی عمر سے بھاگنے کی [illegible] کرنا شروع کی۔ تین چار سال کی مستقل کوشش کے بعد وہ [illegible] لندن پہنچا۔ وہاں اس نے دنیا بھر کے پیشے باری باری اختیار کئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ اتنا ڈھیٹ ہو گیا اور خود سر ہو گیا تھا کہ دو دن سے زیادہ کوئی نوکری نہ رہتی۔

وہ شکل صورت کا وجیہہ تھا اس لئے لڑکیوں میں کافی ہر دلعزیز تھا۔ ڈارتھی اس کی بیوی بڑے نک چڑھے خاندان کی لڑکی تھی۔ کم رو اور کم ظرف بھی تھی۔ اس کا باپ بارسوخ آدمی تھا۔ جیکسن نے سوچا اس خانہ بدوشی کی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہیں۔ آئے دن پولیس اور کچہری سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیوں نہ ڈارتھی سے شادی کر کے عاقبت سنوار لی جائے۔

ڈارتھی اس کے پاس کی بچی اس کی دسترس سے باہر تھی۔ وہ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کی عادی تھی۔ مگر جیکسن کی اس وقت دونوں آنکھیں اصلی تھیں۔ یہ تو جب ڈارتھی سے لڑ کر وہ شرابخانوں کا ہو رہا، وہاں کسی سے مار پیٹ میں آنکھ جاتی رہی۔ جب تک اس کی صرف بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

"ہاں تو تم نے ڈارتھی کو کیسے گھیر کر پھانسا — ؟" میں نے اور کریدا۔

"جب میری دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔" جیکسن مسکرایا۔

کسی نہ کسی طرح ڈارتھی بھنے چڑھ گئی۔ کم بخت کنواری بھی نہیں تھی مگر ایسے پھیل مچائے کہ باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کرلی۔ شاید وہ اپنی شادی سے ناامید ہو چکی تھی اور خود اس کی گھات میں تھی۔

باپ نے بھی لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھ لیا۔ نیز بیوی کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر نکما انگریز ہندوستان کے سر منڈھ دیا جاتا تھا۔ خواہ وہاں وہ جوتے گانٹھتا ہو یہاں آتے ہی صاحب بن بیٹھتا تھا۔

جیکسن سے قدرتاً وہ ہندوستان میں بھی ویسا ہی نکما اور لاابالی ثابت ہوا۔ سب سے بڑی خرابی جو اس میں تھی وہ اس کا چھچھورا پن تھا۔ بجائے صاحب بہادروں کی طرح رعب داب سے رہنے کے وہ نہایت بھونڈے پن سے ہندو لوگوں میں گھل مل جاتا تھا۔ جب وہ بستی کے علاقے میں جنگلات کے محکمہ میں تعینات ہوا تو وہ کلب کے بجائے زمیندانی کن چنڈو خانوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ آس پاس صرف چند انگریز رہتے تھے۔ بدقسمتی سے زیادہ تر لوگ سخت اور بردبار رہتے۔ سنسان کلب میں جہاں ہندوستانیوں اور کتوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ زیادہ تر الو بولا کرتا تھا۔ سب ہی افسروں کی بیویاں اپنے وطن میں رہتی تھیں۔ جب کبھی کسی افسر کی بیوی ہندوستان آتی تو وہ اسے بجائے جنگل میں لانے کے خود چھٹی لے کر شملہ یا نینی تال چلا جاتا۔ جو بیوی ہندوستان کی غلاظت سے عاجز آکر واپس چلی جاتی اور اس کا صاحب ٹھنڈی آہیں بھرتا بیوی کی تیمارداری یاد نہ ہوتی تو ... سب لوگ ویسے اپنا کام ہندوستانی عورتوں سے چلا لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ صاحب بھی سستا رہتا تھا۔ ہندوستان کا بھی فائدہ ہوتا تھا۔ اس میں ایک تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد نادانی اور کبھی خاصی گوری بھی ہوا کرتی تھی۔ دوسرے یہ اولاد باقی ہندوستانیوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتی تھی کیونکہ ان کے باپ ان کے لئے یتیم خانے اور اسکول کھول دیتے تھے۔ سرکار ان کو ترجیح دیتی کیونکہ دوسرے ہندوستانیوں سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ اینگلو انڈین خود کو انگریزوں سے کہیں زیادہ ... سمجھتے تھے۔ لڑکے ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے۔ جو معمولی شکل کی لڑکیاں ہوتیں انہیں ہندوستانی لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر نوکریاں مل جاتیں اور وہ اسکولوں، دفتروں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں۔ جو زیادہ حسین ہوتیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازارِ حسن میں بڑی کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

جیکسن صاحب جب ہندوستان آیا تو اس میں کالے شخص کے تمام عیب بڑی افراط سے موجود تھے۔ پھر اس کی عادت تھی کہ بن جلی ہر جگہ اس کی کسی نہ کسی سے ٹھن جاتی اور اس کا تبادلہ ہو جاتا۔ جنگلات سے ہٹا کر اسے پولیس میں بھیج دیا گیا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک پٹھان پیر اس کا سے طرح وار آگیا تھا۔ جلد پہنچ کر وہ اسے ضرور بلا لیتا مگر وہاں اسے ایک نٹنی سے عشق ہو گیا۔ ایسا شدید عشق کہ اس کی بیوی ساری چھٹیاں نینی تال میں گزار کر واپس چلی گئی اور وہ نہ گیا۔ کام کی زیادتی کا بہانہ کرتا رہا۔ چھٹی نہ ملنے کا عذر کیا۔ مگر ڈارتھی کے ڈیڈی کے کئی ہی دوست تھے جن کے رسوخ کی وجہ سے اسے زبردستی چھٹی دلوائی گئی۔ جب وہ نینی تال پہنچا تو اس کا وہاں قطعی دل نہ لگا۔ ایک تو ڈارتھی اس کی جدائی میں اس بے طرح عاشق ہو گئی تھی۔ اور چاہتی تھی دوبارہ ہنی مون منایا جائے۔ دوسری طرف اسے جیکسن کے طریقہ عشق سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ وہ اتنے دن ہندوستان میں رہ کر بالکل ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ پاپا ڈیڈی اور ممی دونوں نے اس کی ہندوستانی ...

کی طرح خدمت کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ سال میں صرف دو مہینہ کے لئے آنے والی بیوی بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے سامنے جیکسن کو تکلفات برتنا پڑتے تھے۔ ایک دن نشہ میں اس نے کچھ پیار اور نٹی کے اندازِ محبت کا اپنی بیوی سے بھی مطالبہ کر دیا۔ وہ ایسی چراغ پا ہوئی کہ جیکسن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہت جرح کی بہت کریدا کہ "کہیں تم بھی دوسرے بے غیرت اور نیچ انگریزوں کی طرح لوکل عورتوں سے میل جول تو نہیں بڑھانے لگے ہو۔" جیکسن نے قسمیں کھائیں اور ڈارتھی کے اتنے پیار لئے کہ وہ اس کی پارسائی کی قائل ہو گئی۔ اسے بڑا ترس آیا اور بڑے اصرار سے وہ اسے جبلپور لے آیا۔ مگر وہ وہاں کی مکھیوں اور گرمی سے بوکھلا کر نیم پاگل ہو گئی۔ اور تو سب جھیل جاتی مگر جب اس کے غسل خانے میں وہ موئی نکلی تو وہ اسی وقت سامان باندھنے لگی۔ جیکسن نے بہت سمجھایا کہ یہ سانپ نہیں اور کاٹتا بھی نہیں مگر اس نے ایک نہیں سنا اور دوسرے دن دہلی چلی گئی۔

وہاں سے اس نے زور لگا کر اُن کا تبادلہ بمبئی کا کروا دیا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ نٹی کی جدائی اور ڈارتھی کا بمبئی میں مستقل قیام سوہانِ روح بن گیا۔ سکھو بائی بچوں کی آیا کا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر جب بارش سے جی چھوڑ کر ڈارتھی، نیچ بچوں کے دھن گئی تو جیکسن کی نظرِ عنایت اس پر پڑی۔ اُف کس قدر اُلجھی ہوئی داستان تھی صاحب کی۔ کیونکہ سکھو بائی اصل میں گنپت بیڈ بیرے کی رکھیلی عورت تھی۔ وہ اسے پونا پل سے پھسلا لایا تھا۔ ویسے بڑی جون والا آدمی تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے اسے بطور کمائی کے بچوں کی آیا کے نیچے رکھوا دیا تھا۔ سکھو بائی اپنی اس نوکری سے جس میں زمین پونچھنے برتن دھونے کے علاوہ گنپت کے ناز اُٹھانا بھی شامل تھا، کافی مطمئن تھی۔

گنپت اسے کبھی اپنے کسی دوست کو بھی ازراہِ کرم یا قرضہ کے عیوض میں دے دیا کرتا تھا۔ مگر بڑی چالاکی سے کہ بہت دن تک سکھو بائی کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ پینے سے تو پہلے ہی سے کچھ واقف تھی۔ گنپت کی صحبت میں پابندی سے شام کو ٹھرّا چڑھانے لگی۔ گنپت کاہے کو اپنی کوٹھڑی میں لے آتا جیکسن کا ڈر تو کسی کو تھا نہیں۔ سب کام کاج چھوڑ کے نوکر مزے سے جوا کھیلتے۔ ٹھرّا پیتے بلکہ سارے سیواجی پارک کے غنڈے ڈارتھی کے جاتے ہی صاحب کے بنگلے پر ٹوٹ پڑتے۔ اور رات گئے تک ہلڑ مچا رہتا۔

شراب جب خوب چڑھ جاتی تو وہ سکھو بائی کو اس آدمی کے پاس چھوڑ کر کسی بہانے سے چلا جاتا۔ سکھو بائی سمجھتی وہ گنپت کو اُلّو بنا رہی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ صاحب کی خدمت کرتے کرتے بیوی کی عیوضی بھی بھگتنے لگی۔ اس طرح گنپت کے چکر سے چھوٹ لی۔ وہ کم بخت اللہ اس کی ساری تنخواہ اینٹھ لیا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں گنپت فوج میں بیرے کی حیثیت سے مڈل ایسٹ چلا گیا اور سکھو بائی مستقل میم صاحب کی جگہ جم گئی۔ بس جب چھٹیوں میں میم صاحب آتیں تو وہ اپنی کھولی میں منتقل ہو جاتی۔ اور جب وہ اپنی پتلی کوک دار آواز میں ——

"آیو۔ وور ——" پکارتیں تو وہ فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کے

"یس میم صاب!" کہہ کر لپکتی۔ یوں تو میم صاب میم صاب سیکھ کر وہ اپنے آپ کو بڑی انگریزی داں سمجھنے لگی تھی۔ انگریزی زبان میں یس۔ نو۔ ڈیم فول۔ سوائن کے سوا اور ہے ہی کیا؟ حاکموں کا ان چند الفاظ میں ہی کام نکل جاتا ہے۔ جوڑے ادبی جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تانگہ کے گھوڑے کو ٹخ ٹخ اور چابک کی زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ مگر سکھو بائی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریزی کی گاڑی میں جتا ہوا مریل گھوڑا الف ہو کر گاڑی لوٹ چکا تھا اور اب اس کی لگامیں دوسرے ہاتھوں میں تھیں۔ اس کی دنیا بڑی محدود تھی۔ وہ خود اس کے دو بچے اور اس کا "مرد"!

جب میم صاحب ہندوستان آیا کرتی تھی جب بھی سکھو بائی بڑی فراخ دلی سے عیوضی چھوڑ کر پھر تپتی کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے لگتی۔ اسے میم صاحب سے قطعی کوئی حسد نہیں تھا۔ میم صاحب مغربی حسن کا نمونہ ہو تو ہو، ہندوستانی معیارِ حسن کے ترازو میں اسے تولا جاتا تو جواب صفر ملتا۔ اس کی جلد کھرچے ہوئے شلغم کی طرح کچی کچی تھی۔ جیسے اُسے پوری طرح پکنے سے پہلے ڈال سے توڑ لیا گیا ہو یا ٹھنڈی بے جان اندھیری قبر میں برسوں دفن رکھنے کے بعد نکالا ہو۔ اس کے چھدرے میلی چاندی کے رنگ کے بال بالکل بڑھیوں کے بالوں کی طرح لگتے تھے۔ اس لئے سکھو بائی کے درجے کے لوگ اسے بڑھیا سمجھتے تھے۔ یا پھر سورج مکھی جسے ہندوستان میں بڑا قابلِ رحم سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ منہ دھوئے مرتا تو اس کی ہنسی سے منافق مولی بھنڈی [illegible] نہ تصویر کرسکتے رنگ سے بگاڑ دیا ہو۔

بھر ٹار ہتی سر دھی، اجلی تھی۔ جیکسن کا وجود اس کے لئے ایک کھنا دنی گالی تھا۔ وہ اپنے کو نہایت بدنصیب اور مظلوم سمجھتی تھی۔ اور شادی کو ناکامیاب بنانے میں وہ حق بہ جانب تھی۔ خواہ جیکسن کتنے ہی بلند عہدے پہ پہنچ جاتا وہ اس پہ فخر نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سارے عہدے خود ڈارتھی کے باپ کے دلائے ہوئے ہیں۔ جو کسی بھی احمق کو دلا دئے جاتے تو وہ آسمانوں کو چھو لیتا۔

اس کے برخلاف سکھو بائی اپنی تھی — گھر کی مرغی۔ اس نے پورا گل پر الاؤ کی طرح لپڈک کر ہزاروں کے ہاتھ تاپنے کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہ گنیت کی رکھیل تھی جو اسے اپنی پرانی قمیص کی طرح دوستوں کو دھار دیا کرتا تھا۔ اس کے لئے جیکسن صاحب دیوتا تھا۔ شرافت کا اوتار تھا۔ اس کے اور گنپت کے پیار کے طریقہ میں کتنا فرق تھا۔ گنپت تو اسے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چبا چبا کر تھوکتا۔ اور صاحب ایک مجبور ضرورت مند کی طرح اسے امرت سمجھتا۔ اس کے پیار میں بہت بچے جیسی لاچاری تھی۔

جب انگریز اپنا ٹاٹ بلان لے کر چلے گئے تب وہ نہیں گیا۔ ڈارتھی نے اسے بلانے کے سارے جتن کر ڈالے۔ دھمکیاں دیں مگر اس نے استعفیٰ دے دیا اور نہیں گیا۔

"صاحب تمہیں اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے؟" میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

"بہت یاد آتے ہیں۔ فلو شام کو دیر سے آتی ہے۔ اور ٹیو لونڈوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ کبھی میرے پاس بھی بیٹھیں۔" وہ اُن کی کہانیاں بتانے لگا۔

"ٹیو اور فلو تمہیں اتنا پیار کرتے ہیں اور رُلاتا —" میں نے بھی ڈھٹائی لادی۔

"نہیں — نہیں —" وہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔ "پلے صرف کُتیا سے مانوس ہوتے ہیں اُس کتے کو نہیں پہچانتے جو ان کے وجود میں ساجھے دار ہوتا ہے۔" اس نے اپنی اصلی آنکھ مار کر کہا۔

"یہ جاتا کیوں نہیں یہاں پڑا سڑ رہا ہے۔" یہ میں ہی نہیں آس پاس کے سب ہی لوگوں کو بے چینی سی ہوتی تھی۔

"جاسوس ہے، اسے جان بوجھ کر یہاں رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ ملک میں دوبارہ برطانوی راج کو لانے میں مدد دے۔" کچھ لوگ یوں بھی سوچتے۔ گلی کے لونڈے جب وہ دکھائی دیتا، یہی پوچھتے۔

"صاب ولایت کب جائے گا؟"

"صاحب کوئٹ انڈیا کاہے کو نہیں کرتا؟"

"ہندوستان چھوڑ دو صاب!"

"انگریزی چھورا چلا گیا۔"

"وہ گورا گورا چلا گیا ——"

"پھر تم کاہے کو نہیں جاتا؟" سڑک پر آوارہ گھومنے والے لونڈے اس کے پیچھے دھیری لگاتے آوازے کستے۔

"ہوں — ہونہوں — جائے گا — جائیگا بابا!" وہ سر ہلا کر مسکراتا اور اپنی کھولی میں چلا جاتا۔

تب مجھے اس کے اوپر بڑا ترس آتا۔ کہاں ہیں دنیا کے رکھوالے۔ جو ہر کمزور ملک کو تہذیب سکھاتے پھرتے ہیں۔ ننگوں کو پتلون اور فراکیں پہناتے پھرتے ہیں۔ اپنے سفید چمڑی کی برتری کا ڈھول پیٹتے ہیں ان کا ہی خون ہے جو جیکسن کے روپ میں کتنا ننگا ہو چکا ہے۔ مگر اسے کوئی مشنری ڈھانکنے نہیں آتا۔

اور جب گلی کے لفنگے تھک ہار کر چلے جاتے تو وہ اپنی کھولی کے سامنے بیٹھ کر بیڑی پیا کرتا۔ اس کی اکلوتی اصلی آنکھ دور افق پر اس ملک کی سرحدوں کو تلاش کرتی جہاں نہ کوئی گورا ہے نہ کالا۔ نہ کوئی زبردستی جا سکتا ہے نہ آ سکتا ہے۔ اور نہ وہاں بدکار مائیں اپنے ناجائز بچوں کو تیری میری چوکھٹ پر پھینک کر خود اپنی مادرانہ دنیا بسا لیتی ہیں۔

سکھو بائی آس پاس کے گھروں میں کمائین کا کام کرتی —— اچھا خاصا کما لیتی، اس کے علاوہ وہ بانس کی ڈلیاں، میز کرسی وغیرہ بنا لیتی تھی، اس ذریعہ سے کچھ آمدنی ہو جاتی —— جیکسن بھی اگر نشے میں نہ ہوتا تو اُلٹی سیدھی بے پیندے کی ٹوکریاں بنایا کرتا۔ شام کو سکھو بائی اس کے لئے ایک ٹھرے کا ادھا لا دیتی جو وہ فوراً چڑھا جاتا اور پھر اس سے لڑنے لگتا۔ ایک رات اس نے نہ جانے کہاں سے ٹھرے کی پوری بوتل حاصل کر لی اور ساری رات بڑبڑاتا رہا —— صبحدم وہیں کھولی کے آگے پڑ کر سو گیا۔ للو، منیا اور چنو اس کے اوپر سے پھلانگ کر اسکول چلے گئے۔ سکھو بائی بھی تھوڑی دیر اسے گالیاں دے کر چلی گئی۔ دوپہر تک وہ وہیں پڑا رہا —— شام کو جب بچے آئے تو وہ دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اسے شدید بخار تھا جو دوسرے دن بڑھ کر سرسام کی صورت اختیار کر گیا۔ ساری رات وہ نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا۔ نہ جانے کسے کسے یاد کرتا رہا۔ شاید اپنی ماں کو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو شاید اس وقت کسی شاندار ضیافت میں شریک "اخلاقی اصلاح بندی" پر تبصرہ کر رہی ہوگی۔ یا وہ باپ یاد آ رہا ہو جس نے نسل چلانے والے سانڈ کی خدمات ادا کرنے کے بعد اسے، اپنے جسم سے بہی ہوئی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہ دی —— اور جو اس وقت کسی دوسرے محکوم ملک میں بیٹھا قومی اقتدار قائم رکھنے کے منصوبے بنا رہا ہوگا۔ یا ڈارلنگ کے طعنوں بھرے احسان یاد آ رہے تھے۔ جو بے رحم کسان کے ہنٹروں کی طرح ساری عمر اس کے احساسات پر برستے رہے یا شاید وہ گولیاں جو اس کی مشین گن سے نکل کر بے گناہوں کے سینوں سے پار ہوئیں اور آج پلٹ کر اسی کی روح کو ڈس رہی تھیں

—— وہ رات بھر چلاتا رہا سر پٹختا رہا —— سینے کی دھونکنی چلتی رہی —— در و دیوار نے پکار پکار کر کہا ——

"تیرا کوئی ملک نہیں —— کوئی نسل نہیں —— کوئی رنگ نہیں۔"

تیرا ملک اور نسل سکھو بائی ہے جس نے تجھے بے پناہ پیار دیا —— کیونکہ وہ بھی تو اپنے دیس میں غریب الوطن ہے —— بالکل تیری طرح۔ ان کروڑوں انسانوں کی طرح جو دنیا کے ہر کونے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی ولادت پر شادیانے بجتے ہیں —— نہ موت پر ماتم ہوتے ہیں!

پو پھٹ رہی تھی ـــــ ملوں کی چمنیاں دھواں اُگل رہی تھیں اور مزدوروں کی قطاروں کو نگل رہی تھیں ـ تھکی ہاری رنڈیاں اپنے رات بھر کے خریداروں کے چنگل سے پنڈا چھڑا کر انہیں رخصت کر رہی تھیں ۔

"ہندوستان چھوڑ ـــــ"

"کوئٹ انڈیا ـــــ"

طعن اور نفرت میں ڈوبی آوازیں اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں ۔ اس نے ایک بار حسرت سے اپنی عورت کی طرف دیکھا جو وہیں پٹی پہ سر رکھ کر سو گئی تھی ۔ نلو مُنیا رسوئی کے دروازے میں ٹاٹ کے ٹکڑے پر سو رہی تھی ۔ ٹیپو اس کی کمر میں منہ گھسائے پڑا تھا ـــــ کلیجے میں ایک ہوک سی اُٹھی اور اس کی اصلی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میلی دری میں جذب ہو گیا ـــــ

برطانوی راج کی مٹتی ہوئی نشانی ایرک ولیم جیکسن نے ہندوستان چھوڑ دیا ـــــ

رفتم بجنازۂ یکے تن کہ فسرد
صد سال ز باغِ عیش گل چید و بمرد
گفتم چہ بروں برد ازیں باغ و بہار
گفتا دلِ پُرخوں کہ تو ہم خواہی برد

عرفی شیرازی

حیات اللہ انصاری

سربستہ راز

بڑی کی سفید ساڑی میں ملبوس للتا ننگے پاؤں سردی سے کانپتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے پر آئی اور اس کو دھکا دیا۔ وہ بلا آواز کے کھل گیا۔ اس نے ستیش کو اشارہ کیا اور ستیش نے گلی کی مٹیالی روشنی سے گذر کر للتا کی اندھیری ڈیوڑھی میں پاؤں رکھا۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔ — للتا کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور ستیش اس کی آواز سن رہا تھا۔ خود اس کا بھی دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھا چاہئے کس راز کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کے یہاں آنے میں للتا کی التجاؤں کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا تجسس کا —

"ڈیوڑھی پار کرنے سے پہلے ستیش نے للتا کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا —

"پہلے دیکھ لو کہ کوئی ہے تو نہیں!"

"تم گھبراؤ نہیں، کوئی نہیں ہے سوائے بہری مہراجن کے۔"

"مگر وہ بہری ہے، اندھی تو نہیں ہے۔"

"ہاں اندھی نہیں ہے لیکن اس سردی میں وہ رسوئی سے باہر نہیں آئے گی۔"

"اگر لوگ بیاہ سے جلدی لوٹ آئے؟"

"ابھی تو وہ پہنچے بھی نہ ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز بھول گئے ہوں؟"

"میں نے سب ضروری چیزیں یاد دلا دلا کر ساتھ کر دی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ کسی کی گرم چادر یا کمبل رہ گیا ہو؟ یا بچے کا موزہ وغیرہ —"

"واہ وا — اتنی سی بات کے لئے وہ لوگ آٹھ آنے پیسے رکھشا کے خرچ کریں گے۔" للتا کو یقین تھا کہ اس کا حساب کتاب بالکل پکا ہے اور تنہائی کے دو تین گھنٹے ان دونوں کے پاس صاف صاف بچتے ہیں۔

گھر کے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ صرف ایک لالٹین تھی جو سامنے کے دالان کے بیچ کے در میں بے حد مٹماتی ہوئی جل رہی تھی۔ اس کی چندھی روشنی میں دالان کے تینوں دروں کے علاوہ گھر میں جتنے در اور دروازے تھے سب سربستہ راز معلوم ہو رہے تھے۔ ستیش کو یہاں آ کر بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اس نے پوچھا "مہراجن کی رسوئی کس طرف ہے؟"

للتا ایک اندھیرے در میں گھس کر زینہ پر چڑھنے لگی اور دیا سلائی جلا کر ستیش کو روشنی دکھائی۔ جب ایک دیا سلائی بجھ گئی تو دوسری جلا دی۔ زینے سے گذر کر یہ لوگ ایک بہت ہی چھوٹے در اور ایک الماری والے کمرے میں پہنچ گئے۔ للتا نے تیسری دیا سلائی جلا کر ایک لالٹین

جلائی۔ اور پھر ستیش کو بہت محبت سے زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر کمبل ڈال کر بٹھا دیا اور خود الماری کھول کر ایک بستہ نکال لائی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔۔۔

"یہی وہ چیز ہے جو لالہ جی مرتے سمے مجھے سونپ گئے ہیں۔ جب بھی ان کو ہوش آتا تھا اور میرے سوا اور کوئی نہ ہوتا تو یہی کہتے تھے کہ اپنوں میں سے کسی کو نہ دکھانا میں نے سب کو آزما دیکھا ہے۔۔۔ ان میں سے کوئی ایماندار نہیں ہے۔ وہ تم کو دھوکا دے کر یہ سب اڑا لے جائیں گے۔ میں کہتی تھی کہ میں غیروں سے کیسے ملوں گی؟ وہ کہتے تھے کہ گھبراؤ نہیں بھگوان تمہاری مدد کرے گا۔ ان کو بڑا بھروسہ تھا بھگوان پر۔ ایک دن کہنے لگے کہ انیل بابو کا بیٹا ستیش بڑا کھرا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکے تو اس سے کام لینا۔ مگر دیکھو چاہے کچھ ہو جائے اس بستے کو اپنے کمرے سے کہیں اور نہ لے جانا۔۔۔ بات یہ ہے ستیش بابو! لالہ جی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اور ان کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ میرے سوتیلے بیٹے اور بھتیجے میرا ذرا بھی خیال نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے یہ دولت وہ میرے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ تم اس دولت سے کوئی دھرم شالہ یا مندر یا دودھ کا آشرم کھول کر وہاں اپنی مرضی کے مطابق رہنا۔۔۔

للتا نے کو سینے سے لگائے ہوئے تھی، آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز کانپ رہی تھی۔۔۔ لالہ جی نے دوسرا بیاہ کیا تھا اور للتا کو جب گھر لائے تھے اس وقت بھی وہ اتنی ہی دبلی پتلی اور سانولی تھی اور اس کی آنکھوں میں لجاجت تھی۔ وہ آئی تو تھی گھر کی مالکن بن کر لیکن اپنے ساتھ مشکل سے ڈھائی تین تو سے سونا لائی تھی۔ اس حقیر سرمائے کی وجہ سے وہ اپنے سوتیلے بیٹوں اور بہوؤں کی نظروں سے گری ہے تو پھر اس کی آٹھوں پہر کی خدمت ہو یا پیار بھری لجاجت، کوئی چیز بھی اس کو اٹھا نہ سکی۔ ستیش بچپن ہی سے گھر میں جاتا رہتا تھا پھر کچھ دنوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

لالہ جی کے مرنے کے کچھ دنوں بعد للتا کا ستیش سے سامنا ہوا تو وہ رونے لگی اور کہنے لگی کہ تم مجھے کیوں بھول گئے۔ یہاں سے پرانے تعلقات تازہ ہو گئے اور ستیش جانے آنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد للتا نے ستیش کو بلایا کہ میرے لئے لالہ جی ایک مہر بند بستہ چھوڑ گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اس معاملہ میں صرف ستیش سے مدد لی جائے۔

اس وقت بستہ دیکھ کر اور للتا کے جذبات محسوس کر کے ستیش کے دل میں لالہ جی اور للتا کی عزت بہت بڑھ گئی۔ سوچنے لگا لالہ جی کو اپنی کمزور بیوی کے آرام کا کتنا خیال تھا کہ وہ مرنے سے پہلے ایسا انتظام کر گئے۔ مگر یہ بھی کیسی افسوسناک بات ہے کہ ان کو اپنے خاندان میں ایک آدمی بھی ایماندار نہ ملا۔۔۔

"بیٹا جو کام کرنا دیانت سے کرنا۔ اسی میں عزت ہے اور اسی میں بھگوان ملتا ہے۔" ایماندار کا لفظ سن کر ستیش کو اپنے پتا جی کی نصیحت یاد آ گئی۔ پتا جی پکے دیانت دار تھے۔ تنخواہ کے علاوہ انہوں نے کبھی ایک پیسہ بھی کہیں سے نہ لیا تھا۔ ان کے چاروں طرف پیسے چلتے رہتے تھے۔ اس جیب سے نکل کر اس جیب میں گئے۔ ان کا حصہ بانٹ ہوا۔ دعوتیں ہوئیں، بوتلیں کھلیں اور ناچ گانا ہوا لیکن پتا جی کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا اور بلا پیسوں اور ان بوتلوں اور ناچ رنگ کے بھی ہر وقت ہنستے اور مسکراتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں ان کی خوشی کا سوتا کیا تھا۔ ستیش کو نوکر ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ اس نے بھی کبھی ایک پیسہ کسی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن اس میں اور پتا جی میں بڑا فرق تھا۔ پتا جی کو دوسروں کی رائے کی فکر نہ تھی۔ اس کو تھی۔ پتا جی کچہری پیدل جاتے اور آتے تھے۔ مگر ستیش اکے پر آتا اور جاتا تھا اور دولنے اور خرچ کرتا تھا۔ پتا جی صبح و شام ایک پیسے کی تمباکو حقہ میں پیا کرتے تھے۔ لیکن ستیش ایک آنے روز کی سگریٹ جلا کر خاک کر دیتا تھا۔

اس قسم کی سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ستیش ہر وقت فکرمند رہتا تھا۔ بیوی بیمار تھی۔ اس کے علاج کے لئے ایک پیسہ نہ تھا۔ بچہ ننگے پاؤں اسکول جاتا تھا اور اس کے ساتھی اس پر ہنستے تھے۔ عزیزوں کی شادی بیاہ کے موقع کو ستیش کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ دوستوں کا یہ مقروض تھا۔ اس وجہ سے ان سے آنکھیں چراتا تھا۔

للتا نے بستہ ستیش کو دے دیا اور اس نے گھر میں کھول کر کاغذوں کا ایک فائل نکالا۔ اس میں چھ سات مسلیں بھی تھیں۔ جن کے اوپر جگہ جگہ پرچوں پر نوٹ لکھ کر چپکا دئے گئے تھے۔ ستیش ایک مسل کھول کر پڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ جو نوٹ تھا اس میں لکھا تھا کہ فلاں ریاست نے کس طرح ٹیکس کی چوری کی۔ پہلے واقعہ کو تفصیل سے سمجھایا گیا تھا اور پھر یہ بتایا گیا تھا کہ اس سارے معاملہ کی کنجی راجہ صاحب کا ایک خط ہے جس میں پہلے "راج پور" کا لفظ تھا۔ لیکن ماخوذ ہوجانے کے بعد راج کو رام کر دیا گیا۔ اس غرض سے جیم کے اوپر کے سرے اور نیچے کی نوک کو مٹا دیا گیا۔ جانچنے والوں کو کافی روپیہ دے کر فیصلہ کرالیا گیا۔ یہ رام پور ہے۔ جس خط کا تذکرہ ہے وہ اس فائل میں موجود ہے۔ اگر خوردبینی شیشے سے دیکھا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ جیم کو مٹایا گیا ہے۔ یہ تحریر ایسی ہے کہ اگر عدالت میں پیش کر دی جائے تو راجہ صاحب کو سزا ہو سکتی ہے۔

آخر میں کہا گیا تھا کہ کوئی شخص جاکر راجہ صاحب سے تنہا ملے اور ان سے کہے کہ ان کا وہ خط جس میں "راج پور" کو "رام پور" بنایا گیا تھا میرے پاس ہے اور پندرہ ہزار روپیہ پر واپس کیا جاسکتا ہے —— راجہ صاحب اپنا فائل منگا کر دیکھیں گے۔ جب معلوم ہوگا کہ خط غائب ہے تو چپ چاپ پندرہ ہزار روپیہ دیدیں گے ——

جس ریاست کا نوٹ میں حوالہ دیا گیا تھا اس میں لالہ جی چھ سات سال ملازم رہ چکے تھے۔ اور ریاست داری کا سرٹیفکیٹ پا چکے تھے اور راجہ صاحب ان پر کافی مہربان تھے۔

ستیش کا یہ تحریر پڑھ کر جی متلانے لگا۔ کیا ایسے ہی کاموں کے لئے لالہ جی کو ایماندار آدمی کی تلاش تھی۔ للتا اس وقت نیچے تھی۔ تاکہ اگر کوئی شخص دروازہ کھٹکھٹائے تو وہ آکر جلدی سے ستیش کو پچھلی دروازے سے باہر نکال دے۔

ستیش سوچنے لگا کہ یہ عالم تھا ان لالہ جی کا جو اپنی دیانت داری کے لئے مشہور تھے۔ اس نے اس فائل کو آگے نہیں پڑھا! خط مذکورہ فائل سے نوچ کر نکال لیا اور نیچے چلا آیا—— للتا اس کو اتنی جلدی واپس ہوتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی۔

"ستیش بابو! کیا تم نے سب کچھ پڑھ لیا؟"

"اس میں پڑھنے کے لائق کچھ نہیں ہے۔ سب واہیات ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ لالہ جی نے ایسی حرکتیں کیں۔"

ستیش نے دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

(۲)

پندرہ ہزار۔ نہ دس نہ بیس۔ نہ سو نہ دوسو۔ نہ ہزار نہ دو ہزار۔ ایک دم سے پندرہ ہزار۔ پندرہ ہزار، پندرہ ہزار میں کیا نہیں ہو سکتا۔ مکان بن سکتا ہے —— کاروبار کیا جا سکتا ہے۔ بیوی کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ لڑکے کے لئے جوتا خریدا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دم سے حیثیت بدل سکتی ہے۔ جو لوگ آج مجھے ذلیل سمجھتے ہیں وہ عزت دار سمجھنے لگیں گے۔ اور سب کو ان سے جنتوں کو ذلیل

سمجھنے کا حق مجھے مل جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے پڑوسیوں۔ دفتر والوں اور افسروں کی تصویر سی گھومنے لگی۔

پندرہ ہزار ––– پندرہ ہزار!

ستیش خط کو اس فائل سے اس غرض سے نکال کر لایا تھا کہ اس کو پھاڑ کر پھینک دے گا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی وہ سوچنے لگا کہ مجھے عزت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح کہ میں ایمانداری دکھلا کر یہ خط پھاڑ کر پھینک دوں، یا اس طرح کہ ان سے پندرہ ہزار روپیہ وصول کر لوں۔ میری زندگی کس صورت میں بہتر رہے گی۔ اسی صورت میں کہ میں اس پندرہ ہزار کی رقم پر لات مار دوں، یا اس طرح کہ اس پر ہاتھ ماروں –––

اگر اس کے دل میں کوئی خیال نہیں تھا تو یہ کہ راجہ صاحب سے اس رقم کو وصول کر کے ایمانداری سے للتا کو دے دوں، تاکہ وہ دھرم شالہ یا مندر بنوا کر شان سے رہے۔

نوٹ:۔ اب سوال یہ ہے کہ ستیش کیا کرے گا؟ اس سوال پر ہمارا افسانہ ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ دونوں باتوں کا یکساں امکان ہے۔ ایک طرف اس کے سامنے اپنے پتا جی کی دیانتداری کا تصور ہے تو دوسری طرف لالہ جی کی دیانت داری کا۔ ایک طرف للتا کی قلبی مسکراہٹ ہے تو دوسری طرف اپنے بیوی بچوں کا خیال۔ ناظرین اپنے دل کو ٹٹول کر فیصلہ کریں کہ ستیش کیا کریگا۔۔۔

○

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالبؔ

احمد ندیم قاسمی

بھاڑا

میں نے اسے بچپن میں بھی دیکھا تھا۔ اگرچہ بچپن میں لڑکیاں خوبصورت ہوتی ہیں، بہت کم ایسی ہوں گی جن کے اعضا جوانی کی آمد میں جھول نہ جائیں یا تناسب نہ بگڑ جائے۔ ملکھاں انہی بہت کم لڑکیوں میں سے تھی۔ چودہ پندرہ برس بعد میں اسے دیکھتے ہی قائل ہو گیا ——— یہ ملکھاں دراصل ملکاں کا بگاڑ ہے اور ملکاں درحقیقت ملکہ ہے۔ اور اگرچہ ملکاؤں میں بعض بڑی بدہیئت شخصیتیں بھی گزری ہیں مگر ملکہ کے ساتھ حسن کا تصور ... کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں میں سے اگر ایک عورت کو منتخب کرنا ہو تو بد ذوق سے بد ذوق بادشاہ سے بھی حسن انتخاب سرزد ہو سکتا ہے۔

ملکھاں فقط حسن کے معاملے میں ملکہ تھی ورنہ دراصل وہ چھوکری تھی۔ میں نے اسے پندرہ برس کے بعد اس وقت دیکھا جب اس کے سر پر پانی سے لدے ہوئے دو گھڑے تھے اور وہ بائیں ہاتھ کو اوپر والے گھڑے کے ابھار پر رکھے اور دائیں ہاتھ کو تلوار کی طرح لہراتی ایک گلی کی بلندی طے کر رہی تھی۔ مشقت کے اس لمحے میں وہ مجھے اتنی خوبصورت لگی کہ اس کے جسم کے خطوط اور چہرے کے نقوش کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو صرف اتنا یاد آتا ہے کہ اس کے اٹھے ہوئے بازو پر سے زیادہ کرتے کی کھلی آستین اس کے کندھے تک ڈھلک گئی تھی۔ اور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو رہا تھا اور اس کی ناک کی نوک اور ٹھوڑی پر پسینے کے دو بڑے بڑے قطرے ٹپکنے کے لیے بے قرار تھے۔

مگر جب میں نے دو دن بعد اسے تنور کے سامنے بیٹھے دیکھا تو اس کے حسن نے اپنی تفصیل بیان کر دی۔ زمین میں دھنسے ہوئے بہت کھلے دہانے والے بڑے سے تنور کے پاس وہ یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پیچھے دیوار تھی۔ سامنے تپا ہوا تنور تھا اور تنور کے تین طرف کچے سے کھلے چبوترے پر گاؤں کی ایک ڈیڑھ درجن عورتیں مٹکوں میں گوندھا ہوا آٹا رکھے، اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ ملکھاں نے اپنے سر، چہرے، سینے اور دائیں بازو پر موٹے میلے کپڑے کی چوڑی چوڑی پٹیاں لپیٹ رکھی تھیں تاکہ جب روٹی لگانے کے لیے وہ تنور میں جھکے تو اس کے جسم کے یہ حصے جھلسنے نہ پائیں۔ یوں پٹیوں میں لپٹے ہوئے اس کے چہرے پر اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور یہی آنکھیں اس کے حسن کی تفصیل تھیں۔

ملکھاں کے بچپنے کے بعد میں نے گزشتہ پندرہ برس میں چند بار اسے ضرور دیکھا ہوگا ورنہ میں اسے پہچانتا کیسے۔ مگر یہ دیکھنا کچھ اس قسم کا دیکھنا تھا جیسے ایک مسافر چیت کے مہینے میں کھیتوں کی مینڈوں، سبزہ زاروں کی پھڑکیوں اور پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزر رہا ہو اور دیکھ رہا ہو کہ ہر طرف جنگلی پھول اگ رہے ہیں۔ اگ نہیں رہے ہیں، امڈ رہے ہیں۔ گلابی اور سوسنی، نیلے اور چٹے ——— موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ننھے ننھے ذرا ذرا سے پھول۔ جنہیں دیکھ کر مسافر کو اپنا سفر گلگشت معلوم ہو، لیکن جو منزل پر پہنچ کر ان پھولوں کی کوئی تفصیل بیان نہ کر سکے۔ میں مسافر ہی تو تھا جو سال دو سال میں اپنے گاؤں کا ایک آدھ چکر لگا لیتا تھا اور ملکھاں ہزاروں جنگلی پھولوں میں سے ایک پھول تھی، اور میں ان پھولوں کے بارے میں یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ پھول چار اور وہ پھول پانچ پتیوں پر مشتمل ہے یا اس پھول کی پتیوں کے کنارے گول اور اس کے دندانے دار ہیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک مجھ سے ملکھاں کی آنکھیں کیسے چھپی رہ سکتی تھیں۔ انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات

کا اظہار ادھورا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اُس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر آتے ہیں اور کہیں صحرا۔ کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔

اس کے باوجود پندرہ برس بعد جب میں نے ملکھاں کو گلی کی نکڑ پر دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی اور جب تک میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا، وہ ... بلائیں ... کے خیر مقدمی الفاظ بولتی میرے قریب سے نکل گئی تھی۔ لیکن دو دن بعد جب میں نے اسے تنور کے سامنے حفاظتی پیڑوں میں لپٹا ہوا دیکھا تو جس طرح اس روز اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا، اسی طرح آج اس کا سارا حسن اس کی آنکھوں میں رچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہاں نظر آ گئے۔ وہی ابہام جو تمازتِ حسن بھی ہے اور خمار آلود بھی۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں۔

بوڑھی عورتوں، جوان لڑکیوں اور کم سن بچیوں کا ہجوم بڑھتا رہا تھا۔ بعض "آ" ہیں گوندھ رہی تھیں اور غیر ہموار زمین پر ان کی جھانجھنیں بج رہی تھیں اور چوڑیاں کنگن بج رہی تھیں، اور بالیاں بالیوں سے بج رہی تھیں۔ اس مدھم منتشر مگر مسلسل موسیقی میں گھرا ہوا تنور دہک رہا تھا اور دہکتے ہوئے تنور میں روٹی لگائی جائے تو جھلس جاتی ہے یا لٹک کر گر پڑتی ہے۔ اسی لیے آنچ میں کمی کا انتظار ہو رہا تھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"بس اتنی سی دیر لگی کہ بچہ ہوا تو سب سمجھیں بھاگاں مر گئی۔ اور جب بھاگاں نے آنکھیں کھولیں تو بچہ مر چکا تھا۔"

"ہا — بیچاری کا تیسرا تھا"

"تیسرا کیوں نہیں ؟ پہلوٹھا کہو۔ شادی سے پہلے والا بھی تو گنو نا۔"

"خدا کے لیے ماسی" ملکھاں پہلی بار بولی۔ مگر اس کے ہونٹ بھی پیڑوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اس لیے اس کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "خدا سب کے پردے رکھے۔ آہستہ بولو۔ مرد لوگ بیٹھے ہیں۔"

میں تنور کے چبوترے سے جڑے ہوئے چھپر کے نیچے مرد لوگوں ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ ملکھاں کے شوہر نے مجھے اپنے بھائی کا خط پڑھنے کے لیے گلی میں سے بلا لیا تھا اور اگرچہ میں خط کب کا پڑھ چکا تھا مگر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ نوجوان چھبو زیلوں اطمینان سے حقے کے کش لگا کر دھوئیں کو اپنی گھنی مونچھوں میں سے گزارتا تھا جیسے تنور کے کنارے اس کی باورچی بیوی نہیں بیٹھی ہے، ایک مشین رکھی ہے اور ابھی جب شام گہری ہو جائے گی تو یہ مشین گوندھا ہوا ڈھیر سا آٹا اٹھا کر اس کے سامنے لا ڈالے گی۔ وہ جب حقے کا دھواں نکالتا تو قریب ہی کھڑا ہوا اس کا بڑا بیٹا دھوئیں میں سے بار بار ہاتھ گزار کر دھوئیں کو کاٹنے کی کوشش کرتا اور گھر سے کھٹولے پر لیٹا ہوا اس کا چھوٹا بچہ زور سے کلکاری مارتا۔ "مسو لوگ" بس انہی چار نفوس پر مشتمل تھے۔

ملکھاں نے قریب رکھی ہوئی کُوری میں سے چلو سے پانی لے کر تنور کے چاروں طرف بار بار چھڑکا تو تنور اژدہے کی طرح بار بار پھنکارا۔ ملکھاں کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے صحنک میں سے آٹے کا پیڑا اٹھا کر ملکھاں کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور ملکھاں بولی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔"

پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں چٹاخ پٹاخ بجاتے ہوئے ملکھاں نے کہا "ذرا چھوٹا پیڑا بنایا کر بہن۔ بڑے پیڑے کی روٹی موٹی بنتی ہے۔ کچی رہ جاتی ہے اور پھر تم نام دھرتی ہو۔" پھیلی ہوئی روٹی کو دائیں ہاتھ پر پھیلا کر ملکھاں گھٹنوں کے بل ذرا سی اٹھی، پھر جھکی اور دہکتے ہوئے تنور میں جیسے غائب ہو گئی۔ فوراً بعد وہ ابھری، پھیلے ہوئے ہاتھ پر دوسرا پیڑا لیا۔ چٹاخ پٹاخ روٹی بنائی اور پھر سے تنور میں جیسے اتر گئی۔

ایک بار نیا پیڑا لینے میں اسے ذرا سی دیر لگی تو میں نے دیکھا کہ تنور میں جھکتے ہی وہ تپش سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں میچ کر ان پر پلکیں پھیلا دیتی ہے اور جب تنور

سے ابھرتی ہے اور بھینچی ہوئی آنکھیں کھولتی ہے تو یہ ایسا لگتا ہے جیسے ان میں آگ بھر لائی ہے۔

روٹی کو دائیں ہاتھ پر رکھتے ہی وہ گھٹنوں کے بل اٹھتی تھی اور بائیں ہاتھ سے تنور کی منڈیر تھام کر آدھے دھڑ کو تنور کے حوالے کر دیتی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے اتنے کھلے اور اتنے گہرے تنور کے اوپر سے نیچے چاروں طرف روٹیاں لگاتے ہوئے وہ اپنا توازن کیسے قائم رکھتی تھی۔ مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ میرا دل بار بار کیوں ڈوبتا تھا اور ملکھاں کے شوہر کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی کہ "سدا جاؤ کے۔ اندر سے پنکھا اٹھا لا اور میاں جی کو جھل۔ پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔ دیکھئے میاں جی۔ روزی کی بات ہے ورنہ میں تو آپ کی مست کرتا کہ شہر کو گولی مار دیتے، دیکھئے تو آپ کیسے پیلے پیلے بالکل ہلدی سماں ہو رہے ہیں۔"

لڑکا سچ مچ میرے پنکھا جھلنے لگا اور ملکھاں بار بار لپکتے ہوئے تنور میں روٹیاں بھرتی رہی۔ ایک عورت سے اس کی تکرار بھی ہو گئی۔ ہر عورت پیڑے دے چکنے کے بعد گوندھے ہوئے آٹے کا بھاڑا ملکھاں کے حوالے کرتی تھی۔ یہ بھاڑا پانی والی دوری کے پاس رکھی ہوئی بڑی سی ایک صحنک میں جمع ہو رہا تھا۔ بھاڑا روٹیوں کی تعداد کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا تھا مگر اس عورت نے چھ پیڑے دینے کے بعد ملکھاں کو جو بھاڑا دیا وہ اتنا کم تھا کہ دوسری عورتیں بھی حیران رہ گئیں۔ ملکھاں نے بھاڑا ہاتھ میں لے کر اسے ایک گیند کی طرح انگلیوں کی پوروں میں گھمایا اور بولی "بیٹی لڑکیاں اپنی گڑیوں کے لیے جو روٹیاں پکاتی ہیں، ان کا پیڑا بھی اس بھاڑے سے تو بڑا ہی ہوتا ہے۔ دیکھ بہن۔ میرے بچوں کا ابا دن بھر جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر جھاڑ جھنکار کے ڈھیر لاد لاتا ہے۔ اس سے میں تنور تپاتی ہوں۔ پھر اپنے آدھے دھڑ کو ہار کی اس گرمی میں، اس دوزخ میں بار بار جھونکتی ہوں۔ اس پر بھی اگر مجھے اپنی محنت کا یہ بھاڑا ملے تو بہن۔ اس سے تو اچھا یہ ہے کہ تو مجھے بھاڑا نہ دیا کر، میرے بچوں کے لیے دعا کر دیا کر۔"

عورت چلا اٹھی "تو کیا میں فقیرنی ہوں کہ تجھ سے مفت میں روٹیاں پکواؤں ؟"

ملکھاں نے جواب دیا "فقیر ہم بھی نہیں ہیں بی بی۔ ہم بھی اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں، بھیک نہیں مانگتے۔"

عورت نے پھر کوئی جواب دیا۔ دوسری عورتیں بھی بولنے لگیں۔ ملکھاں نے بھی کوئی بات کی مگر پھر اس نے پوروں میں تھمے ہوئے آٹے کو بھاڑے والی صحنک میں دے مارا اور نئے پیڑے کے لیے ہاتھ یوں تیزی سے پھیلایا جیسے میان سے تلوار نکالی ہے۔ خاموشی چھا گئی۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں لڑتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی کالی سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملکہ کے چہرے پر ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔

تنور کی سب روٹیاں اتر گئیں تو ملکھاں اٹھی۔ عورتیں چبوترے کے کنارے تک ہٹ گئیں اور ملکھاں کے شوہر نے صحن کے گوشے میں پڑے ہوئے جھاڑ جھنکار کے ایک انبار پر ہاتھ مارا۔ ایک ڈھیر اٹھا کر تنور میں جھونک دیا۔ شعلہ ایک دھماکے کے ساتھ بلند ہوا۔ لکڑیاں جیسے چٹکیاں بجانے لگیں۔ چنگاریوں کا ایک فوارہ آسمان کی طرف چھوٹا اور تنور پھر سے تپنے لگا۔

ملکھاں جو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یکایک وہاں سے ہٹی اور اپنے چھوٹے بچے کے پاس آ گئی۔ میں نے صرف آنکھیں دیکھنے کے لیے اس سے پوچھا "اس کا کیا نام رکھا ہے ؟"

"بازا" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اور اس کے ہونٹوں نے جو پٹیوں میں چھپے ہوئے تھے، اپنی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے حوالے کر دی۔ اللہ اکبر! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں۔

میں نے اس سے بڑے بیٹے کا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ کیا انہیں پڑھاؤ لکھاؤ گی ؟ پھر یہ کہ تمہارا دیور لائل پور کی کس مل میں ملازم ہے اور تمہارے شوہر کو کچھ بھیجتا ہے یا جو کماتا ہے وہ کھا جاتا ہے؟ ان سوالوں کا مجھے صرف ایک ہی جواب درکار تھا اور یہ جواب اس کی آنکھیں تھیں۔

میں نے ان چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اس کی آنکھوں کا مطالعہ کیا۔ میں "بڑی تفصیل" کی جگہ "جی بھر کر" کے الفاظ بھی استعمال کر سکتا تھا مگر ایسا کر کے میں جھوٹا بھی بولتا اور ان آنکھوں کی ہتک کا بھی مرتکب ہوتا۔ اگر ان آنکھوں کو جی بھر کر دیکھا جا سکتا تو وہ عام آنکھیں ہوتیں مگر وہ عام آنکھیں نہیں تھیں۔

ان آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ اگر رات اتنی سیاہ ہوتی سورج کو طلوع ہونے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی۔ سفید حصہ اتنا سفید تھا کہ ہلکا نیلا ہو رہا تھا۔ ڈوروں کا گلابی رنگ شاید تنور کی آنچ کی وجہ سے سرخی میں بدل گیا تھا۔ ان آنکھوں پر لمبی لمبی گنجان پلکوں کی چھاؤنی چھا رہی تھی۔ پلکوں کی یہ قوسیں جیسے آنکھوں کے خزانے پر کمانیں تانے پہرہ دے رہی تھیں۔ وہ پلکوں کو بہت نرمی سے جھپکتی تھی۔ نہایت آہستہ! جیسے اسے نیند آ رہی ہے مگر وہ نیند کو روک رہی ہے۔

میرے سوالوں کی بوچھاڑ کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس نے اپنی آنکھیں جھکالیں اور جھکائے رکھیں۔ مجھے اپنے ندیدے پن سے دوہری کوفت ہوئی۔ ایک اس لیے کہ وہ کسی حد تک میرا مقصد بھانپ گئی تھی۔ اور دوسرے اس لیے کہ وہ جھکی ہوئی آنکھیں لیے تنور کی طرف پلٹ گئی۔

شعلے بیٹھ گئے تھے اور تنور کی دیواریں دہکنے لگی تھیں۔ ملکھاں تنور کی طرف چل دی تھی اور اس کی جگہ اس کا شوہر میرے پاس آ گیا تھا۔ تنور کے کنارے بیٹھ کر اس نے ماتھے کی پٹی کو بھووں تک کھینچا اور دائیں بازو کی پٹی کی ڈھلکتی ہوئی ایک دھجی کو وہیں کہیں اڑس کر تنور میں جھانکی اور شوہر سے بولی "حقہ تازہ کر کے میاں جی کو بھی پلا۔ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔ کیا کہیں گے!"

چوپال پر آ کر میں نے تنور میں روٹیاں لگانے کے سلسلے میں جھیورنوں کی بے پناہ مشقت کا ذکر چھیڑا تو سب میرے پیچھے پڑ گئے۔ سب کو شکایت تھی کہ جھیورنیں تو مفت کا بھاڑا لیتی ہیں ——— اور پھر جو کچھ کماتی ہیں وہ اتنا بہت سا ہوتا ہے کہ پورا کھا بھی نہیں سکتیں۔ بڑے گھروں کی وہ عورتیں جو آٹا گوندھنے کا وقت نہیں نکال سکتیں، کہلوا بھیجتی ہیں کہ اتنی روٹیاں بھجوا دو۔ یہ روٹیاں اسی بھاڑے سے پکتی ہیں اور بدلے میں مہینے آدھ مہینے بعد جھیورنیں ہر گھر سے من من آدھ آدھ من گندم سمیٹ لے جاتی ہیں۔ پھر بھی آٹا بچ جاتا ہے اور وہ الٹے مٹکوں پر آٹے کی موٹی موٹی رسیوں کی سی سویاں بٹتی ہیں اور انہیں گڑ کے بھاؤ بیچتی ہیں۔ آپ شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کیا جانیں کہ یہ جھیور، موچی، لوہار کمہار ہمیں کس کس طرح دونوں سے لوٹ رہے ہیں!"

ملکھاں کے دونوں ہاتھ میرے سامنے ابھرے۔ آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ جو پیڑے کو روٹی میں بدلنے کے لیے حرکت میں آئے تو جیسے کائنات تخلیق ہونے لگی۔ ملکھاں کا دایاں بازو کندھے تک پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور اسی ہاتھ پر پھیلی ہوئی روٹی تھی۔ بایاں ہاتھ تنور کی منڈیر کو جکڑے ہوئے تھا اور تنور کی دیوار تانبا ہو رہی تھی اور نیچے تہہ میں انگارے دہک رہے تھے۔ پھر ملکھاں نے گھٹنے ٹیکے، جھکی اور اس کا آدھا دھڑ تنور میں غرق ہو گیا اور اس کا بیٹا میرے پنکھا جھلنے لگا۔ اور چوپال پر سے آواز آئی کہ جیسی گرمی اب کی سال پڑی ہے ویسی پچھلی ایک صدی سے نہیں پڑی۔ پھر جب ملکھاں اٹھی اور پٹیوں میں لپٹے ہوئے چہرے پر اس کی میچی ہوئی آنکھیں کھلیں تو جیسے وہ شعلے پی آئی تھیں۔ یہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوتا تھا، سلگ رہی تھیں اور ان کے ڈوروں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں اور ان کے پپوٹوں پر کاجل کی بجائے راکھ کے ذرے بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے گوندھے ہوئے آٹے کے ذرا ذرا سے بھاڑے کے گولے ناچ رہے تھے۔

لوگ جب گرم گرم روٹیاں کھاتے ہیں تو اگر ملکھاں کے ہاتھوں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو اس کی ان آنکھوں کو کیسے بھول جاتے ہیں جو اگر ملکھاں کی بجائے ان کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے چہرے پر ہوتیں تو وہ دنیا کے سارے تنکے اپنی آنکھوں میں بھر لیتے تاکہ ان کے پیاروں کی آنکھیں محفوظ رہیں۔

گاؤں میں قیام کے دوران میں ملکھاں کو میں نے اس کے بعد دو بار دیکھا۔ ایک بار وہ ٹین کے ننھے سے چراغ میں مٹی کا تیل ڈلوا کر نکلی تو ادھر سے میں گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی "رد بلائیں دور بلائیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لمحے کو ذرا سا طول دینے کے لیے پوچھا "چراغ میں تیل ڈلوایا ہے؟" جواب میں اس نے "جی" کہا مگر یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں جھکالیں اور میں جیسے تنور میں اتر گیا۔

دوسری بار میں ایک بھونڈا سا بہانہ بنا کر ملکھاں کے ہاں اس وقت جا نکلا جب عورتیں سروں پر چنگیروں سے ڈھکی ہوئی مٹکیں رکھے روٹیاں پکوانے جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کا شوہر گھر میں نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے اسے چوپال کی گلی میں سے جاتا ہوا دیکھ آیا تھا مگر میں نے آتے ہی اسی کا پوچھا۔ ملکھاں تنور کے سامنے پٹیوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی اور تنور کی آنچ میں کمی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھیں جھکالیں اور بولی "جی وہ روضے شریف پر سے خاکِ پاک لانے گیا ہے۔"

ننھے کو ٹہلانے کے لیے۔ کل سے اسے عجیب سی کھانسی اُٹھ رہی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کہنے کا مقدور ہی نہیں تھا اور اگر میں کچھ کہنے کی ہمت کر بھی لیتا تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا کہ یوں آنکھیں نہ جھکا لیا کرو۔ اس طرح آسمان بالکل سر پر جھک آتا ہے۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کچھ کہنے کا یارا نہیں تو پلٹ کر دیکھ ہی لوں۔ مگر میری یہ حرکت میرے بہانے سے بھی زیادہ بھونڈی ہوتی۔ سو چلا آیا۔ مگر اب یہ مشکل آ پڑی کہ میں جب بھی ملکھاں کی آنکھوں کو تصور میں لاتا، انہیں جھکا ہوا ہی پاتا۔ میں اپنے آپ سے لڑتا رہا کہ آخر ایسا بھی کیا۔ آخر میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بھی تو دیر تک اور اتنے قریب سے دیکھا ہے اور ان میں وہ کچھ پایا ہے جو پوری زندگی میں نہیں پایا۔ پھر جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مُند کیوں جاتی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ کل شام اس کے ہاں جا کر بے حیاؤں کی طرح بیٹھ جاؤں گا اور اس سے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کروں گا۔ اور جب وہ اپنی آنکھوں کی پوری لمبائی اور گہرائی سے مجھے ایک بار دیکھے گی تو میں فوراً وہاں سے اُٹھ آؤں گا تاکہ ان بھرپور آنکھوں کے تصور سے میرا ذہن ہمیشہ جاگتا رہے۔

دوسرے دن شام سے پہلے مجھے ایک معقول بہانہ بھی سوجھ گیا۔ آخر اس کا بچہ بھی تو بیمار تھا۔ اور جب میں بچے کی مزاج پرسی کروں گا تو اس کی آنکھیں یقیناً جھکنا بھول جائیں گی۔

میں گھر سے نکلا۔ ابھی ملکھاں کے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ یکایک بہت سی عورتوں کی چیخیں ایک طوفان کی طرح اٹھیں۔ پھر آس پاس کی گلیوں میں سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور ملکھاں کے گھر میں گھس گئے۔ پھر مردوں کی اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں اور عورتوں کی چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں۔

میں بھاگا اور ملکھاں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ملکھاں کے سر پر جیسے ہی دروازہ پر پہنچی پرانی ٹیوں کو نوچ کر پھینک دیا گیا تھا اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اور عورتیں ایک نو وارد عورت کو بتا رہی تھیں۔ تنور اس سے جھاڑ لے کر اس نے صحنک میں رکھا پھر ایک پیڑے کی روٹی بنا کر تنور میں تھپکی تو تنور کی منڈیر ٹوٹ گئی اور وہ دوسرے کے بل تنور کی تہہ میں جا گری۔ گھر والے ادھر ادھر کرنے لگے، ادھر اس کا گھر والا بجلی کی طرح آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکال لیا۔ قدرت خدا کی کہ جو حصہ انگاروں پر گرا اس پر پٹیاں بندھی تھیں اس لیے بچ گئی۔ بس یہ ہوا ہے کہ بے چاری کی آنکھیں جھلس گئی ہیں۔"

تعمیرِ ما خرابیٔ ما استوار کرد
گوئی کہ سودِ ماست نظیری زیانِ ما

نظیری نیشاپوری

ادب لطیف

اے۔ حمید

بنگالی لڑکی

چندر نگر اگرچہ فرانسیسی نوآبادی تھی لیکن یہاں آبادی بنگالیوں ہی کی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا بڑا خوبصورت علاقہ تھا جس کی سڑکیں صاف ستھری تھیں اور پرانے مندروں کے گنبدوں پر کائی جم رہی تھی۔ انور نے کچھ پہلے یہاں آکر ایک ہوٹل میں نوکری کر لی تھی جہاں شراب اور بیئر عام ملتی تھی۔ دوپہر کے بعد چار بجے تک یہ ہوٹل یا بار بند ہو جاتی تھی اور شام کو دوبارہ کھلتی تھی۔ اس دوران میں انور اکیلا اس چھوٹے سے شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ دریائے ہگلی یا جمنا اس شہر کے پہلو سے ہو کر گزرتا تھا۔ شہر سے باہر جہاں کالی گھاٹ تھی وہاں شام کو خوب دلچسپ ہوا کرتی۔ عورتیں، مرد، بچے وہاں آکر دریا کی سیر کرتے۔ غریب مانجھی ایک پیسے میں دریا کے پورے پاٹ کی کشتی میں سیر کرا دیتے۔ کبھی کبھی دریا میں رنگون اور دوسرے ملکوں کو جانے والے بحری جہاز بھی گزرا کرتے۔ ڈیک پر کھڑے ہو کر لوگ ساحل دریا کا تماشہ کیا کرتے اور ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتے۔ مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے جہاز کے اوپر منڈلایا کرتے۔

کالی گھاٹ سے کچھ ہی دور ناریل کے جھنڈوں تلے درگا دیوی کا ایک مندر تھا۔ یہ چھوٹا سا مندر بڑا پرانا تھا۔ اس کی دیواریں کالی پڑ گئی تھیں اور برجیوں کی دیواروں میں ننھی ننھی چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ انور جب سویرے دریا کنارے سیر کرنے آتا تو اس مندر کے قریب ہو کر گزرتا۔ اسے اس مندر کے پراسرار ماحول سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ وہ درگا دیوی کے نام اور اس کی دیومالا یا اس کی تاریخ سے بالکل ناآشنا تھا مگر کبھی کبھی اس مندر سے آتی ہوئی کیرتن کی آواز سن کر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی دوست کئی سو سال سے اسے مسلسل آوازیں دے رہا ہے۔ اسے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ اس نے اس مندر کے کئی سکیچ بنائے تھے۔ کئی واٹر کلر اور آئل کلر تصویریں بنا لی تھیں۔ ایک روز وہ اس مندر کے اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں کھڑے ایک پروہت نے کانسی کی پیالی میں بھگوئے زعفران سے اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ چھت سے لٹکے ہوئے گھنٹے کو انور نے بھی دوسرے پجاریوں کی دیکھا دیکھی ہاتھ سے بجایا اور اگلے دیوان میں آ گیا۔ یہاں چھوٹا سا کمرہ لوبان اور عود عنبر کی تیز خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہا تھا۔ ایک بھاری بھرکم پروہت صرف یہاں دھوتی باندھے گلے میں جنجو ڈالے تانبے، پیتل اور رتن جوت کے سفید پھولوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھا اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اور ماتھا ٹیکنے والے پجاریوں سے پیسے لے کر انہیں بتاشے اور پھول دے رہا تھا۔ سامنے دیوار میں درگا دیوی کا بت ابھرا ہوا تھا اور سر سے لے کر پاؤں تک سرخ سرخ سیندور میں لتھڑا ہوا تھا۔

پہلی بار درگا وتی کو انور نے اسی مندر میں دیکھا۔ سانولے رنگ کی دبلی پتلی بنگالی لڑکی ——— کالی کنی والی سفید ساڑھی، ماتھے پر رام نام کا تلک، لمبے کالے بال کھلے، ہاتھوں میں پیتل کی تھالی جس میں لوبان اور پوجا کے پھول تھے ——— بڑی بڑی کالی آنکھوں میں محبت اور عقیدت کی مقدس خاموشی اور نیم وا ہونٹوں پر درگا دیوی کے بنگالی بھجن ——— درگا وتی کی سانولی نازک کلائیوں میں سندھوری رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ انور کو یوں لگا جیسے وہ بنگال کے جنگلوں میں ارغوانی شام کو غروب ہوتے دیکھ رہا ہے

ادبِ لطیف

درگاوتی کے رنگ اور اس کے بدن کے نازک خطوط اور ان تمام باتوں کے ایک مجموعی اداس موڑ نے انور کو بڑا متاثر کیا۔ اب وہ ہر روز صبح درگا دیوی کے مندر کی سیر کو جانے لگا۔ تقریباً ہر روز درگاوتی سے انور کی ملاقات ہو جاتی۔ ملاقات ان معنوں میں کہ وہ درگا کو مندر میں پوجا کرتے دیکھ لیتا۔ ابھی تک وہ اس سے کسی قسم کی بات نہیں کر سکا تھا۔

ایک روز انور مندر سے نکل کر گھاٹ کی طرف والے بانس کے درختوں میں ایک پتھر پر بیٹھ کر درگا کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ درگاوتی ہر روز ادھر ہی سے گزرتی ہے۔ چونکہ وہ بالکل تنہا ہوتی تھی اس لیے انور کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ یہیں کہیں پاس ہی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے درگا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ آج اس نے ہلکے سبز رنگ کی بالکل سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا اور بال کمر پر کھلے تھے۔ بازو پہلوؤں کی طرف سمٹے، دبلے پتلے بدن کو چرائے وہ کسی جوگن ایسے وقار اور کنواری لڑکی ایسی حیا کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ انور نے سگریٹ پھینک دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس لڑکی سے کس زبان میں بات کرے؟ وہ بنگالن تھی اور انور پنجابی۔ نہ وہ پنجابی زبان جانتی تھی اور نہ انور بنگالی سے واقف تھا لیکن بنگال میں ٹوٹی پھوٹی اردو خوب چلتی تھی۔ ٹھیک ہے درگا سے اسی زبان میں بات کی جائے۔

جب درگا قریب سے گزرنے لگی تو انور ذرا سا کھنکارا۔ بنگالن لڑکی نے گردن موڑے بنا ہی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ انور نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کر دیا۔

درگا کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا اور اس کی چال اکھڑ گئی۔ انور نے درگا کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آ گیا۔ دوسرے روز وہ مندر میں جانے کی بجائے کالی گھاٹ کے موڑ پر دہیں بانسوں کے جھنڈ تلے بیٹھ گیا اور درگاوتی کی راہ دیکھنے لگا۔ اس روز پھر انور نے درگا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ پہلے روز تو درگا نے انور کو آنکھیں گھما کر دیکھ لیا تھا لیکن آج اس نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ یعنی آج وہ پہلے روز سے زیادہ دیکھ رہی تھی۔ پہلے سے زیادہ انور کے پرنام کا جواب دے رہی تھی۔ اور پہلے سے زیادہ انور کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔ اسی طرح جب چار پانچ روز محض پرنام کرتے گزر گئے تو انور کا پنجابی دل بے قرار ہو گیا۔ اس نے چھٹے روز درگا کا تعاقب کر کے اس کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا۔ اور اطمینان سے واپس آ گیا۔

درگاوتی چندر نگر کے ایک معمولی سکول ماسٹر کی لڑکی تھی۔ ان کا گھر سٹیشن سے دریا کی طرف جانے والی سڑک کے پہلو میں ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ مکان کیا تھا۔ بس دو کمروں والا ایک پرانا کوارٹر تھا جس کے چھوٹے سے صحن کی دیواروں پر بارش کی وجہ سے کائی جم رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ رتن جوت کے گملے رکھے تھے۔ دونوں کمروں کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ جن میں سلاخیں لگی تھیں۔ اور کھدر کا چھاپ دار پردہ گرا تھا۔ صحن میں ایک طرف رسوئی تھی جس کے پاس ہی دیوار کے ساتھ ایک تخت پوش بچھا تھا۔ اس پر بیٹھ کر درگاوتی کی ماتا جی ترکاری وغیرہ بنایا کرتیں یا فرصت کے وقت بیٹھ کر چھالیہ کترا کرتیں۔ اس گھر میں درگاوتی کے ماں باپ کے علاوہ اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی رہتا تھا۔ اس کا نام رتو تھا۔ رتو اسکول میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ انور نے درگا کے باپ کے اسکول کا پتہ لگا لیا اور کسی نہ کسی طرح ان سے واقفیت پیدا کر لی۔ انور نے ماسٹر جی کی ایک تصویر بھی بنائی۔ جب ماسٹر نے اپنے چھوٹے لڑکے رتو کی شرارتوں کا ذکر کیا تو انور نے فوراً خواہش ظاہر کی کہ وہ رتو کی تصویر بنانا چاہتا ہے۔

اور یوں انور ایک شام ماسٹر جی کے ساتھ درگاوتی کے گھر میں داخل ہوا۔ انور نے جب درگاوتی کو پرنام کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے

انور کو فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی لڑکا ہے۔ اور سمجھ گئی کہ وہ محض اس کی خاطر وہاں آیا ہے۔ درگا کو اپنے آپ پر کچھ فخر بھی محسوس ہوا اور کچھ شرم بھی آئی کہ ایک ناواقف مرد اس کی محبت کا دم بھرنے لگا ہے۔ درگا وتی کی ماتا جی نے انور کو بیٹھنے کے لیے چوکی دی۔ مگر ماتا جی اسے اندر کمرے میں لے گئے۔ جہاں رتو پلنگ پر بیٹھا ڈبیوں کا گھر بنا رہا تھا۔ کالا کالا بڑا ہی معصوم بچہ تھا جیسا کہ عام طور پر بنگالی لڑکے ہوا کرتے ہیں۔ انور نے اسے کھانے کے لیے جیب سے چاکلیٹ دیئے۔ تحریر کار شکاری کی طرح وہ اپنے جھولے میں اس قسم کے سب ہتھیار ساتھ لے گیا تھا۔—— انور کے لیے چائے کا ٹرے لیے درگا وتی اندر آئی۔ میز پر ٹرے رکھ کر اس نے ساڑھی کا پلو سر پر درست کیا اور اپنے پتا جی اور انور کے لیے چائے بنانے لگی انور نے کہا۔

"چینی ایک ٹھپ چمچ صرف"

درگا وتی کے ہاتھ میں چمچ کپکپایا۔ بھولی سی بنگالی لڑکی اس بات کو بڑی اہمیت دے بیٹھی تھی کہ انور اس سے محبت کرنے لگا ہے اسے اس بات کی خبر تک نہ تھی کہ انور ان باتوں کا قائل ہی نہیں۔ اب انور نے رتو کی تصویر بنانا شروع کر دی۔ وہ جان بوجھ کر تصویر کے کام کو طول دے رہا تھا۔ اس نے رتو کے کتنے ہی پنسل سکیچ بنائے اور ضائع کر دیئے۔ اس دوران میں وہ بلاناغہ ہر شام کو درگا کے گھر آتا۔ رتو کو پلنگ پر روشنی میں بٹھلا دیتا۔ رتو کھلونوں وغیرہ سے کھیلتا رہتا اور انور جلدی جلدی سکیچ بناتا رہتا۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ درگا کو کمرے سے رسوئی اور رسوئی سے صحن میں آتے جاتے دیکھتا رہتا۔

کبھی کبھی درگا وتی بھی اسے نگاہیں چرا کر دیکھ لیتی۔ دونوں کی نگاہیں ملتیں تو دونوں پر ایک دوسرے کے چور اور گنہگار ہونے کا راز کھل جاتا اور دونوں ہی شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیتے۔ یہ کنبہ بڑے سیدھے سادھے شریف لوگوں کا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص دوسرے شہر سے ان کے گھر آ کر انہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ دراصل انور انہیں دھوکا دینا چاہتا بھی نہیں تھا۔ انور اتنا عام یا دنیادار آدمی نہیں تھا۔ اسے درگا وتی اچھی لگی تھی اور وہ کچھ وقت اس پراسرار، عیر دلچسپ اور سپاٹ سی بنگالی لڑکی کی صحبت میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ درگا پورے بنگالی کلچر، بنگالی تہذیب اور بنگالی مزاج کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس ایک نقطے میں انور کو بنگال کی تمام خصوصیات اکٹھی مل گئی تھیں۔ ایک اس آواز میں انور کو بنگال کی تمام آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکشا کھینچنے والے ہانپتے بنگال کے سانس کی آواز، فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والی بڑھیا کی عاجزی، دوپہر کی اداس فضا میں ساکن تالاب میں گاگر کی ڈبڈباہٹ، بوجھل شام کے سایوں میں گھروں کو لوٹتی گایوں کے ڈکرانے کی آوازیں، اور چاندنی راتوں میں مچھلیوں کے شکار میں نکلے ہوئے، نیند کے مارے، بھوک کے مارے ماہیگیروں کی درد بھری، نیند بھری آواز —— درگا وتی بنگال کے تاڑ کی شاخوں میں لگا ہوا تاڑی کا پھل تھا۔ جس کا رس تیز دوپہر کی گرمی میں اندر ہی اندر پک رہا تھا اور ہلکی ہلکی نشہ آور خوشبو چھوڑ رہا تھا۔ انور پر اس خوشبو نے جادو سا کر دیا تھا۔ وہ سرپھرے بھونرے کی طرح تاڑی کے اس سخت پھل کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس جگہ اپنا منہ رکھے اور کس جگہ اپنی آنکھیں۔

وہ درگا وتی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ درگا وتی کو خراب بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ درگا کی یاد میں آہیں بھی نہیں بھرنا چاہتا تھا۔ نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ درگا اس کی یاد میں روتی پھرے۔ وہ درگا کو اغوا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ درگا کو اس بات کا بھی احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ وہ درگا وتی کو پسند کرتا تھا۔ جس طرح وہ بنگال کو پسند کرتا تھا۔ اسے درگا وتی کے محور پر پورا بنگال گردش کرتا نظر آ رہا تھا۔ اور وہ گھر سے بنگال دیکھنے۔ بنگال کو سونگھنے اور بنگال کو ہاتھ لگا کر محسوس کرنے نکلا تھا

ادب لطیف

جس طرح بمبئی کی ایک گھاٹن میں اس نے پورے مہاراشٹر کی بھرپور جھلک دیکھ لی تھی۔ اسی طرح اسے درگا دتی کے روپ میں بنگال کا ایک ایک ذرہ چمکتا، ٹمٹماتا، رقص کرتا نظر آرہا تھا۔ وہ درگا کو زیادہ سے زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ہندوستانی عورت جب کسی مرد کے زیادہ سے زیادہ قریب آتی ہے تو پھر اسے زیادہ سے زیادہ اپنے قریب رکھتی ہے۔ وہ اسے اپنے چنگل میں اس بری طرح پھنسا لیتی ہے کہ مرد لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اس تیندوے کے جال سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ وہ پورے سمندر کی جھلک دکھا کر اپنے کنوئیں میں ہمیشہ کے لیے بند کر لیتی ہے وہ مرد کو پسند کرتی ہے تو اس سے محبت کرنے لگ جاتی ہے محبت کرتی ہے تو شادی ضرور کرتی ہے اور جب شادی کر لیتی ہے تو کم از کم دو تین بچے تو ضرور پیدا کرتی ہے اور جب ایک بار بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر محبت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر وہ ماں بن کر اپنے بچوں اور اپنے خاوند کی دیکھ بھال شروع کر دیتی ہے۔ مرد عورت سمجھ کر اس کے پاس جاتا ہے اور وہ ماں بن کر اسے سینے سے لگا لیتی ہے۔ اس کی محبت شادی پر اور شادی موت پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت شادی کا پیش خیمہ اور شادی موت کی جڑ ہے اور یوں موت کا یہ ایک ایسا چکر چلتا ہے جس میں جذبات، فلسفہ، گیان، یوگ، بھگتی، مکتی، ادب، آرٹ اور فن کے تمام نظریات خاک کے ذرات بن کر اڑتے نظر آتے ہیں۔ انور عورت اور محبت کے انجام سے پوری طرح باخبر تھا۔

لیکن درگا دتی ہندوستانی اور سب سے بڑھ کر بنگالی عورت تھی۔ پنجابی عورت شادی کے کچھ عرصہ بعد تک بھی عورت رہتی ہے مگر بنگالی عورت شادی کے دوسرے ہی روز ماں بن جاتی ہے۔ پھر آپ لاکھ ماریں پیٹیں، اس کے منہ سے دعاؤں کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ یہ بنگالی عورت کی سرشت ہے اور اسی سرشت سے انور خائف تھا۔ وہ عورت کو ہر روپ میں دیکھنے پر راضی تھا۔ مگر بیوی عورت کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ درگا کے کردار میں بنگالی کردار کی حقیقت کام کر رہی تھی۔ جب سے انور اس کے گھر اس کی دیدی رنو کی تصویر بنانے آنا شروع ہوا تھا۔ درگا دتی نے اندر ہی اندر انور سے محبت کرنی شروع کر دی تھی۔ لیکن اس نے اس محبت کو ایک خاص   سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ایک تو انور بنگالی نہیں، دوسرے وہ مسلمان ہے۔ اس کی حالت بالکل اس کوچوان کی سی تھی جو میدان کے بیچ میں کھڑا منہ زور گھوڑے کو رسی سے باندھے دائرے کی شکل میں دوڑا رہا ہو۔

درگا نے اپنے جذبات کے گھوڑے کو ایک چکر میں ڈال دیا تھا اور خود رسی تھامے بڑے آرام سے بیچ میں کھڑی تھی۔ وہ محبت کے خوابوں سے لذت یاب بھی ہو رہی تھی اور اس کے صاف نظر آتے خوفناک انجام سے توبہ بھی کر رہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انور کا تصور اسے وقت بے وقت پریشان کرنے لگا تھا۔ مندر میں دیوی کی پوجا کرتے وہ دیکھتی کہ انور دیوی کے پاس کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ وہ فوراً آنکھیں بند کر لیتی اور ہری رام کا جپ شروع کر دیتی۔ وہ اس تصور کو پسند بھی کرتی تھی اور اس سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتی تھی۔ پسند اس لیے کرتی تھی کہ وہ انور کو پسند کرتی تھی اور پیچھا اس لیے چھڑانا چاہتی تھی کہ انور اسے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ یعنی وہ انور سے کبھی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی بچے پیدا نہیں کر سکتی تھی کبھی اسے اپنے ساتھ موت کے کنوئیں میں بند نہیں کر سکتی تھی۔

درگا اتنا ضرور چاہتی تھی کہ انور کسی روز، کسی وقت جب وہ کمرے میں اکیلی ہو تو اس کا دامن ہولے سے پکڑ کر کھینچ لے۔ جب وہ پاس سے گزرے تو اس کا ہاتھ تھام کر کہے۔

"درگا، مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے دی!"

ہائے رام! درگا شرم سے لال ہو گئی۔ وہ پانی کے نل پر گاگر بھر رہی تھی۔ انور اندر اس کے پتا جی کے پاس بیٹھا انھیں رتو کی مکمل

شاید تصویر دکھا رہا تھا۔ وہ کنکھیوں سے کتنی ہی دیر انور کو دیکھتی رہی۔ آج پہلی بار وہ اس اجنبی کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ انور کی بھی درگا وتی پر نگاہ پڑ گئی۔ درگا نے فوراً آنکھیں جھکا لیں۔ گاگر اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ رسوئی سے ماتا جی نے آواز دی۔ "درگا!"

"آئی ماں جی" کہہ کر رسوئی کی طرف بھاگ گئی۔

انور بھی درگا وتی کی شخصیت میں اس عظیم تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر وہ کسی طرح بھی درگا کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے محبت کیے جانے والی محبت کرتا ہی نہیں تھا۔ دو ایک بار انور کو کمرے میں درگا وتی کے ساتھ تنہائی کا موقع بھی ملا۔ مگر وہ درگا پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر خاموش ہو رہا۔ اس کی تلاطم پسند طبیعت کو جانے یہ سکون کہاں سے مل گیا تھا۔ اس نے خلافِ معمول آج تک درگا وتی کے جسم کا جستہ جستہ جائزہ نہ لیا تھا۔ وہ درگا کی چھاتیوں، اس کے پیٹ، ہونٹوں، آنکھوں، کولہوں، پنڈلیوں اور رخساروں کو اس کے جسم سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ درگا ایک مکمل روپ تھا۔ ایک کُل تھی۔ اتنی بھرپور، اتنی مکمل اور اتنی جامع عورت انور پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس سیاہ ہرن کے جسم میں کہیں نہ کہیں وہ پھول ضرور چھپا ہوگا جو نسوانی خوب صورتی اور جنسی تقدس کی حیرت انگیز مہک اڑا رہا ہے۔ اسی پھول کی تلاش، اسی مہک کی جستجو اسے درگا وتی کی طرف کھینچ لائی تھی۔ وہ اس پھول کی خوشبو کے ساتھ ساتھ سرزمینِ بنگال کی سرحدیں توڑ کر خلیج بنگال کے سیاہ پانیوں میں بھی اتر سکتا تھا۔ درگا وتی حیران تھی کہ تنہائی کے لمحے میسر آنے پر بھی انور اس سے اظہارِ محبت کیوں نہیں کرتا، وہ چاہتی تھی کہ انور اسے کہے کہ وہ اس سے پریم کرنے لگا ہے۔ مگر انور نے ایک بار بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ درگا سے ایسا پریم کرتا بھی نہیں تھا جس کی خاطر اسے سجے کمروں میں بیٹھ کر محبت کرنے والوں کی طرح اظہارِ عشق کی ضرورت محسوس ہوتی۔

درگا پوجا کا تہوار آیا تو شہر کے مندروں اور مکانوں میں بڑا چراغاں ہوا۔ انور نے بھی اس چراغاں میں حصہ لیا۔ درگا کی ماتا کو یقین ہو چلا تھا کہ اگر انور ایک سال تک ان کے گھر پر رہا تو وہ ضرور ہندو ہو جائے گا۔ حالانکہ انور ان باتوں سے کوسوں دور تھا... وہ ہندو بھی تھا اور مسلمان بھی اور نہ ہندو اور نہ مسلمان! اس دن انور نے بھی ماتھے پر تلک لگایا اور درگا دیوی کے چرنوں میں پھول چڑھائے۔ مندر میں عورتوں مردوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ اور بھجنوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ انور درگا وتی کے ساتھ مندر میں گھومتا رہا۔ واپسی پر جب وہ کیلے کے باغ میں سے گزر کر بڑے مندر کی طرف جانے لگے تو اچانک انور نے درگا کا ہاتھ تھام لیا۔

"درگا!"

درگا کی چوڑیاں بج اٹھیں۔ وہ شرم سے جھک گئی۔ انور نے کہا۔

"درگا! میں نہیں کہتا کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ نہ میں اس بات کی قسم کھا سکتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ زندگی میں پہلی بار مجھے عورت کے وجود کی اہمیت اور اس کے خلا کا احساس ہوا ہے۔ تم نے پہلی بار مجھے ایک انوکھی بات سے دوچار کیا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اگر عورت نہ ہو تو کیا ہوتا ہے اور اگر ہو تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں دن بھر دیکھتا ہوں۔ تم سارا دن میرے سامنے ہوتی ہو اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم مجھ سے لاکھوں میل دور ہو۔ میں اگر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی تمہاری تلاش میں نکلوں تو تمہیں نہیں پا سکتا اور جب میں تم سے جدا ہوتا ہوں تو تم سے دور بیٹھا تمہیں اپنے سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ تم اسے اگر پریم کہتی ہو تو میں پریمی ہوں دیوانہ پن کہتی ہو تو میں دیوانہ ہوں..."

انور بولے جا رہا تھا اور درگا وتی چپ چاپ مندر کی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"میں جانتا ہوں تمہارے دل میں بھی اسی طوفان کی لہریں موجزن ہیں۔ تم بھی اپنے مندر کی چار دیواری میں آنکھیں بند کئے، میٹھی انہی بھجنوں کے شبد سن رہی ہو۔ اس لیے کہ ہم ایک ہی سمندر کی دو لہریں ہیں۔ ایک ہی لہر کے دو سیپ ہیں۔ ایک ہی سیپ کے موتی ہیں۔ جس ڈالی پر میں کانٹا بن کر پھوٹا ہوں اسی ڈالی پر تم پھول بن کر کھلی ہو۔ وقت کے چکر نے اَن گنت صدیوں کے بعد دو ذروں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ان دونوں ذروں کا ملاپ کچھ دیر کا ہے۔ جس اصول نے ان ذروں کو ملایا ہے۔ وہی اصول ان ذروں کو ایک بار پھر جدا کر دے گا۔ درگا! کیا ہم اس تھوڑے سے وقفے میں جو قدرت نے کمال فیاضی سے ہمیں کروڑوں سال کی جدائی کے بھنڈار میں سے دان کیا ہے۔ ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے؛ جدائی اور ملاپ کے سنگم پر کیا ہماری زبانیں حیرت اور خوشی سے بند رہیں گی؛ بولو درگا! کچھ تو بولو! ....."

درگا دتی کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے تھے۔ گہری گھاٹیوں کی چٹان کے پوتر چشموں میں طوفان امڈ آیا تھا۔ انور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور درگا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ انور سے لگ کر روتی رہی۔ وہ یوں رو رہی تھی جیسے مدتوں کے بچھڑے مل رہے ہوں۔ درگا کی ریشمی ساڑھی اترتے ہوئے سانولے بدن اور سیاہ بالوں سے سحر انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ انور نے درگا دتی کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ درگا کے ہونٹ پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ انور کو یوں لگا جیسے اس نے ہرن کے نافے پر منہ رکھ دیا ہو۔ اس کے چاروں طرف خوشبو، رنگ، سورج، طلوع، غروب، وصال، جدائی، آواز، موتی اور قوس قزح کے ذرات رقص کر رہے تھے۔ خلا مذہبی موسیقی کی ہیبت ناک آواز اور بھجنوں کی گونج سے بھر گئی تھی۔ انور کی حالت اس ہندو بچے کی سی ہو رہی تھی جس کے سامنے بھگوان کرشن اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔

اچانک مندر کی طرف سے پجاریوں کی جے جے کار بلند ہوئی اور ان دونوں کا خواب ٹوٹ گیا۔ درگا جلدی سے الگ ہوئی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ انور اکیلا رہ گیا۔ اس کے پاس ہی اندھیرے میں کیلے کا ایک درخت خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رومال تھا جس سے اس نے درگا کے آنسو پونچھے تھے۔ وہ رومال کو یوں تھامے ہوئے تھا جیسے اس میں تخت طاؤس سے بھی زیادہ قیمتی موتی بند ہوں۔ اس نے رومال کو چوم لیا۔ اس میں سے گیندے اور رتن جوگی کی گہری گہری جادو بھری خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دو چار روز انور درگا کے گھر نہ گیا۔ ایک روز جب وہ درگا کے ہاں پہنچا تو ماسٹر نے انور کو مٹھائی کھلائی اور بتایا کہ درگا کا اگلے مہینے بیاہ ہو رہا ہے۔ انور نے بڑے سکون سے یہ خبر سنی اور وہاں بیٹھا رہا۔ درگا اس کے سامنے سے گزری تو اس نے گھونگھٹ نکال لیا۔ انور درگا کے ماتا پتا کو مبارک باد دے کر چلا آیا۔ دوسرے مہینے درگا دتی کا کلکتے کے ایک تاجر کے لڑکے اکشے کمار سے بیاہ ہو گیا۔ انور رخصتی کے وقت موجود تھا۔ درگا دتی دلہن بنی گہنے پہنے اپنے پتی کے ساتھ لگن منڈپ میں بیٹھی تھی اور برہمن آگ میں گھی اور چاول ڈال کر اشلوک پڑھ رہے تھے۔ انور کو ان آوازوں پر ماتمی آوازوں کا گمان ہو رہا تھا۔ درگا کو سولہ سنگار سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن اس کا چہرہ لاش کی طرح بے حس اور بے جان تھا۔ درگا دتی رخصت ہو گئی۔ اپنے ماں باپ کو روتا چھوڑ کر خود بھی روتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے آخری بار گاڑی میں دولہا کے ساتھ سوار ہوتے ہوئے انور کو دیکھا۔ انور نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔— نمسکار دیوی! الوداع درگا! زندگی کا چکر ایک بار پھر ہمیں جدا کر رہا ہے۔ کروڑوں سالوں کی جدائی اور ایک پل کے ملاپ کے بعد کروڑوں سالوں کے لیے دو ذرے پھر بچھڑ رہے ہیں۔ خدا حافظ جنم جنم کے ہنگاموں، جنم جنم کی خوشبوؤں، غمیوں میں کبھی ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔ لاکھوں جنموں کے بعد ایک جنم ایسا بھی آئے گا جب ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ پھر زندگی کا چکر صرف ہمارے ملاپ کے لیے ہی چلے گا۔ پھر کوئی اکشے کمار کلکتے سے آ کر تمہیں مجھ سے چھین کر نہیں لے جائے گا۔ پھر جو لگن منڈپ سجے گا اس میں اکشے کمار نہیں ہوں گا اور درگا دتی تم! — ابھی کچھ دنوں کے لیے، کچھ کروڑوں سالوں کے لیے رخصت! درگا دتی! درگا دیوی!

انور عظیم

آخری رات

"خودکشی کی رات کتنی ٹھنڈی ہے!"

کشور نے ٹھنڈی سانس لی اور چاروں طرف دیکھا۔ اس نے بنچ کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ ٹھنڈی شبنم بڑی تیزی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ کناٹ پلیس کی دوکانیں کب کی بند ہو چکی تھیں۔ لیکن ٹھنڈی سانس کی طرح سرسراتی ہوئی خوبصورت ساڑیوں، کمر سے نیچے جھولتے ہوئے کوٹوں اور شانوں پر لہراتی ہوئی زلفوں والی عیار رفتار عورتوں، سگریٹ، سگار اور پائپ کے کش اڑاتے ہوئے ٹھاٹ انگریزی بولتے ہوئے مردوں کے جوڑے "وانگا" اور "ویگرس" جیسے شاندار اور اشتہا انگیز ریستورانوں سے اب بھی کھٹ کھٹ کرتے ہوئے نکلتے اور اپنی اپنی ٹھنڈی کاروں کی طرف لپکتے۔ اور ان کی طرف لپکتے پھولوں کی ٹہنیاں بیچنے والے ننگے پاؤں چھوکرے جس طرح نیند سے چونکے ہوئے لوگ بدحواسی میں چوروں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

کول پارک میں سناٹا تھا۔ ویسے کشور کو ایک دو سائے دوسرے کونوں میں بھی ہوا کے جھونکوں کی طرح اٹھتے اور دبتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی تنہائی کی آخری رات سے بہت خوش تھا۔ کتنا اچھا ہوتا جو کم از کم آج کی رات بند دکانوں کی اشتہاری روشنیاں بھی بجھ جاتیں اس کے دل کی طرح۔ اور اس کے مستقبل کی طرح ان ریستورانوں میں اندھیرا ہوتا، گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ ریستورانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ اور امریکی راک اینڈ رول کی دھنیں لہراتی ہوئی باہر نکل آتی ہیں۔ دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور اندھیرے میں جھلملاتے ہوئے چاندی کے تار کٹ جاتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا جو پارک کے اکا دکا بلب بھی بجھی ہوئی آنکھوں کی طرح اندھے ہو جاتے اور یہاں صرف اُلو بولتے۔ لیکن خیر —— یہ تنہائی بھی غنیمت ہے۔ اور یہ جھلملاتا ہوا اندھیرا بھی۔ اس میں خوبصورتی ہے — سکون ہے۔ ایک ایسی غیر مرئی خوبصورتی، ایک ایسا بھیانک سکون جو موت کو قریب لاتا ہے اور زندگی کے عذاب سے چھٹکارا دلاتا ہے۔

جب میں اس اونچی عمارت کی چھت پر پہنچوں گا۔ جہاں سے مجھے ساری دلی، میرا مطلب ہے۔ ساری نئی دلی نظر آئے گی۔ اور وہ گیراج بھی جس میں برسوں سے میں اندھیری راتیں اور سیاہ دن کاٹ رہا ہوں —— تو میں مرتے ہوئے ہنس کے پروں کی طرح ہوا میں ہاتھ اٹھاؤں گا۔ اور زہر بھرے طنز سے اس پھاٹک کی طرف دیکھوں گا۔ جس میں سیاہ تالا پڑا ہوا ہے۔ اور جو میری موت کے بعد اسی شام پڑوس والے کی نئی کار کے لئے کرایے پر کھل جائے گا۔ حالانکہ گیراج کے مالک کو اس پر سخت اعتراض ہے کہ وہ اس کار میں اپنی گرل فرینڈ کو بٹھا کر چاندنی راتوں میں تاج محل دکھانے آگرہ لے جاتا ہے اور جب کبھی گیراج کے مالک کی بیوی، جو ماڈرن قسم کی سیٹھانی ہے، نظر آ جاتی ہے تو بلا وجہ طوطے کی طرح چونچ نکال کر سیٹی بجانے لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں میرے ہونٹوں پر جو کڑوی مسکراہٹ ابھرے گی۔ اس کی تاب تو میں خود بھی نہ لا سکوں گا۔ پھر میں اس کمرے کی طرف دیکھوں گا۔ جس کی کھڑکی سے پڑوس والے شرابی بیرسٹر کی حسین چھوکری نظر آتی ہے۔ افسوس خودکشی سے پہلے وہ مجھے نظر نہ آئے گی۔ البتہ اس کے کمرے کی ہلکی ہلکی سرخ روشنی میں اس کے ریشمی لحاف کی دھوکے جیسی حسین جھلملاہٹ نظر آئے گی۔ کون جانے اس کی لچکیلی کمر کا خم بھی دکھائی دے جائے جس پر اس کے چہیتے بانہیں ڈال کر لیٹے ہیں یہ میری خودکشی کی رات ہے۔ ان رنگین خیالوں سے کیا ہوگا۔ یہ کوئی وصال کی رات تو ہے نہیں —— ہاں تو میں ہنس کے پروں کی طرح

ہاتھ اٹھاؤں گا۔ اور پنچھی کی طرح ہوا میں اڑوں گا۔ اور زمین پر گر کر پاش پاش ہو جاؤں گا۔ میرے ساتھ یہ زرد بے خواب چاند بھی گرے گا۔ اور چکنا چور ہو جائے گا۔ میرا خون پتھریلی سڑک پر آہستہ آہستہ تیرے گا۔ اور جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ میرا خون گرم ہو گا۔ خون، خون ہے، اس بنچ کو بھگوتی ہوئی شبنم کو نہیں۔

کشور نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔

...... اور سب سے پہلے میری لاش پر کس کی نظر پڑے گی؟

شاید بیرسٹر کی نازوں پلی لڑکی کی۔ کشور اندھیرے میں مسکرایا۔ ہر صبح کی طرح سورج نکلنے سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ وہ سرہانے رکھا ہوا بڈ لیمپ جلائے گی۔ ایک موٹی سی کتاب کھولے گی۔ آیا چائے کا پہیوں والا ٹرے لائے گی۔ جب وہ پیالی میں چائے نکال کر چلی جائے گی تو لڑکی ایک انگڑائی لے گی (انگڑائی بھی کیسی ——— ایک ایک انگڑائی میں سو سو دھنک ٹوٹ کر آسمان سے گر پڑیں!) اور کتاب ہاتھ سے چھوٹ جائے گی، وہ چائے کا پہلا گھونٹ پیئے گی۔ اور کتاب کے اندر سے ہرے نیلے کاغذ نکالے گی۔ اور پڑھے گی۔ امتحان کی تیاریاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ عاشق کے خط میں جو مزا ہے، سقراط کے زہر کے پیالے میں کہاں۔ یہ سبھی جانتے ہیں، ایک میں نہیں جانتا۔ کسی نے بھی خط لکھا ہو تو جانوں ہاں تو وہ خط پڑھے گی۔ اور پھر انگڑائی لے گی۔ ننگی باہیں ہوا میں تڑپیں گی۔ بھری بھری چکنی باہیں۔ پھر وہ آہستہ سے کھڑکی کا حریری پردہ ہٹائے گی۔ اور ہمیشہ کی طرح کچھ اس انداز سے دیکھے گی۔ جیسے اسے خبر ہی نہیں کہ کوئی بیچاری پڑوس کے گیراج میں رہتا ہے، اور محض اس پل کے انتظار میں راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتا ہے۔ ہاں تو وہ کچھ اس انداز سے دیکھے گی۔ اور اس کے گلاب جیسے چہرے کا رنگ اڑ جائے گا۔ افسوس اس وقت میں اپنے گیراج کی چھت پر نہ ہوں گا۔ افسوس میں رنگ کے اڑنے کا وہ عالم نہ دیکھ سکوں گا۔ جب زمانے کی نبض چھوٹ جائے گی۔ اور ایک چیخ سوتی ہوئی دنیا کو لرزا دے گی۔ لیکن اس وقت میری آنکھیں بند ہوں گی۔ اور میری شہ رگ کا خون بہہ رہا ہو گا۔ جس سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی ہو گی۔ جیسی بھاپ ہر صبح اس حسینہ کے ہونٹوں سے لگی ہوئی چائے کی پیالی سے اٹھتی ہے۔ افسوس میں یہ تماشا نہ دیکھ سکوں گا۔

کشور نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ وانگا ریستوران کا دروازہ کھلا۔ اور کسی نے زور سے کہا "بلاڈی فول!" موٹر کے انجن کی غراہٹ موسیقی کی دھنوں کو کھا گئی۔

کشور لرز گیا...... اور ہو...... اور جو...... بیرسٹر کی لڑکی کی انگڑائی سے پہلے کا نا بھنگی چھپکتا تھوکتا، جھاڑو سمیت میری لاش سے ٹکرا جائے تو ——— کشور کو اپنے منہ کا مزہ کڑوا کڑوا لگا۔

یکایک بنچ پر بھونچال سا آ گیا۔ جانے کون آن مرا۔ کشور اچھل پڑا۔ اس کے بنچ پر ایک بھوت بنجا بلی کی طرح خرخرا رہا تھا۔ کشور کو اس کا چہرہ نظر نہ آیا۔ لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی بڑی عمر کا بھوت ہے جس کے سر پر گٹھڑ رکھا ہوا ہے۔

کشور کو اپنی زندگی کی آخری رات کی تنہائی پر یہ بے ہنگم حملہ بہت برا معلوم ہوا۔ وہ کسی دوسرے بنچ کی طرف مڑنا ہی چاہتا تھا۔ کہ ایک خرخراتی ہوئی آواز نے اس کے قدم جکڑ لئے۔

"ابے جاتا کہاں ہے؟" اجنبی بھوت کی آواز میں کچھ ایسی تادرشاہی گھن گرج تھی کہ کشور وہیں گڑ کے رہ گیا۔

"ابے بیٹھ جا!"

کشور کھڑا رہا۔

"ابے سالے بیٹھ جا!"

کشور بیٹھ گیا۔

"تیری بہن کی . . . . ."

"میری کوئی بہن نہیں ہے۔" کشور نے سرکتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

"سالے نہیں تو ماں تو ہوگی؟"

"نہیں ماں بھی نہیں . . . ."

اب کے اجنبی بھوت نے اپنا بڑا سا سر اس کی طرف گھمایا۔ اور زور سے خرخرایا جیسے اسے یہ جواب ذرا نہ بھایا ہو۔

"ابے بیوی، معشوقہ، پڑوسن، لونڈیا، رنڈی ــــ کوئی تو ہوگی ــ"

"نہیں کوئی نہیں ــــ"

"سالے تو کیا تو بالکل مادر پدر آزاد پیدا ہوا ہے۔ اس جانے میں . . . ."

کشور نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر بلائے ناگہاں کی طرف دیکھا۔ اسے ایک سیاہ تودے اور بڑے سر کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا

چند لمحے خاموشی اور تذبذب میں گزر گئے۔ کشور نے بنچ سے اٹھنے کے لئے پر تولے اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ مصیبت اس کی جان نہیں چھوڑے گی۔ زندگی میں پہلی بار تو اس نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ اسے ایک ایسی آخری رات کی ضرورت تھی جس میں اس کے پاس نہ کوئی دوست ہو نہ دشمن، نہ قرض لوٹانے کا تقاضا کرنے والا اور نہ کوئی جاڑے میں۔ تار تار مفلر سے اسے الجھا دیکھ کر ترس کھانے والا یا حقارت سے مسکرانے والا۔ بس وہ ہو، اس کے خواب ہوں، اس کے تجزیے۔ ایسے تجزیے جو اس کے خوابوں میں کھو جائیں۔ زندگی میں جو تنہائی تھی۔ موت میں بھی اسی تنہائی کی پیاس تھی۔ بھوت کا سر گٹھری کی طرح اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

"کیا تیرا کوئی بھی نہیں ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

"تب تو آدمی تو اپنے ڈھب کا جان پڑتا ہے۔"

"کیوں؟" کشور نے اس کے قریب کھسکتے ہوئے سانس روک کر پوچھا۔

"کیوں کہ میں آج کی رات کھودکسی کرنے جا رہا ہوں۔"

کشور کی ناک میں ٹھرے کا بھبکا آیا۔ اور وہ جھٹ بنچ کے دوسرے کنارے پر کھسک گیا۔

"مجھے روکنا مت سالے۔ کہے دیتا ہوں۔ خبردار جو روکا مجھے۔ میں تو آج کھودکسی کر کے دکھا دوں گا۔ رام بہادر گنڈہ ہے تو کیا ہوا۔ وہ بھی دکھت آنے پر سرپھیوں کی طرح اپنی جان پر کھیل سکتا ہے۔ جب ہی تو رام بہادر گنڈے کا کول ہے ہر گنڈہ سرپھیر ہوتا۔ اور ہر سرپھیر گنڈہ۔"

اس نے زور سے ناک پھڑکائی، اپنی موٹی ران پر ہاتھ مارا۔ اور زور سے ہنہنایا۔

"عجیب گھوڑا ہے!"

کشور کا سر چکرایا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بلی کی خرخراہٹ سنتا رہا۔

"آج کی رات میں کطب مینار پہ چڑھوں گا۔ اور وہاں سے چھلانگ لگا دوں گا۔ سالے کطب کی لاٹ دیکھی تو نے؟"

"قطب مینار؟" کشور نے سوچا یہ تو نرا پاگل پن ہے۔ جب آدمی میرے محلے کی اونچی عمارت سے گر کر مر سکتا ہے تو قطب مینار سے کودنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب چلو بھر پانی میں ڈوب سکتے ہو تو پھر شانت ساگر جانے کی مصیبت کیوں اٹھاؤ۔ بس مطلب یہی ہے نا کہ قطب مینار سے گرو گے تو چوٹ زیادہ لگے گی۔ اور دھماکہ زیادہ زوردار ہوگا۔ مگر وہاں کوئی ہیبر سٹر کی بیٹی نہ ہوگی ——— اس غنڈے کے بچے کو کیا معلوم کہ ہیبر سٹر کی بیٹی کیا چیز ہوتی ہے۔

"اب مجھ سے یہ کاروبار نہیں چلتا۔ میں چاہتا ہوں کوئی ڈھب کا آدمی ہے تو اسے اپنا کاروبار سونپ دوں۔"

"کاروبار؟"

اس سوال پر رام بہادر خندہ بالکل اس میں دھنس کے بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی دوستی سے کشور کے گلے میں اپنا بھاری موٹی موٹی مچھلیوں والا بازو ڈال دیا۔

"سالے تیرے منہ سے بو آتی ہے؟"

"بو؟" کشور نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اور پوچھا "کیسی بو؟"

"دودھ کی" ورزشی بازو کی مچھلیاں اس کی گردن میں چبھنے لگیں۔ اور اس کی سانس رکنے لگی۔ "اچھا سچ سچ بتا۔ سالے تو ماں کے پیٹ میں کتنے مہینے رہا تھا؟"

"یاد نہیں ———" کشور ممیایا۔

"ہا ہا ہا! سالے تو سمجھتا کیا ہے۔ گنڈہ کاروبار نہیں کر سکتا کیا؟ میں نے بھی کاروبار کیا ہے۔ پوری جندگی کاروبار کیا ہے۔ اور کسی کا گلا نہیں کاٹا ———"

اس کے منہ کی سڑاند سے کشور کو ابکائی آ رہی تھی۔

"اب کہاں کھسکتا ہے سالے۔ آج آکھری رات ہے میری۔ مر جاؤں گا۔ تو تو نا کہے گا کہ آکھری رات رام بہادر مجھے اپنی دل کی بات سنا گیا ———"

کشور نے اس کا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹایا۔ اور اٹھنے لگا ——— اس کی آخری رات کا سارا رومان، سارا جادو مٹ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ طلسم ایک بار ٹوٹ گیا تو گیا ——— اس طلسم کے بغیر پھر موت بھی کیا موت ہوگی۔ رام بہادر نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے دوبارہ بنچ پر کھینچ لیا ———

"سالے رام بہادر تجھے اپنے دل کی بات بتانا چاہتا ہے۔ اور تو ہے کہ ——— ابے بیٹھ جا۔"

"کیا عمر ہے تیری؟"

"پچیس برس۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"پڑھاتا ہوں۔"

"کیا پڑھاتا ہے بے؟"

"شاعری"

"ہوں سنا"

کشور کا گلا رندھ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کہیں کوئی سپاہی بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ جس کے سہارے اس دلدل سے چھٹکارا پاتا۔ اس نے والگا ریستوراں کی طرف دیکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ صرف اس کا نام "والگا" سرخ آگ کی الجھی ہوئی لکیروں کی طرح دہک رہا تھا۔ کوئی موسیقی کی دھن نہیں تھی۔ نہ رات کے دل میں گونجتے ہوئے قہقہوں کے گھنگھرو۔ ہائے یہ آخری رات کیسی تباہ ہوئی۔

"ابے چپ بٹ" رام بہادر گرجا۔

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ——"

"ابے یہ شاعری ہے یا ڈاکٹر کی دکان کا اشتہار ......"

کشور کے گلے میں سسکیاں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"سالے تو رو رہا ہے .... میں کہتا ہوں سنا کچھ۔ اب یک کچھ کہ ... ابے میں سناتا ہوں۔"

اس نے گرجدار آواز سے الاپنا شروع کر دیا۔

"اگر قسمت سے لیلیٰ کے گلے کا ہار ہو جاتا ——"

"بند کرو بکواس!" کشور چیخا۔ "میں پولیس کو بلاؤں گا۔"

ریستوران کب کے بند ہو چکے تھے۔ سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ رام بہادر نے سنی ان سنی کر دی اور گاتا رہا۔

"پولیس سے ڈراتا ہے؟ رام بہادر کو؟ کیا رام بہادر پولیس سے ڈرتا ہے؟"

اس نے ایک بھرپور ہاتھ کشور کے کانپتے ہوئے شانے پہ مارا۔

"رام بہادر پولس کا چچا ہے۔ سالا چچا۔ سمجھے؟ رام بہادر پہ سات خون کا الزام ہے۔ اگر یہ پولس نہ ہوتی، اگر میری چہیتی بھتیجی نہ ہوتی۔ تو میں پھانسی کے پھندے میں جھول چکا ہوتا۔ بلاؤ نا پولیس کو۔ اپنے باپ کو۔ سب جانتے ہیں۔ آج رام بہادر پارک کے اس بنچ پہ بیٹھا ہے۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال سامنے آئے۔ اگر میں اس بنچ پہ نہ ہوتا۔ تو کب کا پولیس والے تیری گردن میں ڈال کر چلتا کر دیتے ...."

رام بہادر نے اسے چمکارا۔

"ابے چھوڑ یہ سب۔ نہیں تو تیری ایسی تیسی کر دوں گا۔ بلا آیا کہیں کا بابو صاحب۔ سالا بیٹا سوچتا ہو گا ذرا سی شکایت جائے۔ تو جی کے جنجال سے چھوٹ جاؤں۔ سن، کان کھول کر سن رام بہادر کی بات۔ سالا بڑا سیانا ہے۔"

وہ ایک منٹ کو رکا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی اور کشور کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "پی! سالے پی!"

کشور نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

"مارگولی" رام بہادر نے ایک لمبا کش کھینچا۔ "بات یہ ہے کہ اب یہ کاروبار مجھ سے نہیں سنبھلتا۔ تو سنبھال لے۔ کاروبار سیدھا سادا ہے۔ میں چھوکروں کا کاروبار کرتا ہوں۔ چھوکرے جو سینما کا اشتہار گلے میں ڈال کر پھرتے ہیں گلے میں ڈھول ڈال کر پھرد یا تپلی کمر والی لونڈیوں کا پوسٹر ڈال کر پھرد —— ایک ہی بات ہے۔ کیوں ہے نا؟" پھر اس نے کشور کے کانپتے ہوئے شانے پر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ "میرے پاس اور چھوکرے بھی ہیں۔ کناٹ پیلس میں لوبٹا پلش

کرنے والے چھوکرے ہیں نا —— صاحبوں اور میم صاحبوں کے جوتے چمکانے والے —— ہاں تو وہ بھی میری ہی آسامی ہیں۔ میں بہت بڑا اڑھتیا ہوں دلی کا۔ یہ ایسا مال ہے۔ کہ باجار میں سپلائی کرو، بلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ ایسا چوکھا آئے کہ بس . . . . . . مجھ سے یہ بھوکوں مرتے بچے دیکھے نہیں جاتے سو میں ان کے لئے کام ڈھونڈتا ہوں۔ اور وہ سب مجھے کمیشن دیتے ہیں۔ مجھے چاہیئے کیا۔ ٹھرا اور روٹی بس ——"

رام بہادر نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں پھر بھاری بھرکم بازو ڈال دیا۔ اور رونے لگا۔

"میں نے یہ کاروبار کیوں کیا جانتے ہو؟"

"آکھری بار جو جیل سے لوٹا، میرا مطلب ہے جو سسرال سے لوٹا، تو دیکھتا کیا ہوں کہ چھ چھ سات سات برس کے دودھ چھوکرے، سالے کتے کے پلے، تاک سڑکتے جاتے ہیں اور کوڑے کے ٹین سے روٹی اور سڑے ہوئے پھل چن چن کھائے جاتے ہیں۔ سالے بندر مقے بندر، آنکھیں کیسی بھوکی تھیں حرامیوں کی، میں نے جو ڈانٹ بتائی تو وہیں سالے کھڑے کھڑے موتنے لگے۔ سالوں نے جھٹ روٹی کا ٹکڑا میری طرف بڑھا دیا۔ ہائے اب میں کیا بتاؤں تجھے کاٹھ کے الو۔ بس میں تو وہیں بیٹھ گیا جمین پر۔ اور ان کو پیار کرنے لگا۔ نوجوان؛ میں کوئی بلیک موتنا تو ہوں نہیں، پر اس دن آنکھوں سے سالا ایسا جھرنا چالو ہوا کہ نزنمک کے ڈھیلے کی طرح پگھل کے رہ گئے۔ برسوں سے کسی بچے کو پیار نہیں کیا تھا رام بہادر نے۔ ایک مرتبہ سالے نے جیل میں جیلر کی بیٹی کو دور سے پیار کیا تھا تو دس ڈنڈے بجائے گئے تھے حرام جادے کی کمر پر۔ سو اس دن سے رام بہادر نے قسم کھائی تھی کسی بچے کو پیار نہیں کرے گا۔ رام بہادر نے ٹھنڈی سانس لی۔" بس وہ دن اور آج کا دن —— میں یہی کاروبار کرتا ہوں کیوں ہے یہ کاروبار۔ اس کاروبار سے تو بھلا ہے تاکہ بچوں کو لوگ لنگڑا لولا کریں۔ اور ان سے بھیک منگوائیں۔"

کشور غنڈے کے پورے جسم کی جھرجھری کو محسوس کر رہا تھا۔ اسے ایسے لگتا تھا کہ یہ جھرجھری غنڈے کے جسم سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کے دل میں چھپی ہوئی کسی چٹان سے ٹکرا جاتی ہے۔

"میں کہتا ہوں۔ اب تو یہ کاروبار سنبھال لے۔ میں بوڑھا ہوا۔ مرتے شیر پر لومڑی بھی پنجہ مارتی ہے۔ سالے مجھے باجار سے نکال رہے ہیں —— میں کہتا ہوں . . . . . میرا بھی کوئی نہیں . . . . ."

"میرا پیچھا چھوڑ دو اور مجھے چین سے مرنے دو۔" کشور نے چیخ کر کہا۔

"مر کے دکھا پھر بتاتا ہوں تجھے۔" رام بہادر نے اس کی گردن پکڑ لی۔

"نہیں آج کی رات میری آخری رات ہے۔" کشور نے گھٹی ہوئی آواز میں اصرار کیا۔

"میری بھی آخری رات ہے سالے پتے۔" رام بہادر نے پہلی بار ٹھنڈی سانس لی۔" دیکھ تارے ڈوب چلے۔ میرے ڈوبنے کا وقت بھی آ گیا ——"

کشور رسی تڑا کر بھاگا۔ اور شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر دوڑتا چلا گیا۔ دوسرے کنارے پر اسے دوسرا پنچ مل گیا۔ جب وہ بیٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں کوئی چیز چیخ رہی ہے۔

"الو کہیں کا، بکرا —— میری آخری رات کا بھی ستیاناس کر دیا . . . . . . شرابی، گدھا . . . . !"

رفتہ رفتہ اس کا غصہ دھیما پڑ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر فنا آشنا مسکراہٹ ابھری، اور اسے اپنے ہونٹوں پر فنا کے ہونٹوں کی گرمی محسوس ہوئی۔

ہاں تو ہیرسٹر کی بیٹی دیکھے گی۔ اور اُس کا رنگ اُڑ جائے گا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا جائیں گی۔ اور تب وہ اس طرح نہیں دیکھے گی۔ گویا اس گراج میں رہتا ہی نہیں میں جلا دیا جاؤں گا۔ اور میری راکھ جمنا میں بہا دی جائے گی۔ وہ جمنا کے کنارے اپنی خوبصورت کار میں آئے گی۔ اور ہرن جیسی آنکھوں سے پانی میں ڈوبتے سورج کا دہکتا ہوا رنگ دیکھے گی۔ اور پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں گی۔ بستہ میں ایک سنسنی سی دوڑ جائے گی ہیڈ ماسٹر جب صبح کے وقت حاضری کے رجسٹر میں میرے ٹیڑھے میڑھے دستخط نہیں دیکھے گا۔ تو مونچھوں پر تاؤ دے گا۔ اور کہے گا ——— اچھا اب کے بچ کر کہاں جائے گا۔ لیکن کوئی اخبار لائے گا۔ اور پہلے ہی صفحے پر اسے میری تصویر نظر آئے گی۔ اس کے انتقام کی آگ بجھ جائے گی۔ اور اس کی مونچھیں پھڑکنے لگیں گی۔ اسکول میں بچوں کو چھٹی ہو جائے گی۔ اور وہ میری موت پر خوشیاں منائیں گے۔ اور سوچیں گے کہ ہر روز ایک ماسٹر صاحب مر جائے تو کتنا مزا آئے۔ البتہ لالہ جی بہت تلملائیں گے۔ کہیں گے۔ میرا روپیہ لوٹائے بنا اسے مرنے کا کیا حق تھا۔ اور میں موت کی بلندیوں سے جھانک کر ان سب کو دیکھوں گا۔ اور مسکراؤں گا۔ ہر چیز کتنی حقیر معلوم ہو گی۔ میں سب کو دیکھوں گا۔ اور کوئی مجھے نہیں دیکھے گا۔ میں ہوا کے جھونکے کی طرح ہیرسٹر کی کوٹھی میں اس کھڑکی سے داخل ہوں گا۔ جس پر ایک حریری پردہ میرے دل کی طرح لرزتا رہتا ہے۔ میں پرواز کرتا ہوا جاؤں گا۔ اور اس حسینہ کی آنکھوں میں اتر جاؤں گا۔ اس کی بھیگی ہوئی پلکوں پہ سو جاؤں گا۔ جس طرح پھول کی پنکھڑیوں پر بھونرا بسیرا کرتا ہے۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سناٹا سا چھایا تھا۔ اسے لگا کہ ستاروں بھرا آسمان ستاروں سمیت اس کے سر پر جھک آیا ہے۔ وہ ڈر گیا۔ اگر اگلے ہی لمحے یہ دہکتے ہوئے ستارے ٹوٹ کر بجھ جائیں تو کیا ہو۔ اس زمین کا کیا ہو جس پر ٹھنڈی ہوا موسیقی کی طرح بہہ رہی ہے۔ جب سڑک پر گروں گا۔ اور مٹی کی گڑیا کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا۔ تو میری سانس رک جائے گی۔ مگر میرا خون ان سنی موسیقی کی طرح تیرتا رہے گا۔ یہی موسیقی زندگی ہے۔ جو آدم سے شروع ہوئی تھی۔ اور مجھ پر ختم ہو جائے گی۔ نہیں نہیں یہ موسیقی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور چونکہ یہ موسیقی ختم نہیں ہو گی۔ اس لئے میں بھی ختم نہیں ہوں گا۔ لیکن یہ تو دل بہلانے والا خیال ہے۔ میں جب اس اونچی عمارت سے گروں گا تو ختم ہو جاؤں گا۔ پھر ان ستاروں کو نہیں دیکھوں گا۔ ستارے چمکتے رہیں گے لیکن میں بجھ جاؤں گا۔ واہ!

پھر ایک بھاری ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔ رام بہادر کا دیو جیسا جسم اس کے پیچھے جھوم رہا تھا۔

"تو مجھ سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ آج کی رات مجھ سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ موت بھی نہیں . . . ."

کشور کو اس کی آنکھیں پہلی بار چمکتی نظر آئیں اور اس کے بھیانک نقش و خال بھی۔ اف اس کے جبڑے کس طرح لرز رہے تھے۔

"میں کہتا ہوں، سالے تو بھی چھوکروں کا کاروبار کر۔ سینما کے پوسٹر اور بوٹ پالش . . . . . ."

رام بہادر کی زبان کی لڑکھڑاہٹ کم ہو رہی تھی۔ اور ساتھ اس کی آواز کی کھرج بھی۔

کشور کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔

"خوابوں کی سیج کہاں ہے؟"

اس نے اپنے بال نوچ لئے اور کھڑا ہو گیا۔

"میرا پیچھا چھوڑ دو، اے دیو میرا پیچھا چھوڑ۔ آج کی رات میرے لئے بڑی پاک اور خوبصورت رات ہے . . . . ."

"رات؟ اب رات کہاں؟" رام بہادر نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں کا رنگ گرد کی طرح اڑ رہا تھا۔

کشور اٹھا۔ لیکن جتنی تیزی سے وہ اٹھا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے رام بہادر کے بھاری ہاتھ نے اسے دبا دیا۔

"وہ رات بھی ایسی ہی رات تھی، میں کھوٹی نہیں ہوں۔ مجھ پر سات کھونٹوں کا الزام ہے۔ پر میں نے ایک کھوٹ بھی نہیں کیا ہے۔ ایک کھوٹ بھی نہیں ——— ہاں ایک عورت کو ضرور مسلا ہے میں نے، عورت کیا کلی تھی کلی۔ سالی تھی بڑی ٹیڑھی۔ چال ٹیڑھی، بات ٹیڑھی، ناک ٹیڑھی، میں

اس پر مرتا تھا۔ میں کہتا جان، سالی کہتی بھائی۔ سو میں ایک رات اسے اکیلا پاکر گھس گیا۔ اس کے گھر میں۔ بڑی سالی کراری گدائن ہے۔"

"بکومت" کشور کا سر پرنے کی طرح چکر کھا رہا تھا۔ "یہ میری آخری رات ہے۔"

"غنڈے کا ایک ہاتھ اٹھا۔ اور ہتھوڑے کی طرح کشور کے جبڑے پر پڑا۔ "میں کھونی نہیں ہوں۔ پر ایک ہاتھ میں بتیسی جھاڑ نا جانتا ہوں۔"

"سالہ آکھری رات، آکھری رات کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ تیرے منہ سے تو دودھ کی بو آتی ہے۔"

کشور سر جھکائے سسکیاں بھر رہا تھا۔

"ابھی سالے دنیا میں تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟ بتا بتا؟" کشور سہم گیا کہ کہیں غنڈہ دوسرا ہاتھ نہ جڑ دے۔

"کبھی کسی کے منہ پر طمانچہ مارا ہے؟ کہیں ڈاکہ مارا ہے؟ راہ چلتے کسی کی پگڑی اچھالی ہے؟ بتا؟ اُلو کی دم — چلا ہے بڑا کہیں کھودکسی کرنے!"

کشور کے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"سالے جانتا ہے۔ یوں جاتا ہوں دوکان میں اور بنیا مجھے سلام کرتا ہے۔ اور میرے ہاتھ میں نوٹ تھما دیتا ہے۔ یوں جیتے ہیں جینے والے!"

کشور کے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں ————— اب میں جاؤں گا اور اس اونچی عمارت کی چھت سے پتھریلی سڑک پر چھلانگ لگا دوں گا۔ وہ اٹھا لیکن یہ کتنی خوفناک بات ہوگی۔ ایک ہی رات کو دو خودکشیاں ————— ایک غنڈہ اور ایک میں۔ ایک خونی، عورت کی عزت لوٹنے والا۔ بچوں کا سوداگر اور میں زمانے کا کچلا ہوا، سماج کا باغی، ————— دونوں ایک ساتھ؟ پھر اس بیرسٹر کی لڑکی کا کیا ہوگا؟ وہ کیا سوچے گی ————— نہیں آج نہیں کل، اب میں کل خودکشی کروں گا۔ رام بہادر آج مرے گا۔ اور میں کل مروں گا۔ دونوں کی موت الگ الگ ہوگی۔

دوسری طرف سے ایک سپاہی تیز تیز قدموں سے ان کی طرف آ رہا تھا۔

"اچھا سالے میں چل دیا۔ آج دھندے کی رات تھی۔ میرے یار اب حصہ بٹا رہے ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو منی آرڈر رہ جائے۔ اور سیدھی نہ ملے —"

رام بہادر نے اس کے کندھے پر ایک زوردار ہاتھ مارا۔ "پھر ملیں گے۔"

"پھر؟ ————— مگر خودکشی؟"

رام بہادر نے زور سے قہقہہ لگایا —

"کھودکسی؟ — ٹھیک تو یاد نہیں، پر یہ تو میری ایک ہزار بائیسویں کھودکسی تھی۔ دیکھتے نہیں سویرا ہونے والا ہے۔"

رام بہادر پیر پٹکتا ہوا چل دیا۔ سپاہی آکر رک گیا۔ اور کشور کی سوجی ہوئی آنکھوں اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر صبح کا دھندلکا راکھ کی طرح تیر رہا تھا۔

کشور نے سپاہی سے آنکھیں برابر نہ کیں، اٹھا اور شانے جھکائے ہوئے سرپٹ بھاگا۔ جب وہ اپنے گراج کی چھت پر پہنچا۔ تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ آنسو خشک ہو چکے تھے لیکن پلکیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کا ریشمی پردہ ہلا۔ ایک سنہری انگڑائی جھلملائی، کانا بھنگی پتھریلی سڑک پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ جہاں اسے گر کر پاش پاش ہونا تھا۔ دور درختوں سے آگے آسمان پر شفق پھول رہی تھی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا۔ اور ایک اداس چہرہ سلاخوں پر ٹک گیا۔ لیکن آنکھیں افق کی طرف نہیں۔ بلکہ گراج کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

کشور کے جسم میں آخری بار ایک ٹھنڈی جھرجھری دوڑ گئی۔ اور دور سے ایک بھاری آواز کی گونج سنائی دی۔

"یہ میری آخری رات ہے ————— یہ میری ایک ہزار بائیسویں کھودکسی ہے!"

رام لعل

قبر

میں پورے سفر میں سو نہیں سکا تھا۔ سفر بہت طویل تھا۔ طویل بھی اور تھکا دینے والا بھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سفر کچھ راتوں اور دنوں کا نہیں ہے کئی قرنوں کا ہے۔ میرے بدن کے جوڑ جوڑ سے جو درد اٹھ رہا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ سا بنا رہے گا۔ میری آنکھوں میں جو کانٹے گھسے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے زندگی بھر چین سے نہیں سونے دیں گے۔ اور میں ہمیشہ اسی طرح سرگرداں رہوں گا۔ شہر بہ شہر۔

اس دن میں جبل پور سے آ رہا تھا۔ میرے ساتھ میری بیوی بلقیس اور تین بچے حامد، نجمہ اور نسرین بھی تھے۔ ایک گاڑی ہم نے الٰہ آباد میں تبدیل کی تھی۔ یہ گاڑی ہمیں لکھنؤ لئے جا رہی تھی۔ لکھنؤ سے ہمیں ایک اور گاڑی میں بیٹھ کر اقبال پور جانا تھا۔

اقبال پور جانا میں نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ جب سے میں نے شادی کی تھی۔ وہاں میں صرف دو ہی بار پہلے جا چکا تھا۔ وہ بھی بلقیس کے اصرار پر۔ کیونکہ وہ وہاں کی رہنے والی تھی۔ وہ ہر سال وہاں چند روز گزار آتی تھی۔

میں آپ کو جبل پور کے بارے میں بھی کچھ بتا دوں۔ وہاں میں اٹھارہ سال سے مقیم تھا۔ ٹرانسپورٹ کے محکمے میں نہایت معقول تنخواہ پر ملازم۔ اور ایک بہت خوبصورت اور آرام دہ مکان کا مالک۔ جو میری برسوں سے بچا بچا کر رکھی ہوئی کمائی کا ثمرہ تھا۔ ایسا ثمرہ جسے پا کر کسی بھی شخص کی بیوی اپنے شوہر پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ لیکن بلقیس کو اس مکان کا آرام اور اس کی خوبصورتی کبھی پسند نہیں آئی۔ اس نے میری کسی بھی خوبصورت چیز کو کبھی توصیفی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ مجھے دوستوں کو دعوتیں دینا مرغوب ہے۔ جس کے لئے وہ ناک بھوں چڑھا لیتی ہے۔ میں برج کا شائق ہوں۔ اُس نے اس کھیل کی الف۔ ب جاننا بھی کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی میں نے اس سے بے انتہا محبت کی ہے۔ گذشتہ بارہ برس میں جب سے وہ میرے گھر کی زینت بن کر آئی ہے۔ میری محبت میں ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی۔ اُس سے اس بات کے لئے کبھی خفا نہیں ہوا۔ کہ اس نے میرے خوبصورت گھر کو کیوں پسند نہیں کیا۔ وہ میرے گھر میں خود کو اجنبی کیوں سمجھتی رہی ہے۔ میں اس سے اس لئے بھی خوش رہا ہوں کہ اس نے مجھے نہایت خوبصورت اور شرارتی بچے دیئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر میں اپنا ہر غم بھول جاتا ہوں، ہر کمی بھول جاتا ہوں۔ میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکایت باقی نہیں رہ جاتی۔ بلقیس نے بھی جب کبھی مسکرا کر میری طرف دیکھا ہے میرے اندر جینے کی لگن اور بڑھ گئی ہے۔

لیکن میں نے کبھی کبھی بلقیس کی آنکھوں میں کسی ایسے غم کو بھی کروٹیں لیتے دیکھا ہے۔ جس سے مجھے خود اپنی ساری کائنات الٹتی ہوئی محسوس ہوئی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شدید تنہائی کا بھی احساس ہوا ہے۔ لیکن جب حامد، نجمہ اور نسرین اپنی معصوم مسکراہٹوں کے ساتھ میری طرف لپک لپک کر بڑھے ہیں اور بلقیس نے مجھے میرے انتہائی افسردہ لمحات میں کندھے سے جھٹک کر پوچھا ہے۔ خالد، کیا بات ہے؟ تم کھوئے ہوئے کیوں ہو۔؟ تو میں اس وقت جیسے میں اس دنیا میں لوٹ لوٹ کر آتا رہا ہوں۔ اس وقت میرے دل و دماغ پر سے تنہائی اور اُداسی کے بادل بکھر بکھر گئے ہیں۔

جس رات ہم الٰہ آباد سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ وہ بہت سرد تھی۔ اتنی سرد کہ اُسے پوری طرح بیان کرنے کے لئے مجھے شاعری کرنی پڑے گی۔

لیکن شاعری میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ اتنا سمجھ لیجیئے کہ جنوری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور پچھلے دو دنوں سے ایک سخت ٹھنڈی لہر چل رہی تھی۔ ہمارے پاس پورا بستر بھی نہیں تھا۔ بس دو کمبل تھے جو ہم افراتفری کے عالم میں اٹھا پائے تھے۔ ایک کمبل میں حامد اور نجمہ سو رہے تھے۔ دوسرے میں بلقیس اور نسرین۔ میں اپنے اوورکوٹ میں ایک بند کھڑکی کے ساتھ کمر لگائے "غبارِ خاطر" پڑھ رہا تھا۔ میرے سوا سب سو رہے تھے۔ تنہا رہ جانے والوں اور تنہائی پسندوں کا ساتھ کتابیں ہی دیا کرتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ سگرٹ بھی۔ اس رات میں نے سگرٹ بھی بہت پیئے تھے۔ میں بہت زیادہ سگرٹ نہیں پیا کرتا۔ لیکن اس رات سگرٹ پینے میں مجھے ایک عجیب سی فرحت مل رہی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اور سگرٹ پیتے پیتے مجھے اقبال پور بہت یاد آ رہا تھا۔ اقبال پور ہمارے سفر کی منزل تھی۔ لیکن وہاں میں اپنی خوشی سے نہیں جا رہا تھا۔ بالکل با دلِ نخواستہ۔ آج تک میں نے وہاں جانے سے ہمیشہ انکار کیا تھا۔ آپ کو بتایا نا کہ وہاں ہر سال بلقیس تنہا ہی جاتی تھی۔ لیکن اس بار میں انکار نہیں کر سکا تھا۔ اس نے جبل پور چھوڑتے وقت میرے سامنے اقبال پور جانے کی تجویز رکھی تو میں فوراً رضامند ہو گیا۔ لیکن اس وقت وہ کسی دوسری پُرسکون جگہ کا نام لیتی تو میں وہاں چلنے کے لئے بھی تیار ہو سکتا تھا۔ میں ہر ایسی جگہ جانے کے لئے تیار تھا۔ جہاں پہنچ کر میرے سہمے ہوئے بچوں کی آنکھوں میں وہی پہلی سی خوشی اور چمک لوٹ آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

اقبال پور میں ہمارا کوئی نہیں رہتا تھا۔ میرا تو وہاں کبھی کوئی عزیز رہا بھی نہیں تھا۔ بلقیس ہی کے ابّا، امّی، نانا بلکہ پورا خاندان کبھی وہاں آباد تھا۔ اب تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ابّا اور امّی مر چکے تھے۔ نانا بھی وہیں کی خاک میں دفن ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ان کے کئی عزیز ترکِ وطن کر کے سرحد پار بھی جا چکے تھے۔ بلقیس جب بھی اقبال پور جایا کرتی تھی۔ جہاں صرف قبریں ہی قبریں رہ گئی تھیں۔ جن کی دیکھ بھال کرنے والا بھی اب کوئی نہیں رہا تھا۔ ہر سال برسات کی تیز بوچھاڑوں سے کوئی نہ کوئی قبر اچانک زمین میں دھنس کر ایک ایسا خلا بنا دیتی تھی جس کے تصوّر سے بھی دل گھبراتا تھا۔ دو بار ہی وہاں جا کر میں خود کو انتہائی غمگین محسوس کرنے لگا تھا۔ وہاں مجھے کسی طرح کی آسودگی کا احساس نہیں ہوا تھا جیسا جبل پور میں ہوتا تھا۔ جیسا اور کئی شہروں میں ہوتا تھا۔ جہاں مجھے جاننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ اقبال پور کی دھرتی پر چلتے ہوئے تو یوں لگتا تھا۔ جیسے پاؤں کے نیچے جگہ جگہ گڑھے بنے ہوئے ہیں۔ نہ جانے میں کونسے قدم پر کس گڑھے کی آغوش میں اتر جاؤں گا۔

اقبال پور میں بلقیس کی ایک بہت دور کی پھوپھی رہتی تھی۔ رحمت بُوا۔ خدا جانے وہ اس کی پھوپھی تھی بھی یا نہیں۔ لیکن بلقیس اس کے ہاں ہمیشہ جا کر ٹھہرتی تھی۔ وہ اس قصبے کی معمر ترین عورت تھی۔ اسّی سال کی۔ وہ اس کے نانا دادا کے وقتوں کی تھی۔ ان کے سارے خاندان کو جانتی تھی۔ جو آدھا زیرِ زمین تھا۔ اور آدھا پاکستان میں۔ بلقیس بھی کسی قافلے کے ساتھ وہاں چلی گئی ہوتی۔ جیسا کہ اس کے مرحوم نانا جان چاہتے تھے۔ اس کے نانا جان تو اپنے ایک عزیز کے نوجوان لڑکے کا انتخاب بھی کر چکے تھے۔ جو وہاں جا کر لاہور آباد ہو گیا تھا۔ بلقیس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ دینے کا اختیار اس کے نانا جان ہی کو حاصل تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کی نسبت ان کے زیادہ قریب رہی تھی۔ انہوں نے ہی اسے خود عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دی تھی۔ لیکن جب بلقیس کے سامنے اس کی زندگی کی سب سے بڑی منزل آ گئی تو اس وقت اس کے اپنے ابّا اس کے سدِّ راہ بن گئے۔ وہ اپنی اولاد کو اسی سرزمین پر رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں وہ خود رہ رہے تھے۔ ان کا یہ ارادہ خاندان کے اندر ایک شدید اختلاف کا باعث بن گیا۔ صرف اختلاف کا ہی نہیں۔ بلقیس کے نانا جان کی موت کا بھی۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ جس روز میں بلقیس کو اپنی دلہن بنا کر جبل پور لے جا رہا تھا۔ اسی روز اس کے نانا جان نے انتقال کیا۔ بلقیس جب رحمت بُوا کے پاس جاتی تھی تو وہ اسے اس کے نانا جان کی بہت سی باتیں سنایا کرتی تھی۔ ان کی وہ تمام خصلتیں جن کی وجہ سے وہ اپنے قصبے میں مشہور رہے تھے۔ بلقیس کو خود بھی اپنے نانا جان کی بہت سی باتیں یاد آتی تھیں۔ ان کا ایک مخصوص انداز سے ہنسنا، کھانسنا

غصّے ہونا، قرآن شریف پڑھنا۔ اور شیخ سعدی کے اشعار کی تشریح کرتے کرتے اپنے اوپر ایک وجد سا طاری کر لینا۔

رحمت بوا سے ملنے کے لئے وہاں پاکستان سے کئی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ رحمت بوا سب کی خیر خبر رکھتی تھی۔ بلقیس جب اقبال پور سے لوٹتی تو اس کی وہی کیفیت ہوتی تھی جیسی کسی عورت کی میکے سے لوٹنے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک ایک عزیز کا حال سناتی۔ میں نہ پوچھتا تب بھی وہ بتا دیتی تھی۔ کبھی کبھی لاہور چھاؤنی کے ڈپو سپروائزر کا ذکر بھی اس کی زبان پر آجاتا تھا۔ جو اب کئی بچوں کا باپ بن چکا تھا۔

میرا دھیان مطالعے سے ہٹ چکا تھا۔ اقبال پور کے بارے میں سوچتے سوچتے میری نگاہیں بلقیس کے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں۔ اس نے ایک بار کروٹ بدلی تو اس کے سر کے نیچے رکھا ہوا سیاہ برقعہ کھسک کر نیچے گر پڑا۔ میں نے برقعہ اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھنا چاہا تو اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ میری طرف چونک کر دیکھا۔ لیکن مجھے مسکراتا ہوا پا کر وہ پھر لیٹ گئی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ میں نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔ اور "غبارِ خاطر" کے کھلے ہوئے صفحوں پر سے وہ سطر ڈھونڈنے لگا۔ جہاں سے میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

لیکن میں بہت دیر تک اس کتاب میں کھویا ہوا نہ رہ سکا۔ میری نظروں کے سامنے بار بار بارہ سال پہلے کی وہ بلقیس آکر کھڑی ہو جاتی تھی جو اس وقت سولہ سترہ برس کی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی جس کی سب سے بڑی دلکشی اس کے چمکتے ہوئے سیاہ بالوں کی غیر معمولی درازی میں نہیں تھی۔ بلکہ اس کے چہرے کے دلفریب نقوش میں بھی تھی جو اسے ہند میں گذشتہ کئی سالوں سے آباد پٹھان خاندان سے ورثے میں ملے تھے۔ لیکن وہ اپنے جسم میں خیبر کے پہاڑوں جیسی بلندی اور تُندی کا صرف شکوہ ہی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں شمال وسطی میدانوں پر چھانے ہوئے آسمان کی ایسی گہری نیلاہٹیں بھی موجود تھیں۔ جو کسی بھی مشرقی لڑکی کے انتہائی ذہین ہونے اور اُس کے اندر کے شدید محبت کے جذبوں کی غمازی کرتی ہیں۔ بلقیس کی آنکھوں میں جب کبھی بے چینی جھلکتی تھی۔ وہ میرے حلق کی پھانس بن جاتی تھی۔ میں نے اپنے لئے جو راہیں منتخب کی تھیں میں جدھر بھی مڑا تھا۔ جس طرف بھی گیا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہی آئی تھی۔ لیکن ایسے جیسے کوئی اپنے سر پر منوں بوجھ اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہو۔ آج جب میں اس کے ساتھ اقبال پور جا رہا تھا۔ تو خود مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اب میں ایک بہت بڑا بوجھ اٹھائے لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہوں مجھے ایک بہت بڑی شکست کا بھی احساس ہوتا تھا۔ شاید یہ اسی شکست کا ہی احساس تھا۔ جو میرے دل پر ایک پہاڑ جتنا بھاری بوجھ بن کر بیٹھ گیا تھا۔

اچانک کمپارٹمنٹ کی زرد اور بیمار روشنی میں میں نے صبح کے اجالے کی ایک کرن دیکھی۔ جو ایک کھڑکی کے کہر آلود شیشے کے عقب میں سے اندر جھانک رہی تھی۔ اُسی وقت گاڑی ایک سٹیشن پر اچانک رُک بھی گئی تھی۔ اسے اب لکھنؤ سے پہلے کسی اسٹیشن پر رکنا نہیں چاہیئے تھا۔ لیکن وہ رک گئی تھی۔ میں نے سوچنا چھوڑ کر باہر کی آوازوں پر کان لگا دیئے تھے۔ سخت کنکروں والی زمین پر کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا جا رہا تھا۔ انجن اچانک رُک جانے کے بعد زور زور سے سانسیں لیتا ہوا جیسے ہانپ رہا تھا۔

جب گاڑی کئی منٹ تک نہ چلی تو میں دروازہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ دھند میں ڈوبا ہوا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اونچا پلیٹ فارم، چھ سات کمروں پر مشتمل یک منزلہ عمارت اور دور و نزدیک کئی بتیاں، سرخ سفید اور ہری ہری، ہوا چلنی بند ہو چکی تھی۔ میرے سامنے ذرا فاصلے پر اپنے چھوٹے سے دفتر میں ایک لیمپ کے آگے رات کی ڈیوٹی والا اسٹیشن ماسٹر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ میں کئی منٹ تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس رپورٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ جو انجن پر سے گرم گرم چائے سے بھرا ہوا ایک مگ اٹھائے گارڈ کے پاس بریک کی طرف لنگڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ اُس کی چلنے کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ تھوڑی دیر پہلے وہی میری بند کھڑکی کے پاس سے گذرا تھا۔ جب وہ قریب آیا

تو میں نے غور سے دیکھا۔ لیکن مجھے بھاری گرم اوور کوٹ اور نیلی پگڑی میں چھپے ہوئے ایک سائے کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا ــــــ "یہ کونسا اسٹیشن ہے؟" تو وہ رکا نہیں۔ میری طرف دیکھے بغیر جاتے جاتے کہہ گیا "نگوہاں"

نگوہاں کا نام سن کر میں یکبارگی جیسے چونک پڑا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اُس جگہ کا نام نگوہاں ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ لکھنؤ سے پہلے نگوہاں بھی ایک اسٹیشن آتا ہے۔ دراصل میں ادھر سے جب بھی گذرا تھا۔ گاڑی رات میں گئی تھی۔ اور یہاں کبھی رُکی بھی نہیں تھی جیسے اب اچانک رک گئی تھی۔

میں پورٹر سے مزید کچھ پوچھنے کے لئے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ لیکن وہ بہت دور جا چکا تھا۔ میں نے پلیٹ فارم پر چند قدم چل کر اس بات کا اطمینان کرنے کی کوشش کی کہ کیا وہ جگہ واقعی نگوہاں ہو سکتی ہے۔ پھر اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں جا کر اس سے بھی وہی سوال کیا۔ اُس نے پورٹر کی بتائی ہوئی بات کی تائید کی۔ تو میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی کی لہر محسوس کی جو میرے رگ و پے میں دوڑتی جا رہی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ سر اٹھا کر عمارت کو غور سے دیکھا۔ صبح کی دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی روشنی میں ایک جگہ نگوہاں لکھا ہوا بھی نظر آ گیا۔ لیکن یہ جگہ اب کتنی بدل چکی ہے پہلے تو اس اسٹیشن پر صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ تب یہ اونچا پلیٹ فارم بھی نہیں تھا۔ بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا پلیٹ فارم تھا۔ اس وقت تک میں ایک عجیب سی مسرت سے سرشار ہو چکا تھا۔ میں فوراً ڈبے کے اندر جا کر بلقیس کو یہ خوشخبری سنا دینا چاہتا تھا کہ گاڑی نگوہاں اسٹیشن پر رُکی ہوئی ہے۔

لیکن ڈبے کے اندر جانے سے پہلے مجھ پر ایک اور مسرت نے غلبہ پا لیا۔ وہ مسرت پہلی مسرت سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی۔ اُس نے تو مجھے بالکل پاگل کر دیا۔ میں بھاگتا ہوا پھر اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ میں نے اپنی جیب سے گاڑی کے ٹکٹ نکال لئے تھے۔ سارے ٹکٹ اس کے سامنے میز پر رکھ کر پوچھا ــــــ "کیوں صاحب! گاڑی ابھی کچھ دیر اور رُکے گی؟ اور کیا ہم یہاں اتر سکتے ہیں؟ اگر ہم یہ گاڑی چھوڑ کر دن میں کسی دوسری گاڑی سے چلے جائیں تو کوئی حرج تو نہیں ہو گا؟"

" اس نے میرے سوالوں کا جواب صرف سر ہلا کر اثبات میں دے دیا۔ اور میری طرف قدرے حیرت سے دیکھتا بھی رہا۔ میں اپنی مسرت کو اور کچھ مجھے قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور خوش ہو کر اس سے کہنے لگا۔

"شکریہ جناب۔ میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ لیکن یہاں پچیس سال سے نہیں آیا ہوں۔ دیکھئے یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ گاڑی یہاں اس طرح اچانک رک گئی ہے۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں جیسے یہ میرے لئے ہی رُکی ہے؟

میں اپنے آپ ہنستا ہوا باہر چلا آیا۔ لیکن دو قدم چل کر پھر رُک گیا۔ پلٹ کر پوچھا ــــــ "لیکن جناب کہیں یہ چل نہ دے۔ میرے ساتھ بچے بھی ہیں"
"نہیں جناب۔ آپ اطمینان سے اتر سکتے ہیں۔ آگے سے ایک اور گاڑی آ رہی ہے۔"

میرے منہ سے ایک ہی بار "اوہ" نکلی اور بھاگتا ہوا سا اپنے ڈبے میں جا پہنچا۔ بلقیس چند لمحے پہلے ہی جاگی تھی۔ اور وہ مجھے اپنے پاس نہ پا کر اور دروازے کو کھلا ہوا دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

میں نے ایک عجیب سی وارفتگی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اس کے گالوں پر رکھ دیئے۔ جنہیں اُس نے ایک جھٹکے سے پرے ہٹا دیا۔ کیونکہ اس ڈبے میں دوسرے مسافر بھی سوئے ہوئے تھے۔ لیکن میں اپنی غلطی کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے اس سے کہا ــــــ "بلقیس جلدی سے بچوں کو جگا دو۔ ہم یہیں اتریں گے۔ اسی اسٹیشن پر۔ لیکن دیر مت کرو۔ یہ گاڑی ایک دوسری گاڑی سے کراس کرنے کے لئے رکی ہوئی ہے اُس کے

بعد فوراً چل دے گی۔"

میں خود ہی بچوں کو جگانے لگا۔ ایک ایک کو آہستہ سے ہلایا۔ اور پکارا۔ اور شاید بلقیس میری مسرت کا ذرا سا بھی اندازہ نہیں کر سکی تھی۔ وہاں اچانک اتر پڑنے کی خبر سن کر وہ گھبرا سی گئی تھی۔ جلدی سے پاس لیٹی ہوئی نسرین کو سینے کے ساتھ لگا کر پوچھنے لگی تھی۔ "ہائے اللہ! کیا خیر تو ہے"

اس کا اس قدر گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر میری چھوٹتی ہنسی غائب ہو گئی۔ کیسہ غائب ہو گئی۔ مجھ پر افسردگی چھا گئی۔ ابھی چند منٹ پہلے میں پلیٹ فارم پر کتنی تیزی سے دوڑتا پھرتا تھا۔ اس وقت میرے پاؤں میں جیسے زنجیریں سی پڑ گئیں۔ میں جہاں کھڑا تھا۔ وہیں رکا رہ گیا۔ کچھ لمحوں تک بلقیس کی آنکھوں میں گھورتا رہا۔ انہی آنکھوں میں جو جبل پور سے نکلتے وقت انتہائی خطروں کے باوجود ایک دبی دبی فتح کے احساس سے چمک چمک اٹھی تھیں۔ لیکن اب ان میں کہیں چمک نہیں تھی۔ ان میں صرف خوف ہی خوف تھا۔

لیکن میں چند ہی لمحوں کی خاموشی کے بعد سنبھل گیا۔ جب سنبھلا تو مجھے اپنی خوشی واپس آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرے جسم میں پھر سے طاقت عود کر آئی۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا —— "آگے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم اپنی خوشی سے اتریں گے۔ اپنی خوشی سے پھر چل دیں گے خطرہ تو بس وہیں تک ہی تھا۔ جہاں سے ہم چلے تھے۔"

ہم سب گاڑی سے نیچے اتر گئے۔ حامد اور نجمہ اپنے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر گاڑی کے پہیوں کے نیچے سے اُدھر دوسری طرف سے جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے لگے تھے۔ نسرین بلقیس کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بلقیس نے اسے سردی سے بچانے کے لئے اپنا برقعہ پھیلا دیا تھا۔ میں دونوں کمبل اور ایک اٹیچی کیس اٹھائے ویٹنگ روم کی طرف بڑھا۔ بلقیس بچوں کو ساتھ ساتھ نہ چلنے کے لئے سرزنش کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر کے بعد دن کا اُجالا ہر طرف پھیل گیا۔ بلقیس وہاں اتر جانے کی وجہ سے ابھی تک برہم تھی۔ بید سے بنے ہوئے ایک چوڑے بنچ پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ حامد اور نجمہ باہر پلیٹ فارم پر گھومتے پھرتے تھے۔ ننھی نسرین دروازے کی جالی کے پیچھے کھڑی ہو کر حیرت سے باہر جھانک رہی تھی۔

اچانک حامد نے مجھے باہر آنے کے لئے پکارا۔ میں باہر گیا۔ تو وہ حیران ہو کر مجھے اس پورٹر کی طرف دیکھنے کے لئے کہنے لگا۔ جو گلے میں بھی ہوئی سگھوں کی بتیوں کا ہار ڈالے اور دونوں ہاتھوں میں مٹی کے تیل کی ادھ بھری بوتلیں اٹھائے۔ لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ وہی پورٹر تھا۔ جو مجھے صبح کے دھندلکے میں ملا تھا۔ اس وقت اس نے اپنا چہرہ سردی سے بچنے کے لئے پگڑی سے چھپا رکھا تھا۔ اب میں اسے صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے پر نگاہیں نہ ہٹا سکے۔ وہ بالکل قریب آ گیا تو وہ "خالد بھائی" کہہ کر رک سا گیا۔ صرف چند ہی قدم دور اس بات کا یقین کرنے کے لئے کہ میں سچ مچ خالد ہی تھا نا!

میں اُسے "ارے تم ہو رام داسے!" کہہ کر خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اسے بجھی ہوئی بتیوں کے ہار سمیت ہی گلے سے لگا لیا۔ مجھ سے اس قدر اچانک مل کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ کئی روز سے اُگی ہوئی ملگجی داڑھی میں چھپی ہوئی سانولی جلد چمکنے لگی۔

میں نے پوچھا —— "یہ تم لنگڑاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو؟"

اس نے جواب دیا —— "جوڑوں کے درد نے یہ حال کر رکھا ہے۔ تم اپنی کہو خالو بھائی! آج ادھر کیسے بھول پڑے؟ جان پڑتا ہے اب کسی محکمے کے افسر ضرور ہو گئے ہو۔ کیوں غلط تو نہیں کہا میں نے؟"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑا۔ میں نے اس کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اسے ایک بار پھر گلے سے لگایا۔ اور پھر رندھے ہوئے گلے سے اپنے

بچوں کو بتایا ـــــ " جانتے ہو یہ کون ہے؟ میرا بچپن کا دوست ۔ ہم دونوں اسی گاؤں میں کھیلے ہیں۔ وہ سامنے جو بہت سارے مکان دکھائی دے رہے ہیں۔ وہی ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں کی ہر گلی ــــ ہر گلی کا چپہ چپہ ہمارے گذرے ہوئے زمانے کی گواہی دے گا۔ کیوں رام داس!

اس نے اس بات میں سر ہلایا تو بتیوں کا ہار بج اٹھا۔ بچے مسکرانے لگے

رام داس نے ہم سب کو اپنے ہاتھ سے بنا کر چائے پلائی۔ اسٹیشن کے پاس ایک چھوٹی سی بگریا میں جا کر گرم گرم جلیبیاں بھی لے آیا۔ پھر ہم سب گاؤں کو دیکھنے کے لئے چل دیئے۔ میں انہیں اپنا گاؤں دکھانے میں فخر محسوس کر رہا تھا۔ بچے بھی بہت خوش اور پُرجوش تھے۔ کہ اس گاؤں میں ان کا ابو کبھی انہی کی عمر کے بچے کی طرح پھرتا رہا تھا۔ بچوں کو جب اپنے ماں باپ کے بچپن کی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ تو وہ حیران بھی ہوتے ہیں۔ اور خوش بھی۔ میں اپنے بچوں کی حیرت اور خوشی کی کیفیت سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بہت ہی لطف آتا ہے۔ انہیں چھیڑنے میں، عجیب و غریب باتیں سنا سنا کر حیران کر دینے میں، اور کوئی ایسی حرکت کرنے میں جس پر وہ کھل کھلا کر ہنس بھی پڑیں میں، بچوں کو خوش رکھنے کے سارے ڈھنگ جانتا ہوں۔ انہیں زور زور سے ہنستا ہوا دیکھتا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں۔ جیسے میرے اردگرد رنگ برنگ کے مہکتے ہوئے پھولوں والے کئی گلزار کھل گئے ہیں۔

ہمارے ساتھ بلقیس بھی تھی۔ چہرے سے نقاب اٹھائے چپ چاپ ساتھ دے رہی تھی۔ نہ ہنستی تھی نہ مسکراتی تھی نہ ہی کوئی بات پوچھتی تھی۔ میں نے جب اپنے بچپن کے دوستوں کے عجیب عجیب نام شبو، نواہو، کورشرنی، رام بھجو (اور رام داس ان میں سے میں انہیں اسٹیشن پر ملا چکا تھا) وغیرہ سنائے تو بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن بلقیس کے چہرے پر ایک بس طنز ہی ابھر سکی۔

اب تو گاؤں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ اس بڑے میدان میں جو اسٹیشن اور گاؤں کے بیچ خالی پڑا رہتا تھا۔ اور جہاں ہم دوڑیں لگایا کرتے تھے۔ اب کئی مکان بن چکے تھے۔ اب کہیں وہ پانی کا تالاب بھی دکھائی نہ دیا جس میں ایک عید کے موقع پر مجھے ایک لڑکے نے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اور میرے نئے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ اور جب میں گھر پہنچا تھا تو مجھے میرے ابا نے خوب پیٹا تھا۔ میرے اس طرح پٹنے کی بات سن کر حامد نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور پوچھا ـــــ " اچھا ابو یہ بتایئے آپ کو آپ کے ابو نے کس طرح پیٹا تھا۔؟"

" جس طرح پیٹا جاتا ہے۔"

" میرا مطلب ہے چھڑی سے یا تھپڑوں سے۔"

" اس طرح تھپڑوں سے!" میں نے ہنستے ہوئے اس کے گال کو تھپتھپا بھی دیا۔

نجمہ بولی ـــــ " لیکن ابو آپ تو ہمیں کبھی نہیں مارتے۔"

میں نے مسکرا کر بلقیس کی طرف دیکھا۔ اور شرارت سے کہا ـــ " میری بجائے تمہیں اپنی امی جو مارا کرتی ہیں!"

بلقیس تب بھی نہیں مسکرائی۔ نجمہ اپنی ماں کے ساتھ جا لگی۔ اور بولی " کہاں مارا کرتی امی! یہ تو ہمیں پیار کرتی ہیں۔"

میں انہیں اپنا مکان دکھانا چاہتا تھا۔ جسے پچیس برس پہلے میرے والد نے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے بیچ دیا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے ہائی سکول اور کالج کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لیکن جب وہاں پہنچے تو وہاں ایک دوسرا ہی مکان تعمیر ہو چکا تھا۔ جس کے مکین تک ہمیں نہیں پہچانتے تھے۔ وہاں ہمیں ابھی تک رام داس کے سوا کسی نے بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہاں کوئی ایسا شخص تھا بھی نہیں۔ وہاں کی بیشتر آبادی اگر یہیں پر دکانداری یا کھیتی باڑی نہیں کرتی تھی تو پھر آس پاس کے ضلعوں کے صدر مقاموں پر جا کر کارخانوں میں نوکری اور سڑکوں پر رکشا چلا کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔ میں اپنی ہی گلیوں میں اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ مسجد کے سامنے رک کر میں نے اس امام کو یاد کیا۔ جس نے مجھے نماز پڑھنا سکھایا تھا۔ اپنے اس زمانے کے پرائمری سکول میں پہنچ کر اس کمرے کے کونے کو تلاش کیا جہاں بیٹھ کر میں

پڑھتا تھا۔ اور سکول سے ملا ہوا کام نہ کرنے کی وجہ سے اپنے استاد کے سامنے مرغا بن کر سزا پایا کرتا تھا۔ اب وہ ہائی سکول بن گیا تھا۔

میں جہاں جہاں گیا بچے میرے ساتھ خوش خوش گھومتے رہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے میرا بچپن پھر واپس آگیا ہے۔ ایک بچے کی شبیہ اختیار کرکے میرے ساتھ گھومتا پھر رہا ہے۔

ہم لوگ گھومتے گھومتے پھر ریلوے لائن کے پاس جا پہنچے۔ اب ہم اسٹیشن کے دوسرے سرے پر تھے۔ شمال سمت پر۔ جدھر لکھنؤ تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے اندر ایک عجیب سا اضطراب پیدا ہو گیا۔ میں ایک بھولی بسری ہوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ وہاں ریلوے لائن کے سامنے ذرا فاصلے پر آم کا ایک پیڑ تھا۔ اس پیڑ کے سامنے ریلوے لائن خم کھا جاتی تھی لیکن وہاں نہ وہ پیڑ دکھائی دیتا تھا نہ ہی وہ لائن کا خم

"ابو آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" بچوں نے بھی بڑے اضطراب سے مجھ سے پوچھا۔

میں انہیں بتانے لگا — "جب میں یہاں رہتا تھا۔ تو میرے پاس ایک بہت ہی خوبصورت کتا تھا۔ چھوٹا سا۔ اتنا چھوٹا کہ جب چلتا تو بالکل زمین کے ساتھ ساتھ لگا ہوا معلوم ہوتا۔ اُس کے جسم پر گہرے بھورے رنگ کے لمبے لمبے چمکدار بال تھے۔ جو اُس کے منہ پر بھی اُگے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں پر بھی گر گر پڑتے تھے۔ اس کی پیاری پیاری آنکھیں تھیں۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کتنی کتنی دیر تک دیکھتے رہتے تھے۔"

"اس کا نام کیا تھا ابو؟"

"ٹپی"

"ٹپی!! بہت ہی پیارا نام ہے۔"

"اب وہ کہاں ہے ابو؟"

"وہ آپ نے لیا کہاں سے تھا ابو؟"

"میرے ابا کو ایک انگریز افسر دے گیا تھا۔ اس انگریز کی میرے ابا نے بہت خدمت کی تھی۔ میرے ابا نے وہ کتا میرے ہی لئے اس سے مانگا تھا۔ بہت ہی قیمتی تھا وہ! لیکن اس انگریز نے اسے میرے ابا کو دے ہی دیا تھا۔ ٹپی پھر میرا بھی دوست بن گیا۔ پہلے مجھ پر بہت بھونکتا تھا۔ پھر مجھ سے پیار کرنے لگا۔ ہر وقت میرے پاؤں چاٹتا تھا۔ میری سیٹی کی آواز سنتے ہی بھاگا ہوا آتا تھا۔ میں کھیلنے کے لئے کہیں جاتا تو وہ میرے ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا۔ میں نے اس کے گلے میں گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔ وہ بھاگتا تو گھنگھرو بہت ہی مزے سے بجتے تھے۔ چھن چھن چھن، چھن چھن چھن!!"

بچوں کی مسکراہٹیں چوڑی ہوتی گئیں۔ آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی۔ بلقیس ہاسے قریب ہی تھک کر ان پر بیٹھ گئی تھی۔ میں بچوں کے سامنے کھڑا ٹپی کی کہانی سنا رہا تھا۔

"ٹپی کو میں نے گیند اٹھا لانا بھی سکھا دیا تھا۔ جب ہم گلی ڈنڈا کھیلتے تھے تو وہ بھاگ کر اپنے آپ ہی گلی اٹھا کر لے آتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اسے اپنی کتابوں کا بستہ اٹھانا بھی سکھا دیا۔ جب میں لکھنؤ کے ایک مڈل سکول میں پڑھنے کے لئے روزانہ گاڑی سے جانے لگا تو وہ میرا بستہ اٹھا کر اسٹیشن تک ضرور آتا تھا۔ وہاں میں اس سے بستہ لے کر گاڑی پر چڑھ جاتا۔ گاڑی چل پڑتی تو وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگتا۔ وہ کچھ دور تک ہی بھاگ پاتا تھا۔ پھر گاڑی تیز ہو جاتی۔ وہ ایک موڑ تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ گاڑی چلی جاتی تو وہ گھر لوٹ جاتا۔

"ایک دن ہم گاڑی میں بیٹھے اسے ٹپی ٹپی کہتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ بھی گاڑی کے ساتھ ساتھ خوشی سے اچھلتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ہم زور زور سے پکارتے رہے اور وہ تیز بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب گاڑی لائن کے موڑ پر سے گھومنے لگی تو اس نے بھی گھوم کر ساتھ دینا چاہا۔ لیکن وہ موڑ بہت ہی خطرناک تھا

تیزی سے بھاگ کر آتا ہوا وہاں کوئی بھی آدمی گاڑی کے نیچے آ سکتا تھا۔ اس دن پپّی جب موڑ سے نکلنے لگا تو اچانک گاڑی کے نیچے آ گیا۔"

یہ سن کر بچوں کے منہ کھلے رہ گئے۔

میں نے بتایا۔ "وہ گاڑی کے نیچے کٹ گیا۔ ہم لوگوں نے گاڑی کی زنجیر کھینچ لی۔ زنجیر کھینچنے سے گاڑی رک گئی۔ ہم لوگ نیچے اتر آئے۔ پپّی کٹ چکا تھا مر چکا تھا۔ پتھروں اور کوئلوں پر اس کے گرم گرم خون کا جیسے چھڑکاؤ سا ہو گیا تھا۔ اسے مرا ہوا دیکھ کر میں دھاڑیں مار مار کر رو پڑا تھا۔"

"پھر؟ پھر ابو؟" حامد کے گلے سے بمشکل آواز نکلی۔ نجمہ کا حلق بھی سوکھ گیا تھا۔ وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔ نسرین سہمی ہوئی نظروں سے مجھے گھورے جا رہی تھی۔ بلقیس پہلی بار بڑی دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا۔

"اس کے بعد ہم لوگ پپّی کے کٹے ہوئے جسم کے حصے اکٹھے کر کے پیڑ کے نیچے لے گئے۔ وہاں ہم نے مل کر ایک گڑھا کھودا۔ پپّی کو اس میں لٹا کر اس پر بہت سی مٹی ڈال دی گڑھا بھرنے کے بعد اس پر بہت سارے پتھر رکھ دیئے۔ وہ ہمارے ایک بہت ہی پیارے دوست کی قبر تھی۔ ہم پڑھنے کی گاڑی سے لکھنؤ جاتے تھے تو اس کی قبر کی طرف ایک نظر دیکھنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔"

"ابو اس کی قبر اب کہاں ہے؟"

قبر تو اب کہیں نہیں تھی۔ اس کا نام ونشان تک مٹ چکا تھا۔ صرف یاد باقی رہ گئی تھی۔ ادھر اُدھر دیکھ کر پپّی کی قبر تلاش کرتے وقت اچانک میری نظریں بلقیس کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے تجسّس اور اضطراب کے لئے ایک بھرپور تائید تھی۔ تائید اور ہمدردی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹ پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ میرے بازو کو پکڑ کر آہستہ سے بولی ——— "کیا آپ چاہتے ہیں ہم لوگ کچھ روز یہاں رہیں؟"

○

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

غالبؔ

ادبِ لطیف

غلام الثقلین نقوی

ڈاچی والیا موڑ مہار وے!

زمیندار کے ڈیرے پر شہداد پور اور جھوک کمال کے لوگ جمع تھے۔

مہمان خانے میں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر نور پور کا زمیندار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں حقے کی نے تھی اور اس کی آنکھیں ایک نوخیز جوان کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں جو بڑی بے باکی سے اس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی مندریاں تھیں اور سیاہ پٹوں پر رنگین صافہ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے اوپر کے ہونٹ پر سرمئی لکیر نے ابھی بانکی مونچھوں کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور متناسب تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دھوپ اور سائے ناچ رہے تھے۔ ان آنکھوں میں بڑی گمبھیرتا تھی۔ جنگلوں اور ویرانوں کی وسعت کر دور افق کی پہنائیوں سے جا ملی تھی۔

اور دور ایک کونے میں سانولے رنگ کی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔

ان دونوں نے پیار کا بیوپار کیا تھا۔

یہ دونوں آج صبح صبح بھاگ کر زمیندار کے ڈیرے میں آئے تھے اور انھیں پناہ مل گئی تھی۔ اس لڑکی کا نام مریاں تھا۔ وہ شہداد پور کے ایک کسان کی بیٹی تھی جو مر چکا تھا اور سجاول جھوک کمال کے ایک معمولی سے زمیندار کا بیٹا تھا۔

صبح کے پناہ گزین ایک پہر دن گزرنے کے بعد ملزم بن گئے تھے۔

شہداد پور والے مریاں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے کیونکہ ان کے ضابطۂ اخلاق میں غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ بازو واپس کر لیے جائیں خواہ اس کے لیے بیس برس کیوں نہ گزر جائیں اور خون کی ندیاں بہانی پڑیں۔ جھوک کمال والے جانتے تھے کہ نور پور کا زمیندار علاقے کا راٹھ ہے وہ عدل و انصاف کے معاملے میں بڑا سخت ہے۔ انھیں یقیناً شکست ہوگی۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

زمیندار ڈھلی ہوئی عمر کا بارعب آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر نرمی اور ملائمت تھی لیکن اس کی آواز میں بڑی ہیبت تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے لیکن ان میں فولاد کی سختی تھی اور چاندی کی سی چمک بھی لیکن یہ آنکھیں کسی سے ہم کلام ہوتیں تو ان میں چھید جانے والی شعاعیں بھی پیدا ہو جاتیں۔ اس نے شہداد پور اور جھوک کمال کی کہانی بڑے غور و خوض سے سنی تھی۔ اس نے انھیں آپس میں معاملہ طے کر لینے کا موقع بھی دیا تھا لیکن دونوں گاؤں کے لوگ اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

سجاول کے باپ نے کہا تھا "سردار! میں نے جونہی سجاول اور مریاں کا قصہ سنا جھٹ شہداد پور چلا گیا۔ میں نے اپنی پگڑی ان کے پاؤں پر ڈال دی۔ انھوں نے میری عزت کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اب ہم بازو کیسے واپس کریں!" شہداد پور کی طرف سے ایک بوڑھے

نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "ہم بازو ضرور واپس لیں گے سردار!" زمیندار نے بہت سوچا۔ اسے کوئی حل نہ سوجھا۔ آخر اس نے کہا "اگر بازو واپس نہ ہوئے تو شہداد پور اور جھوک کمال کے لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہیں گے۔ اگر بازو واپس کر دیئے گئے تو بھی خون بہنے سے نہیں رکے گا۔"

اس نے مریاں اور سجاول سے مخاطب ہو کر کہا "لڑکی! تو اپنے گھر چلی جا۔ سجاول تو جوان ہے۔ میں تیرا آج کہیں رشتہ کروائے دیتا ہوں۔ بول!"

"نہیں سردار!" سجاول نے بڑے البیلے انداز میں کہا "میں کوئی بنیا ہوں کہ پیار کے دنجار میں مول تول کرتا پھروں۔"

زمیندار کے ملائم چہرے پر غصے سے شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا "بول! تو کیا کہتی ہے؟"

مریاں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

اس کے عشق کا امتحان تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی نگاہوں سے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ہر آنکھ اس کی طرف لگی ہوئی تھی۔ کوئی اس سے بھیک مانگ رہی تھی۔ کوئی شکستِ پندار کے خوف سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ کسی آنکھ میں غصے کا کرب تھا۔ کسی میں کچلے ہوئے سانپ بل کھا رہے تھے۔ مریاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سجاول کی طرف دیکھا پر اس کی نگاہوں میں صبح کے ستارے کی روشنی تھی۔ مریاں نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔ گال رگڑے اور چہرے کی سنولاہٹ سانوری شام کی طرح جگمگا اٹھی۔ آنکھیں دمکتے ہوئے تارے بن گئیں اور پھر ان میں ہیرے کی دو کنیوں کی صلابت آ گئی۔ اس نے زمیندار کی آنکھ میں آنکھ ڈال دی اور بڑی پرسکون شیریں آواز میں کہا "میں پیار کے دنجار میں سجاول سے پیچھے نہیں رہوں گی۔ کوئی سسّی پیار کے تھلوں سے لوٹ کر نہیں آئی۔"

ایک لمحے کے لیے زمیندار کے اعصاب جھنجھنائے۔ اس کی ملائم پیشانی پر شکنیں پڑیں اور پسینہ آ گیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا لمحہ تھا جب اس نے شکست کھائی تھی۔ ایک لڑکی سے۔۔۔۔ اس نے مریاں پر پھسلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اس نے دیکھا یہ لڑکی وہ تو نہیں جس کو اس نے ایک لمحہ پہلے دیکھا تھا۔ یہ تو پیار کے تھلوں کی سسّی تھی۔ ایک شہزادی جو ایک پنوں کو دل دے بیٹھی تھی۔ محلوں کی رہنے والی بے باک شہزادی جس کے چہرے پر اعتماد اور جس کی آنکھوں میں گستاخ ارادے تھے کہ چٹانوں کو پاش پاش کر ڈالیں اور زمیندار کے چہرے پر ایک جذبہ ابھرا۔ میں خود ان نگاہوں کو زیر کروں گا۔

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تلخ ہنسی ہنستے ہوئے کہا "شہداد پور والو! یہ سسّی پنوں کا عشق ہے۔ مجھے درمیان میں کیوں لاتے ہو؟ پر میں شہداد پور اور جھوک بلوچاں میں دشمنی کا بیج بھی نہیں بونا چاہتا۔ جاؤ! آج رات اپنے دلوں سے کوئی فیصلہ کر لو۔ سجاول اور مریاں میری پناہ میں رہیں گے۔"

اور اس نے مریاں کو اندر اپنے محل میں بھیج دیا جس کے گرد اونچی اونچی فصیل تھی جیسے کوئی قید خانہ ہو اور سجاول کو باہر مہمان خانے میں ٹھہرا لیا گیا۔

"رکڑ" زمین کے ایک وسیع ٹکڑے پر جہاں اوکاں اور دوں کے بوڑھے درخت بکھرے ہوئے تھے، آک، کریر اور لانے کی جھاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں سجاول اونٹ چرا رہا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ اردگرد بگولے اٹھ رہے تھے اور اس کے سر پر اوکاں کی جھالریں سرسرا رہی تھیں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ابھی دھوپ میں تیز چمک تھی کہ ہر طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ٹن ٹن۔ ٹن دور کہیں گھنٹیاں بجیں۔ بنجر زمین کے ٹکڑے میں سے گزرنے والی پگڈنڈی پر جو "کلر" کی ایک سفید لکیر ان کر دور تک چلی گئی تھی دھول کا غبار اٹھا۔ سجاول نغمہ کار وہ ان کے استقبال کے لیے ہمہ تن انتظار بن گیا۔

یہ قافلہ کہیں بیاہ پر جا رہا تھا۔ ایک ایک کجاوے پر پورا پورا خاندان سوار تھا۔ کجاووں پر رنگین اور چتکبرے کھیس بچھے ہوئے تھے۔ اونٹ دلہنوں کی طرح سنگارا ہوا تھا۔ گلوں میں سرخ سرخ ہار۔ ماتھوں پر گانیاں۔ گھٹنوں میں گھنٹیوں کی پازیبیں۔ قافلے والے ایک ایک نگاہ غلط

انداز کا وان دے کر بڑی بے نیازی سے اس کے پاس سے گزر گئے۔ ان کے پیچھے دھول کا ایک بادل فضا میں معلق ہو گیا۔ تب گرم لُو کا ایک جھونکا آیا اور مطلع صاف ہو گیا۔ ایک خواب گزر گیا۔ سجاول نے مڑ کر دیکھا اور ڈاچی کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور یکایک دوسرے پھر گرد کا ایک بگولہ سا اٹھا۔

"کوئی قافلہ سے پیچھے رہ گیا ہے۔" سجاول نے سوچا۔ "اکیلا سوار معلوم ہوتا ہے۔"

ایک لمحے غبار چھٹا۔ دوسرے لمحے سوار نے اس کے قریب پہنچ کر راسیں کھینچ لیں۔ سوار نے گرد سے بچنے کے لیے سر اور منہ پر منڈاسہ لپیٹا ہوا تھا صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ سجاول کی حیرت ان آنکھوں کی بولتی ہوئی چمک میں ڈوب گئی۔ "کوئی قافلہ گزرا یہاں سے؟" آواز میں الھڑ جھنک تھی جیسے چوڑیاں بج اٹھی ہوں۔ سجاول کی حیرت ایک سیاہ جھیل کے اتھاہ پانیوں میں ڈوب گئی۔ سطح پر ہلکا سا طوفان آیا اور ایک مسکراہٹ جس میں چمکیلی دھوپ کا مدوجزر تھا اس کی حیرت سے ہم کلام ہوئی۔ "کتنے فاصلے پر ہوگا؟"

"کون؟"

"وہی قافلہ جو ابھی ابھی ادھر سے گزرا۔"

"یہی کوئی تھہ پدھ پر۔"

سوار نے مرکب کو ایڑ لگائی تو سجاول چیخ اٹھا۔ "تیری کاٹھی کا تنگ ڈھیلا ہے کمیت گھوڑی کے سوار!" سوار ایک زقند لگا کر گھوڑے سے نیچے اترا۔ ایک جھٹکا لگا اور اس کا منڈاسہ کھل گیا۔ بالوں کی سیاہ چوٹی پیٹھ پر سرسراتی بل کھا گئی۔ سجاول کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اور دوسرے لمحے!

کائنات شرما لجا کر ایک دلہن بن گئی۔ اس کے آسمانی دوپٹے پر اماوس کی رات کے شوخ تارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ صندلی کلائیوں پر چوڑیوں کی چھن چھنا چھن چھنک تھی۔ چہرے پر سنولائی ہوئی شام کی ڈوبتی ابھرتی سرخیاں تھیں۔ صراحی دار گردن میں چڑھتے سورج کی کرنوں کی مالا تھی اور اس میں چاند ٹکے ہوئے تھے۔ ناک میں چاندی کی کیل تھی اور اس کا نگ صبح کا ستارہ تھا کہ ٹھنڈی میٹھی روشنی کا "لشکارا" بن گیا تھا۔

سجاول کو میٹھی نیند آگئی!

جب اس کی آنکھ کھلی تو کائنات مسکرا رہی تھی۔

اس نے پوچھا "کمیت گھوڑی کے سوار! کہاں جاؤ گے؟"

سوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے رکاب پر پاؤں رکھا تو سجاول بول اٹھا "بانکے سوار! تیری گھوڑی کا تنگ ڈھیلا ہے۔"

سوار نے رکاب سے پاؤں کھینچ لیا۔ سجاول نے آگے بڑھ کر گھوڑی کے پٹھے پر ہاتھ رکھا۔ حساس جلد تھرتھرا کر لرزن کا جال بن گئی۔ اس نے تنگ کسا۔ سوار نے ایک رکاب میں پاؤں رکھا تو سجاول نے دوسری رکاب تھام لی۔ زرتار سبک جوتی میں پھنسا پھنسا ننھا سا پاؤں اس کے ہاتھ سے چھو گیا تو اس کے چہرے پر ایک روشنی چمک چمک کر کانپی۔

اگلے لمحے کائنات کے بہروپیے نے اپنا سوانگ بدل ڈالا۔

آسمانی رنگ کا دوپٹہ منڈاسہ بن گیا۔ حنائی ہاتھ نے بڑے غرور بھرے انداز میں راس تھامی۔ کمیت گھوڑی نے کنوتیاں کھڑی کیں اور بڑھ کر ٹاپ ماری۔

ادبِ لطیف

سجاؔول نے پوچھا "کمیت گھوڑی کے سوار! اتنا تو بتا دو کہاں سے آئے ہو؟"

"شہدادپور سے...." سوار نے بڑی بانکی نخوت کے ساتھ گردن موڑ کر جواب دیا۔

اور کمیت گھوڑی کا رُکا ہوا جوش تندرو سیلاب کا ایک ریلا بن گیا اور نقشِ پا کے طور پر غبار کا ایک سنہری بادل چھوڑ گیا!

سنہری بادل!

سجاؔول سنہری بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور پلکیں جھپک جھپک کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ مہمان خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری روپہلی کرنیں درختوں کی پھننگوں سے کھیل رہی تھیں۔ جھوک کمال اور شہدادپور کے لوگ جا چکے تھے۔

لیکن مریاں کہاں تھی؟

سجاؔول چونک اٹھا اور اس نے سامنے موٹی موٹی دیواروں کے حصار کو آسمان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور اس کی مسکراہٹ مر گئی۔

سنہرے بادل کو اندھیرے کے غار نے ہڑپ کر لیا تھا!

دوسرے دن سہ پہر کو سجاؔول پھر سفید کلر سے آتے ہوئے راستے پر کھڑا تھا۔ آج کوئی قافلہ نہ گزرا اور سنہری دھول کا کوئی مرغولہ اڑ کر پیامِ حبیب نہ بنا۔ تیسرے دن سجاؔول پھر وہیں کھڑا تھا۔ یکایک ایک بگولے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ دھول میں اٹ گیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو بیاہ سے لوٹنے والے اکّے دکّے لوگ اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ پہلے کی طرح کمیت گھوڑی کا سوار سب سے بعد میں آیا۔ اس دفعہ کمیت گھوڑی خود بخود اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ سجاؔول آنکھوں میں اشتیاق کی روشنی لیے ہوئے آگے بڑھا تو کمیت گھوڑی کے سوار نے تنک کر کہا "آج تنگ ڈھیلا نہیں۔" سجاؔول کوئی جواب نہ دے سکا۔ کمیت گھوڑی کے بانکے سوار کی نسائیت پُراسرار میں مسکرائی۔ وہ جرأت کے پردوں میں اُترا اور اس نے گداز بازو پر ہاتھ رکھا تو صندل کلائی کا گداز نغمۂ شباب کی لپک بن گیا۔

سجاؔول نے کہا "دور دیس کے راہی! میں کب سے تیرے انتظار میں کھڑا ہوں! تیرے پاؤں کا نقش میرے دل پر پڑ چکا ہے۔ چل آج میرا مہمان بن۔ میں تیرے قدموں میں آنکھیں بچھاؤں گا۔ اجلا کھیس ڈال کر تجھے رنگین پلنگ پر بٹھاؤں گا۔ تو پھول ہے تو میں بھونرا بن کر تیرے گرد منڈلاؤں گا۔"

"نہیں!" کمیت گھوڑی کے سوار نے دھیمے سے کہا۔

سجاؔول بجھ سا گیا۔

بھونرا اڑ کر پھول کے پاس جاتا ہے۔ کہیں پھول بھی بھونرے کے پاس آتا ہے پگلے! سوار نے ایک پاؤں رکاب میں رکھا تو سجاؔول نے دوسری رکاب تھام لی۔ راس کو ایک تنکا لگا۔ گھوڑی نے کنوتیاں کھڑی کیں۔ ایک ٹاپ نے دھول کا مرغولہ اٹھایا تو سجاؔول کا جی بیٹھ گیا۔

کمیت گھوڑی کے بجیلے سوار نے کہا "کبھی شہدادپور آؤ تو مریاں کے ڈیرے کا پتہ پوچھ لینا۔ اس ڈیرے پر مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔"

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اوکاں کی جھالریں سرسرائیں۔ کائنات گنگنائی۔ وہ نغمۂ محبت کی عظمت اور گہرائی، اس کی وسعت اور گہرائی میں کھو کر غبار کا ایک ذرہ بن گیا کہ ایک ایسی کرن کی نوک پر رقص کر رہا ہو۔ اس نے کان پر ہاتھ رکھا۔ آبشار کے دھیمے نغموں کی ایک پھوار پڑی۔

گوری کے کانوں میں بندے جیسے چمکیں تارے!

سر پر کالی زلفیں جیسے لرزیں رات کے سائے!

ادب لطیف

ہونٹوں پر میٹھی ہنسی جیسے ٹپکیں شہد کے قطرے!   آنکھوں میں سرخی کے ڈورے جیسے شفق کے تانے

آہ میں نے ناگوں کے سامنے اپنا جگر اور شعلوں کے درمیان اپنا دل پھینک دیا ہے۔

کالے سائے!

اسے زلفوں کے گھمبیر سایوں تلے نیند آگئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو رات کے اندھیرے چھا چکے تھے۔

دور کونے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ سجاد نے اس سے پوچھا "بھائیا! میں کہاں ہوں؟"

"نور پور میں!"

"نور پور! ...... مریاں کہاں ہے؟"

اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کانٹے کی ایک تیز چبھن نے اس کے دل سے سرگوشی کی "مریاں تو ان اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے چھپ چکی ہے۔"

سجاد کو کھویا کھویا دیکھ کر ایک دن اس کے بڑے بھائی مراد نے کہا تھا "سجادے! ایسا لگتا ہے جیسے تو جوان ہو گیا ہو۔ کہے تو اب تیرا بیاہ کر دیا جائے؟" سجاد جواب میں دھیمے سے مسکرایا۔

ایک شام جب سورج ڈوب رہا تھا سجاد نے گھوڑے پر زین کسی اور لگام سے پکڑ کر اس جگہ لے آیا جہاں شہداد پور کی مریاں اسے ملی تھی۔ اس نقطے پر ایک زندگی ختم ہوئی تھی اور دوسری کا آغاز ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹک کر کھڑا رہا۔ پھر اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ گھوڑا سرپٹ بھاگا۔ دھول اڑی۔ سورج ڈوب گیا۔ سائے گہرے ہو گئے۔ ہوا میں سائیں سائیں کی خنکی بھر گئی۔ پگڈنڈی کی لکیر ایک چوڑی سڑک میں کھو گئی۔ اس کے ارد گرد اوکاں، وَن اور شیشم کے اونچے اونچے درخت تھے۔ سڑک کی طوالت سمٹے ہوتی چلی گئی اور تب اس کے متوازی چند ٹیلے آئے اور اس نے باگیں موڑیں۔ وہ شہداد پور میں داخل ہو گیا۔ شہداد پور ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی سڑکوں کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ سڑکیں خالی تھیں۔ گاؤں کے عین درمیان چوک میں پہنچ کر اس نے باگیں کھینچ لیں۔

ایک آدمی نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟"

"بہت دور پر اب تو رات پڑ چکی ہے۔ کوئی ٹھکانا مل جائے تو یہیں رات گزار لوں۔"

"تو چلے آؤ میرے ساتھ مریاں کے ڈیرے میں۔"

مریاں کا ڈیرہ خالی تھا۔ ایک کچے کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ سجاد نے کھلے صحن میں ایک کھونٹے کے ساتھ گھوڑا باندھ دیا اور صحن میں بچھی ہوئی ایک چارپائی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"مسافر! کہاں سے آئے ہو؟" ایک آواز نے پوچھا جس کے لہجے میں دودھ کے ایک گھونٹ کی مٹھاس تھی۔

"جھوک کمال سے۔" سجاد کی آواز میں لرزش تھی جیسے وہ ساز دل کے تاروں کو مضراب کی ٹھوکر سے بچا رہا ہو۔

"جھوک کمال سے!۔۔۔۔کہاں جاؤ گے؟" میزبان کی آواز میں تھوڑی سی حیرت تھی۔

"سستی کے دیس میں۔" سجاول کے ہونٹوں سے یہ لفظ یوں چھلک پڑے جیسے ماہیے کا ایک بول ہو۔

"سستی کا دیس!"

ایک تارا ٹوٹا اور سربستہ راز کا پردہ چاک ہو گیا۔

"تم؟" مریاں کی آواز میں تھوڑا سا خوف تھا۔ "مسافر! یہ لو دودھ کا کٹورا۔ روٹی کے دو ٹکڑے کھا لو اور تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کر دو۔"

"میں منزل پر پہنچ چکا ہوں۔ مجھے سستی کا دیس مل گیا ہے۔"

"نہیں! ابھی یہ دیس بہت دور ہے۔" مریاں نے دھیمے سے کہا۔

سجاول نے غٹ غٹ دودھ کا کٹورا پی لیا۔ اس کی نس نس میں ٹھنڈک رچ گئی۔ مریاں اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سجاول کی جوانی نے بڑھ کر مریاں کی جوانی سے معانقہ کرنا چاہا۔ اس نے مریاں کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ مریاں تھوڑا سا جھک گئی۔ اس کا سانس سجاول کے چہرے پر شبنمی پھوار بن کر گرا۔ اس سانس میں بھینی بھینی خوشبوئیں تھیں۔ اس نے کہا "سستی کے دیس کے مسافر ہو! سفر شروع ہو چکا ہے۔ جھوک کمال سے شہداد پور دور نہیں پر بیچ مکران اور کچھ کے فاصلے کالے کوسوں کے پڑاؤ ہیں۔ دیکھ تیرے قدم نہ ڈگمگا جائیں۔"

"نہیں مریاں!" اس کی ہمت آسمان سے جا چھوئی۔

ایک اور تارا ٹوٹا۔ اس کے پیچھے پیچھے تھلوں کی ریت بکھرتی چلی گئی۔ سجاول نے تھلوں میں سستی کے قدموں کے نشان دیکھے اور اسے راستہ مل گیا۔

تھلوں کی ریت!

ٹیلے اور بگولے۔ لو کے جھونکے۔ آگ کے ہولے۔ رقص کرتے ہوئے شعلے!

شہداد پور کی سستی تھلوں کے ایک "ٹبے" پر ننگے پاؤں آوارہ و سرگرداں تھی۔ اس کے پاؤں میں چھالے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ جھوک کمال کا ہوت زمیندار کے مہمان خانے میں اکیلا تھا۔ زمین پر تاروں کی چھاؤں تھی۔ آسمان پر تارے ٹوٹ رہے تھے۔ ذرے بکھر رہے تھے اور چنگاریوں کے جگنو اڑ رہے تھے۔

لیکن مریاں!

زمیندار کے محل کی ایک ہیبت ناک دیوار اس کے سینے پر آ پڑی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

ایک شام پھر سجاول نے چپکے چوری گھوڑے پر زین کسی تو اس کا بھائی مراد آ گیا۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو سجاول؟"

"شہداد پور۔"

"کیوں؟"

"ایک دوست سے ملنے کے لیے کمیت گھوڑی کا سودا ہے۔" سجاول کے ہونٹوں پر ہنسی کی ایک لہر تھی۔

"سجاول! مجھے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟"

سجاول نے ہنس کر کان پہ ہاتھ رکھا۔ ایک ڈھولا گایا اور گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ آج سجاول نے شہداد پور سے کچھ فاصلے پر ایک گھنے جھنڈ میں گھوڑا باندھ دیا۔ مریاں کے ڈیرے میں آج پھر کوئی نہیں تھا۔ رات اندھیری تھی۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تاریکی کے پردے گرتے رہے اور تب دبیز پردوں کے پیچھے سے ایک آواز نے پوچھا "کوئی مسافر ہے ڈیرے میں؟"

"ہاں! ایک مسافر جس کی منزل بہت دور ہے۔"

"سجاول تم؟" مریاں کی ڈری سہمی آواز نے پوچھا۔

"ہاں مریاں! یہ میں ہی ہوں۔"

"تم کیوں آئے سجاول؟ لوگوں کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔"

"سفر شروع ہوچکا ہے۔ اب میں منزل پر پہنچے بغیر کیسے لوٹ جاؤں؟"

مریاں نے حسبِ معمول گھر سے لاکر دودھ کا کٹورا پیش کیا اور اس کے پاس چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔ رات بیتنے لگی اور یکایک صبح کا تارا ابھر آیا جیسے ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے صبح کے اجالے میں مریاں کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ اس میں صبح کی خنکی تھی اور شبنم سے دھلے ہوئے پھولوں کی تروتازگی اور مریاں کے ڈیرے سے بڑی سڑک تک کا فاصلہ پھولوں کی سیج بن گیا جس پر وہ چل رہا تھا۔ خیالوں میں الجھا ہوا سپنوں کی وادی میں مستِ خرام کہ کسی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا اس نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا "کون ہو تم؟"

"یہ بات تو میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ بتاؤ تم کون ہو؟ رات کے اندھیرے میں شہداد پور کیوں آئے؟ اتنی سویرے کیوں لوٹ رہے ہو؟"

"میں شہداد پور کب آیا تھا؟ میں تو سسی کے دیس کا مسافر ہوں۔" سجاول کے ہونٹوں سے خود بخود پھسل گیا۔

"سسی کے دیس کا مسافر!" اس نے حیرت سے دہراکر کہا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟"

"جھوک کمال سے۔" منہ زور جوانی جھوٹ نہ بول سکی۔

"اس نے پھر اپنا ہاتھ سجاول کے بازو پر رکھ دیا۔ ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی تو سجاول کو غصہ آگیا۔ اس نے شعلے کی مانند بھڑک کر کہا "میرا بازو چھوڑ دو۔"

"تم نے رات کہاں گزاری؟"

"مریاں کے ڈیرے میں۔" سجاول پھر جھوٹ نہ بول سکا۔

گرفت سخت سے سخت تر ہوگئی سجاول نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑالیا۔ دوسرے آدمی نے سجاول سے لپٹ جانا چاہا تو اسے پہلی بار خطرے کا شعوری احساس ہوا۔ سجاول نے تڑپ کر اس کی گردن پر زور سے مکا لگایا، اور وہ آدمی تیوراکر گر پڑا۔ سجاول آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک آواز آئی ادھو..... ادھو..... ادہو..... یہ خطرے کا بلاوا تھا اور سجاول اس خطرناک پکار سے آگاہ تھا۔ وہ سرپٹ دوڑا۔ اس نے جھنڈ میں پہنچ کر گھوڑا کھولا۔ اچک کر اس کی پیٹھ پر بیٹھا اور ایڑھ لگادی۔ سویا ہوا شہداد پور بیدار ہوا تو سجاول بہت دور نکل گیا تھا۔ تعاقب بے کار تھا۔ شہداد پور کے جوان دانت پیس کر رہ گئے۔ جھوک کمال کا معمولی سا آدمی ان کی عزت سے کھیل کر یوں آسانی سے بچ نکلا تھا۔ مریاں گاؤں کی آنکھ کا تارا تھی۔ شہداد پور کے گبھروؤں نے بڑی ہتک محسوس کی۔

از رب لطیف

بڑے بوڑھوں نے کہا "یہ مریاں بڑی خود سر لڑکی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جب سے اس کا باپ مرگیا ہے اپنے ڈیرے کو یوں آباد رکھتی ہے جیسے گاؤں کے سب بڑے بوڑھے مرگئے ہوں۔ جس مسافر کو رات پڑ جائے وہ مریاں کے ڈیرے کا رُخ کرتا ہے جیسے شہداد پور کے باقی سب ڈیروں کے چراغ گل ہو چکے ہوں۔ ہم نے مریاں کی ماں کو کئی بار منع کیا کہ ایک جوان لڑکی کا ڈیرے کی خدمت کرنا اچھا نہیں پر اس نے ہماری بات پر کان نہ دھرا۔ اب بھگت لے خمیازہ۔"

دیہات کی خبریں ہوا کے شہپروں پر اڑتی ہیں۔

دھیرے دھیرے جھوک کمال کے ہر شخص کو پتہ لگ گیا۔ سجاول کے باپ نے ایک دن مراد سے پوچھا "یہ مریاں کون ہے مراد؟ اس کے باپ کا کیا نام ہے؟"

"رحمو!"

"رحمو!... خدا بخشے مرنے والے کے پاس زمین تو بہت کم تھی پر تھا بڑا اَنی مرد۔ شہداد پور میں اسی کے ڈیرے سے مسافر کو کھانا پانی ملتا تھا۔ یہ مریاں بڑی اچھی لڑکی ہے کہ باپ کا نام روشن رکھا پر سجاول تو پاگل ہے۔ سیدھی سی بات تھی، اسے یونہی ٹیڑھا کر دیا۔ رحمو زندہ ہوتا تو میری جھولی میں مریاں کو ڈال دیتا۔ سجاول سے کہو دو چار دن صبر کرے۔ شہداد پور والے میری سفید داڑھی کا ضرور لحاظ کریں گے۔"

سجاول کا باپ شہداد پور گیا۔

شہداد پور کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے کی ہمیں بڑی قدر ہے۔ تو کہے تو ہم تیرے پاؤں دھو دھو کر پانی پئیں پر تو جس کام کے لیے آیا ہے اس کے لیے ہمیں مجبور نہ کر۔ ہم بُرے بدنام ہو چکے ہیں۔ تیرے بیٹے سجاول نے شہداد پور کو کسی کا نہیں رہنے دیا، ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے۔"

سجاول کے باپ نے ہر حربے سے کام لیا۔ منتیں، خوشامدیں کیں۔ شہداد پوریوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ اپنی پگڑی اتار کر زمین پر رکھ دی اور کہا "یہ جھوک کمال کی عزت ہے جو تمہاری ٹھوکروں میں ہے۔"

شہداد پور کے لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آیا۔

مراد نے کہا "سجاول بڑا خود سر ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا! مجھ سے پوچھتے ہو؟" بوڑھے جانگی نے غصے سے کانپ کر کہا "زمانہ بدل گیا ہے۔ نہر کے آنے سے جوانوں کے خون پانی ہو گئے ہیں تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ اگر میرا زمانہ ہوتا تو..... "

بوڑھے نے بات پوری نہ کی۔ مراد سمجھ گیا۔

مراد کی تحریک پر ایک رات جھوک کمال کے جوان اکٹھے ہوئے۔

گئی رات تک صلاح مشورے ہوتے رہے۔ سجاول نے کئی بار کہا کہ یہ اس کے عشقِ صادق کا معاملہ ہے کسی دوسرے کو اس پرائی آگ میں کودنے کی کیا ضرورت ہے لیکن جھوک کمال کے جوانوں نے اسے اپنی عزت کا سوال بنا لیا تھا۔ ایک عورت کے ذریعے سجاول کی طرف سے مریاں کو پیغام بھیج دیا گیا کہ اس کا پیار سچا ہے تو وہ اگلی رات انھیں شہداد پور سے باہر درختوں کے جھنڈ میں ملے۔

دوسری رات جھوک کمال کے جوان مسلح ہو کر شہداد پور گئے!

گھنے جھنڈ میں نوجوانوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے لیکن سجاؔول بڑا خوش تھا۔ سسّی کے دیس میں آج تک کسی پنوں سہرے باندھ کر نہیں گیا تھا۔ اگر مریاں اسے یونہی مل جاتی تو عشق بدنام ہو جاتا۔ مرؔیاں چپ چاپ آئی۔ اسے سجاؔول نے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لیا اور قافلہ جھوک کماؔل کی طرف لوٹنے لگا۔ تھلوں میں کوئی تند بگولہ نہ اٹھا باد سموم کا ایک خونخوار جھونکا بھی نہ آیا۔ ویران ٹیلوں پر سسّی کے پاؤں بھی زخمی نہ ہوئے۔ سجاؔول بجھ سا گیا جیسے اس نے عشق و عاشقی کی بہت بڑی توہین کی ہو!

جب شہداؔدپور والے جاگے تو مریاں جھوک کماں پہنچ چکی تھی لیکن شہدادپوریوں نے اپنی ہتک کو کڑوے نوالے کی طرح حلق سے بھی نہ اتارا۔ وہ سجاؔول اور مریاں کا کھوج نکال نکال کر سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتے رہے۔ سجاؔول اور مریاں ایک ڈیرے سے دوسرے ڈیرے میں منتقل ہوتے رہے اور آخر ایک ڈیرے پر شہدادپور کے لوگوں نے انہیں آ ہی لیا۔ جھوک کماؔل کے لوگ ان کی مدد کو نہ پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے ڈیرے والوں نے سجاؔول اور مرؔیاں کو چپکے سے نکال کر ایک راستے پر لگا دیا۔

مریاں نے کہا "سجاؔول! سسّی کے دیس کا سفر اب شروع ہوا ہے۔"

سجاؔول کانپا۔ کہکشاں پر ریت کے غبار اڑ رہے تھے۔ سفر شروع ہو چکا تھا۔ شاید!

رات کے اندھیروں نے انھیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف گھنے سایوں کی گپھائیں تھیں۔

سجاؔول نے کہا "مریاں! کون جانے ہم ابھی سسّی کے دیس کی کون سی منزل پر ہیں پر اللہ کا شکر ہے کہ میں اکیلا نہیں۔ تم میرے ساتھ ہو۔"

یکایک مرؔیاں رک گئی۔ سبک جوتی کے نازک تلے میں سے ایک کانٹے کی نوک نے پاؤں کے تلوے میں چبھ کر پہلی منزل کی خبر دی تھی۔ مریاں نے کانٹا نکالا اور ہنس کر کہا "سجاؔول! میں نے تو سنا تھا تھلوں میں سسی اکیلی تھی۔ اس کے پاؤں میں چھالے تھے، وہ پنوں کے قافلے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔"

سجاؔول پھر کانپ گیا۔

تقدیر اپنے روپ بدلتی رہتی ہے۔

نجانے سسّی کے اس سفر کا انجام کیا ہو!

وہ چلتے رہے۔ رات گزرتی رہی اور یکایک رات کے اندھیروں نے بھی انہیں اپنی پناہ سے نکال دیا۔ صبح کا ملگجا اجالا چھا گیا۔ سجاؔول نے مرؔیاں کا ہاتھ تھام کر کہا "رات بیت گئی ہے مریاں!"

مرؔیاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پگڈنڈی سے کچھ فاصلے پر مرغوں نے اذانیں دیں۔ سجاؔول نے مرؔیاں کو ایک جھاڑی کی اوٹ میں بٹھایا اور گاؤں میں چلا گیا۔ گاؤں ابھی سویا ہوا تھا۔ اس نے در و دیوار پر ایک نظر ڈالی۔ یہ نورؔپور تھا۔ اس گاؤں کا زمیندار بڑا مہمان نواز تھا۔ انھیں یقیناً پناہ مل جائے گی۔

اور انھیں پناہ مل گئی!

اور جب اس صبح کا سورج بلند ہوا تو شہداؔدپور والے بھی کھوج نکالتے نکالتے نورؔپور آ پہنچے اور ان کے پیچھے پیچھے جھوک کماؔل کے لوگ بھی۔ زمیندار کا ڈیرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صبح سے لے کر سہ پہر تک زمیندار عدالت کی مسند پر بیٹھا رہا۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے اور رات پڑ گئی!

رات!

اب ڈیرہ خالی تھا۔ کھلے صحن میں اندھیرا تھا۔ سائیں سائیں ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کے ریشوں میں ٹھنڈک رچی ہوئی تھی۔ سجاول حیران تھا۔ یہ سفر کی کون سی منزل تھی کہ یہاں پہنچ کر قافلہ اچانک رک گیا تھا۔ یہ قافلے والے کہاں گئے؟ سجاول سر جھکائے صحن میں ادھر سے ادھر پھیرا مارتا اور سوچتا رہا۔

آسمان پر ایک تارا ٹوٹا۔

اندھیروں میں روشنی کی ننھی سی پھوار پڑی اور سجاول کی نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ تھلوں کی ریت اور سجاول کو یاد آ گیا۔

سسّی کا دیس!

وہ بے اختیار پکار اٹھا" مریاں! دیکھو تو رات بڑھ چکی ہے۔ آؤ اگلے پڑاؤ کی طرف قدم بڑھائیں۔ نہیں تو شہداد پور والے یہیں آ لیں گے"

لیکن مریاں تو سامنے کی سربفلک دیواروں کے پیچھے قید ہو چکی ہے۔

سجاول کے سینے پر خوف کا کوڑیالہ سانپ رینگا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر چیخا "مریاں! مریاں!"

رات کی گہری خاموشی میں اس کی چیخ ابھرا بھر کر ڈوب گئی۔ وہ اونچی اونچی دیواروں کے حصار کی طرف بڑھا۔ اس نے فصیل کے ساتھ ساتھ چکر لگایا۔ اندر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑے ہو کر مریاں کو کئی بار پکار پکار کر بلایا۔ اسے پکار کا کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے زور زور سے کواڑ پیٹے۔

"مریاں! مریاں!"

اور کواڑ کھل گئے۔ سجاول نے دوڑ کر اندر جانا چاہا تو پیچھے سے دو آدمی لپک کر آئے اور انہوں نے سجاول کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھاٹک میں جو آدمی کھڑا تھا اس نے بڑی سنگدلانہ اور ہیبت ناک آواز میں حکم دیا۔" اسے باندھ لو اور اونٹ پر لاد کر جھوک کمال کے نزدیک چھوڑ آؤ۔ دیکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

سجاول مچھلی کی طرح تڑپ کر ان دو آدمیوں کی گرفت سے نکلا۔ پھاٹک کی طرف بھاگا اور چشم زدن میں پھاٹک سے جا ٹکرایا لیکن پھاٹک بند ہو چکا تھا۔ اس نے دھکے دیئے لیکن پھاٹک نہ کھلا۔ تب اس نے سر کے ساتھ پھاٹک کو ٹکریں لگائیں۔ اس کے ماتھے سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی اور پھاٹک نہ کھل سکا۔ دونوں آدمی بڑھے اور انہوں نے سجاول کو رسوں میں جکڑ لیا۔

دن چڑھے شہداد پور اور جھوک کمال کے لوگ زمیندار کے ڈیرے میں جمع ہو گئے۔ کافی دیر بعد زمیندار اپنے حرم سے برآمد ہوا۔ اس نے مسندِ عدالت پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

شہداد پوریوں نے کہا" ہم اپنے بازو واپس لیں گے۔"

جھوک کمال کے لوگوں نے پکار کر کہا" سردار! ہم اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے پر بازو نہیں لوٹائیں گے۔"

زمیندار سر جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ جب اس نے آنکھیں اٹھائیں تو لوگوں نے دیکھا کہ ان میں فولاد کی کند چمک ہے لیکن اس نے بڑے

نرم لہجے میں کہا: "لوگو! میں جانتا تھا تم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکو گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہداد پور اور جھوک کمال ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ میں نے خود ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں یہ فیصلہ منظور ہو گا۔"

پھر دیر رک کر زمیندار نے ایک ایک تنے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہیں لوگوں کے سینے چھید کر دلوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اس نے سپاٹ سی آواز میں جس کے اندر کوئی جذبہ نہیں تھا کہا: "میں نے آج تک اپنی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو واپس نہیں کیا۔ میں مریاں کو لوٹا نہیں سکتا۔ شہداد پور والو! تم خوش ہو جاؤ کہ میں نے تمہاری مریاں کو اپنے محل کے قابل سمجھ لیا ہے اور جھوک کمال کے لوگو! تم مطمئن رہو اب تمہیں شہداد پور والے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے تمہیں ان کو خونی انتقام سے بچا لیا ہے۔"

زمیندار نے قہقہہ لگایا اور اس کا قہقہہ بجلی کی چمک تھا کہ مجمع کو چاٹ کر رکھ گیا۔

ایک عرصے کے بعد سجاول کے باپ نے اٹھ کر پوچھا: "سردار! مجھے تیرے ڈیرے میں سجاول نظر نہیں آ رہا۔"

"سجاول!" زمیندار نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہ تیری پناہ میں تھا سردار!"

"میری پناہ میں تھا تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔" زمیندار نے پھر قہقہہ لگایا۔

سجاول کا باپ کانپ گیا۔

"تو سنو! آج صبح ہم نے مجبور ہو کر اپنے مہمان کو صحیح سلامت رخصت کر دیا۔"

"کہاں؟ کس طرف؟" سجاول کے باپ کی آواز پھٹ گئی۔

"سسی کے دیس میں!" زمیندار بڑی سرد مہری کے ساتھ مسکرا دیا۔

"تو نے سچ کہا سردار!" سجاول کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

تب اس نے شہداد پور والوں پر ایک نگاہ ڈالی جس سے نفرت کا زہر ٹپک رہا تھا۔

اس نے کہا: "شہداد پور یو! خوش ہو جاؤ کہ تمہاری عزت محفوظ رہی۔ سجاول اب سسی کے دیس میں پہنچا ہے۔ اس سے پہلے وہ پاگل صرف جوانی کا کھیل کھیلتا رہا۔"

"سردار!" اس نے زہر خند ہنسی کے ساتھ کہا: "ہم تیرا احسان کبھی نہیں بھول سکتے۔"

اِقبال متین

ساحی

میں نے جب اُن کا خط کھولا تو گلاب کی پنکھڑیاں میرے قدموں میں بکھر گئیں۔

اور یہ پنکھڑیاں ساحرہ نے چن لیں۔

میرا کتنا جی چاہا کہ جھک کر ایک ایک پنکھڑی چن لوں ___ لیکن یہ مجھ سے نہ ہوا۔ شرم دامن گیر تھی۔ میں نے ان کا خط بھی تو نہیں پڑھا بس القاب پر نظر ڈال کر ہی سرخ ہو اُٹھی اور اپنے بلوز میں اُڑس کر پلو برابر کر لیا۔

پنکھڑیاں چن کر ساحرہ نے مجھے دی نہیں بلکہ نہایت احتیاط سے انہیں پلو میں باندھ لیا ___ مجھے اس کی یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی ___ میں تو سمجھی ہوئی تھی کہ وہ چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دے گی اور میں مٹھی میں دنیا بھر کی نظروں سے ان پنکھڑیوں کو چھپا لوں گی۔ یہاں تک کہ ساحرہ کی نظروں سے بھی۔

قدوائی کاٹیج کے کُنج کُنج میں لوگ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے موتیوں کی مثال اس لیے دی ہے کہ سب کے سب سفید لباس میں ملبوس تھے اور اس لیے بھی کہ ہم گیٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پارکنگ کے حصے سے نشیب چمن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیڑھیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے جو بلندی سے دو شاخوں میں خوبصورتی شکل میں بٹ گئی ہیں اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں۔ ہم سبھوں نے موٹروں سے اترتے ہی انہیں سیڑھیوں کا رخ کیا تھا ___ میں اپنی مرضی سے سب کے پیچھے رہ گئی اور بلندیوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے اُجلے اُجلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا جو ان خوبصورت سیڑھیوں پر موتیوں کی مالا بن گیا تھا ___ اور یہ مالا نشیب میں پہنچ کر ٹوٹ رہی تھی۔ اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر بکھر رہے تھے ___ علیم نے مڑ مڑ کر کئی بار مجھے دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن میں ان کی نظروں سے چھپ کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ آنکھیں بھری پوری محفل میں کسی کو تلاش کر رہی ہوں، مضطرب، بے قرار، بے کل لیکن چھپے چوری ___ اور وہ آنکھیں جن کی تلاش ہو رہی ہے، چمن کے کسی محفوظ گوشے میں پھولوں کے بیچ چھپ کر ان پیاسی آنکھوں کی بے قراری کا منظر دیکھ رہی ہوں جو متلاشی ہیں ___ تو دل دنیا بھر کی کتنی ہی دولتیں پا لیتا ہے۔

اور میں اُنہی دولتوں سے مالا مال تھی ___

علیم کی نظروں سے چھپ کر علیم کو دیکھتے رہنے میں میرے لیے کیا کچھ نہ تھا۔ میری اپنی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک بھی تھی۔ علیم کی غزالی آنکھوں کی بے قراری کا سماں بھی تھا۔

اور علیم نے میری اسی آنکھ مچولی سے تنگ آ کر مجھے یہ خط لکھا تھا جو اس نے ساحرہ کے ہاتھ مجھے بھجوایا تھا۔

اور میں پھر کسی محفوظ کنج کی تلاش میں گھوم رہی تھی تاکہ سب کی نظروں سے چھپ کر علیم کے خط کے لفظوں کو اپنی آنکھوں میں اتار لوں۔

مجھے پھر بکھری ہوئی پنکھڑیوں کا خیال آیا جو ساحرہ نے چن لی تھیں۔

اور میں پھولوں کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑی جہاں رنگ برنگے پھول مسکرا رہے تھے۔ — پھولوں کے جھنڈ کی اس اوٹ نے مجھے پناہ دی —— میں نے خط کھولا۔ علیم نے لکھا تھا۔

روحی...... میری زندگی

میں نے چمن میں قدم رکھتے ہی تمہارے لیے یہ پھول کسی کومل سی ایک شاخ سے جدا کر لیا تھا کہ اسے تمہاری زلفوں
کی لمبی سیاہ رات کا چمکدار ننھا سا ستارہ بنا دوں۔ لیکن تم تک میری رسائی کہاں جبکہ تم خود مجھ سے چھپتی رہی ہو۔
اس پھول کے مقدر میں تو پنکھڑی پنکھڑی ہو جانا تھا۔ سو میں نے بے دردی سے اسے نوچ دیا ہے —— اب تم
اتنا ہی کرو کہ ان پنکھڑیوں کو بکھرنے نہ دو۔

تمہارا علیم

اور پنکھڑیاں نہ صرف یہ کہ بکھر چکی تھیں بلکہ ساحرہ کے ہاتھوں نے انہیں میرے قدموں میں سے چن لیا تھا —— میں تڑپ کر رہ گئی۔ میں نے خط پھر پڑھا —— اور میری زلفوں کی لمبی سیاہ رات بغیر کسی تارے کے ویران سی رہ گئی۔

جب میں پھولوں کے جھنڈ سے نکل کر سب میں آملی تو علیم نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں پیار کر رہے ہوں —— تاش کھیلتے ہوئے ان کی نظریں تاش پر نہیں تھیں۔

لیکن اب میرے دل و دماغ پر علیم نہیں ساحرہ چھا چکی تھی۔ میری نظریں اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

یکایک وہ مجھے نظر آئی —— علیم ہی کے پیچھے بیٹھی ہوئی انہیں کارڈ ڈس کارڈ کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

ساحرہ کس درجہ علیم سے گھل مل گئی ہے —— وہ تو میرے اور علیم کے درمیان ایک ایسا رابطہ باہمی تھی جو زنجیر کی ایک کڑی کو دوسری کڑی سے ملاتی ہے۔ لیکن جب یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے تو اس کی کڑیاں انہیں جوڑوں میں سے جدا ہوتی ہیں جو ان کے ملاپ کا وسیلہ تھیں ——

میں صرف اتنی سی بات پر ساحرہ کی مخالفت میں اتنا بہت کچھ کیوں سوچ رہی تھی۔ شاید میرے اندر چھپی ہوئی وہ عورت بیدار ہو رہی ہو جو زندگی کا داؤ لگا کر بھی اپنی محبت کی ایک ایک کرن کا حساب جاننا چاہتی ہو اور علیم تو خاندان بھر میں چمکتی ہوئی دھوپ تھے —— سب کے چہیتے۔ لیکن یہ سوچ تو میرا ہی تھا نا —— بلا شرکت غیرے میرا۔ میں کچھ ایسا ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

پتہ پھینکو بھی —— ساحرہ کی آواز نے مجھے اور علیم کو بیک وقت چونکایا —— اور علیم نے جھٹ سے پتہ پھینکنا چاہا تو ساحرہ نے اُن کے ہاتھ تھام لیئے۔

"کیا کر رہے ہو —— تمہیں ڈھنگ کا پتہ پھینکنا بھی نہیں آتا" —— علیم کے ہاتھ میں ادھ کھلے گول پنکھے کی طرح سجے ہوئے کارڈس میں سے جو پتہ آگے نکل آیا تھا۔ اس کو ساحرہ نے پھر سے برابر کر دیا —— اور بڑے ہی تحکمانہ انداز سے کہا — یہ پتہ پھینک دو۔

اور علیم نے چپکے سے وہی پتہ پھینک دیا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ساحرہ نے مجھے ڈس کارڈ کروا دیا ہے۔

اور اس کے بعد علیم نے میری طرف بہت کم دیکھا اور میں اپنی یہ توہین گوارا نہ کر سکی اور چپکے سے اُٹھ کر تاش کی اس محفل سے چلی آئی —— اس وقت شاید میں علیم کے ذہن سے اسی طرح محو ہو گئی تھی جیسے ڈس کارڈ کیا ہوا پتہ کھلاڑی کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

میں جب اٹھ کر جانے لگی تو ساحرہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن کہہ جانا اُن کے بس میں نہ ہو۔

میں کسی گوشے میں چھپ چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی ——— لیکن گوشے میں پہنچ کر بھی میرے آنسو نہ نکلے۔

وہ ہارٹ کی بیگم جو علیم نے ڈس کارڈ کی ہے ——— وہ تو تم ہو ——— وہ تو تم ہو ——— وہ تم ہو۔

"میں نہیں ہوں ——— میں نہیں ہوں ——— میں نہیں ہوں" ——— میری زبان سے بہت آہستہ سے یہ الفاظ نکلے۔

اور دو آنسو میرے گالوں تک ڈھلک آئے۔

"یہ کیا ہے ——— پگلی ——" میں نے اپنی آنکھوں پر نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

یہ ہاتھ ساحرہ کے تھے ——— میں تڑپ کر رہ گئی۔

"خدارا مجھے تنہا چھوڑ دو ساحی"

"لیکن تم وہاں سے اس طرح اٹھ کر کیوں چلی آئیں"

"نہیں اس سے کیا مطلب"

"بہت ہو چکی بکواس۔ چلو میرے ساتھ ——— میں نے جو کچھ لیا ٹھیک ہی کیا ہے"

ساحرہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ پھر کہنے لگی "مجھے پتہ ہے ساری لڑکیاں تم دونوں پر ہنس رہی تھیں ——— تم لوگ اس طرح ہوش کیوں کھو دیتے ہو اپنے ——— قریب آتے ہو تو سلیقے سے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر پاتے۔ سٹی سی گم ہو جاتی ہے بس ——— ایسے جیسے محبت نہیں کر رہے ہو ——— زندگی سے ڈر رہے ہو ——— حرکت اور احساس سے ڈر رہے ہو"

میں جیسے ہوش میں آنے لگی۔ یہ سب ایک بے نام سی کیفیت تھی۔ دل و دماغ اور زبان سب کی مدہوشیاں ہیں جب ہماری آنکھیں اٹھا لیتی ہیں تو ساحرہ ہماری سوتی جاگتی آنکھوں پر پردے ڈالتی پھرتی ہے ——— لیکن اس پردہ داری سے اسے کیا مل جاتا ہے؟!

اس کے اصرار پر میں پھر سب لڑکوں میں آ ملی۔

تاش کی محفل برخواست کر دیئے میں علیم بھی پیش پیش تھے۔ طے یہ ہوا کہ آنکھ مچولی کھیلی جائے۔ لیکن ہم لڑکیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

علیم نے مجھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کی کہ میں راضی ہو جاؤں اور میں نے مدہوش آمادگی ظاہر کر دی بلکہ دوسری سہیلیوں کو بھی ہموار کر لیا۔ کھیل شروع ہوا تو میں اسی جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف بھاگی جو مستقل طور پر میری جائے پناہ تھی۔ میں نے جھنڈ کے پیچھے خود کو چھپا لیا اور خرگوش کی طرح دبک گئی۔ ساری لڑکیاں اور لڑکے تدروائی کالج کے کنج کنج میں چھپتے پھر رہے تھے ——— مجھے شبہ گزرا کہ اس لڑکی نے مجھے پھولوں کے جھنڈ میں جاتا ہوا دیکھ لیا ہے جو چور بنی تھی۔ میں ابھی اسی ادھیڑبن میں تھی کہ جہاں سے کہیں اور جا چھپوں کہ پیچھے سے کسی نے مجھے دبوچ لیا ——— میری چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی ——— میں سمجھ گئی کہ میں چور بن گئی ہوں ——— لیکن مجھے تو ایک ایسے چور نے دبوچ لیا تھا جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چرا لیا تھا اور اس ادا سے کہ میں لٹ لٹ کر مسکرا رہی تھی۔ راتوں کی نیند اس نے چرا لی تھی۔ دن کا سکھ اس نے چرا لیا تھا اور اب اس پھولوں کے جھنڈ تک آ پہنچا تھا کہ تدروائی کالج میں میرا یہ گوشہ عافیت بھی چرا لے جو مجھے ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر اس کی بے چین نظروں کا نظارہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

ہش ——— اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے سرگوشیوں میں کہنے لگا ——— بس زندگی بھر ہم دونوں یونہی چھپے رہیں گے۔

میں علیم سے اس قدر قرب کے احساس ہی سے سلگ اٹھتی تھی اور اب جبکہ انہوں نے مجھے اپنی باہوں میں لے رکھا تھا تو میرا جسم جیسے جل رہا تھا۔ میری ساری ہستی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ میری نس نس میں ایک آتش سیال رواں تھی ——— میری کن پٹیاں بھڑک رہی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے خود مجھے سنائی دے رہی تھی۔

پھر علیم کے ہونٹوں کا لمس میں نے اپنی گردن پر محسوس کیا ——— میں تڑپ کر ان باہوں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ جن باہوں کے حلقے میں محصور ہو کر ساری زندگی گزار دینے کا مجھے ارمان تھا ——— میں نے کوشش کی لیکن باہوں کی زنجیر نے مجھے کس کر رکھ لیا۔

اور ہم دونوں اسی عالمِ سرشاری میں اس چور کو بھول بیٹھے تھے جو قسمت کی طرح ہمارا تعاقب کر رہا تھا ——— کہ کسی نے قریب ہی سے کہا ———

"کوئی آ رہا ہے ——— کوئی آ رہا ہے۔"

علیم مجھے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ میرے کانوں میں اُمڈنے والا خون جیسے سرخی رخسار بن کر منجمد ہو گیا۔ ایک ایسے خوف نے ہماری محبتوں پر چھپ چھپ کر پیچھے سے وار کیا تھا جو خود ہماری محبتوں ہی کا پروردہ تھا۔ میں پسینے میں نہا نہا کر رہ گئی ——— یہ کیسا لمحہ تھا۔ یہ کیسی گھڑی تھی۔ یہ کیسا پل تھا، جو بجلی بن کر ہم پر گر گیا تھا۔

یہ کون ہے جو ہمیں دوسروں کی آمد کا احساس دلا رہا ہے ——— میں تو اس سے بھی خائف تھی جو میرے اس راز سے واقف ہو کر مجھے دنیا کی نظروں سے بچا لینے کے لیے اپنے تعاون کی پیش کش کر رہا تھا۔

تم کہیں اور چلی جاؤ روحی ——— اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ اور میں نے آواز پہچان لی ——— یہ ساحرہ تھی ——— میری اپنی ساحی۔ علیم کے اور میرے درمیان جو ایک رابطہ تھی ایک واسطہ ایک وسیلہ۔ زنجیر کی کڑیوں کا وہ جوڑ جو ایک کڑی کو دوسری سے ملاتا ہے۔

"تم لوگوں نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی" ——— وہ پھر کہنے لگی ——— اور علیم نے اسے بڑی ناگواری سے دیکھا لیکن ساحی نے علیم کی ان نظروں کی بالکل پروا نہیں کی ——

اُس کا اس طرح ہمارا تعاقب کرنا مجھے بڑا ناگوار محسوس ہوا ——— وہ آخر کون ہوتی ہے جو ہمارا سایہ بن گئی ہے۔ اس کی اس دوستی کے پیچھے آخر کونسا جذبہ کام کر رہا ہے ——— مجھے تو اس پر کچھ شک سا ہونے لگا اور یہ شک اس وقت یقین سے بدل گیا جب میں نے دیکھا کہ ہماری طرف کوئی بھی نہیں آ رہا تھا ——— ساحرہ نے ہماری یکجائی سے جل کر صرف ہمیں جدا کر دینے کے لیے ہمیں کسی کی آمد سے ڈرایا تھا ——— اور میں اس لیے ڈر گئی تھی کہ ایسے میں جبکہ دو دل مل رہے ہوں کوئی آ دھمکتا ہے تو وہ اکیلا نہیں ہوتا۔ تنہا نہیں ہوتا، ایک دنیا اُس کے ساتھ ہوتی ہے، ایک زمانہ اس کے ساتھ ہوتا ہے ——— لیکن یہاں تو کوئی نہیں تھا۔

علیم اٹھ کر دوسری طرف جانے لگے تو ذکیہ نے جو اس وقت چور تھی علیم کا تعاقب کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ علیم کو جالیتی کوئی دوسرا ہی اس کے ہاتھ لگ گیا ——— وہ راحی تھی جو پاس ہی پیڑ کے تنے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی ——— اور ذکیہ راحی سے چمٹی ہوئی چلا رہی تھی۔

"راحی چور، راحی چور ——— ساتھیو باہر آ جاؤ ——— راحی پکڑی گئی۔"

سب کے سب چھپے ہوئے گوشوں سے کچھ اس طرح نکل آئے کہ دوسرا یہ بھی نہ جان سکا کہ کون کہاں چھپا تھا۔

میں بھی اٹھی تو ساحرہ نے میری بانہہ پکڑ کر کہا ——— تمہیں کیا ہو گیا ہے روحی ——— محتاط رہو ——— کوئی دیکھ لیتا تو ——— اور پھر ——— اور پھر ——— اتنا قرب بھی تو اچھا نہیں۔

میں نے تنک کر بانہہ چھڑا لی ——— اور اپنی دوسری ہمجولیوں میں بھاگ آئی۔

اس کے بعد میں نے خود کو چور سے زیادہ علیم سے چھپائے رکھنے کے جتن کئے۔

آنکھ مچولی جاری رہی ———

میں نے دیکھا ساحی، علیم سے کچھ ایسی باتیں کر رہی تھی جس کا علیم بُرا مان رہے تھے اور یہ باتیں یقیناً ہم دونوں کی یکجائی کی مخالفت میں ہوں گی۔

میں نے سوچا علیم سے صاف صاف کہہ دوں کہ اب تمہارے خط کے ایک ایک لفظ کے لیے مجھے برس برس بھر ترسنا گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں

ہے کہ کوئی تمہارا اور میرا سایہ بن جائے ـــــ اور واقعی مجھے ساحی سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

لنچ کا وقت آیا اور ہمیں اطلاع دی گئی تو ہم سب اکٹھے ہونے لگے۔

علیم ہری محفل میں مجھ سے بات کرتے ہوئے اجتناب ہی کرتے۔ لیکن بعض کوشش واقعی اتنی اچھی تھیں کہ انہوں نے بڑھ کر خود میری تواضع کی اور دو ایک بار تو اپنی پلیٹ سے میری پلیٹ میں چپکے سے کچھ چیزیں منتقل کر دیں ـــــ اپنے تھا اور یہ مواقع ہمیں آسانی سے فراہم ہو سکتے تھے ـــــ جو ہوئے بھی۔

اس نعمت کے باوجود بھی جو مجھے علیم کے قرب کی صورت میں حاصل تھی۔ کوئی اندرونی کرب تھا جو مجھے ڈس رہا تھا اور واقعی میں موقع کے انتظار میں تھی کہ علیم سے کہہ دوں ـــــ مجھے ساحی سے بچا لو ـــــ مجھے ساحی سے بچا لو۔

ساحی دبے پاؤں میرے دل کے قریب اس طرح چلنے لگی تھی جیسے کوئی چور سارا اثاثہ لوٹ کر واپس جاتے ہوئے صاحب خانہ کے قریب سے پنجوں کے بل چلتا ہو ـــــ اس دروازے کی طرف جس دروازے کو اس نے اپنی واپسی کے لیے کھول رکھا ہو ـــــ

ساحی اسی طرح علیم کی چھپی ہوئی دولت لے کر میرے نہاں خانہ دل میں آئی ـــــ اور جب یہ دولت میں نے موجتن سے چھپا کر رکھ لی تو وہ چوروں کی طرح لوٹ کر پنجوں کے بل واپس جا رہی تھی اور وہی دروازہ اس نے واپسی کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا جس سے وہ داخل ہوئی تھی۔

لیکن لنچ پر وہ موجود نہیں تھی ـــــ میں نے کتنا اسے تلاش کیا ـــــ اپنی ہمجولیوں اور سہیلیوں سے پوچھا ـــــ سب حیران تھے ـــــ وہ یکایک اس طرح کہاں چلی گئی ـــــ کیوں چلی گئی۔ اس کے سوا اور کوئی سہیلی موجود نہ ہوتی تو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں گھوم پھر رہی ہوں گی۔

مجھے رانی نے چپکے سے بتایا ـــــ کہ اس نے ساحی کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے ـــــ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ آبدیدہ تھی۔

میں نے کہا چل تو ذرا اوپر دیکھ آئیں ـــــ اس کا اسکوٹر ہے یا نہیں ـــــ مضبوط سیڑھیوں سے گزر کر ہم اوپر پہنچے تو اس مقام پر جہاں موٹریں پارک کی گئی تھیں ساحی کی "وسپا" نہیں تھی۔

ہمیں اس کی واپسی کا یقین ہو گیا اور ہم نشیب چمن میں لوٹ آئے۔

لیکن یہ بات کہ وہ آبدیدہ تھی ـــــ زہر کا بوند بوند بن کر میرے ذہن پر گر رہی تھی۔

رانی جیسے مجھ سے دور کھڑی ہوئی کہہ رہی ہو۔

"وہ آبدیدہ تھی" ـــــ

پھر جیسے قریب آ کر اس نے کہا ـــــ

"وہ آبدیدہ تھی" ـــــ

میں نے پھر بھی نہیں سنا تو ـــــ اس نے جیسے میرے کان میں کہہ دیا تھا

"وہ آبدیدہ تھی" ـــــ

لنچ ختم ہوتے ہوتے وہ لوٹ آئی۔

رانی نے بڑے چاؤ سے کھانا اس کے لیے میز پر چن دیا جو اس نے بڑے ہی اہتمام اور احتیاط سے ساحی کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

رانی کی اس حرکت نے ہماری دوسری سہیلیوں کے ساتھ مجھے بھی چونکا دیا۔

کیسی اچھی حرکت کی رانی نے۔ دوستی کی، محبت کی۔ ایسی حرکت جو چپکے سے دل میں ... دور تک اپنے لیے راستہ بنا لیتی ہے اور پتہ تک نہیں چلتا۔

ساحی کے لیے یہی سب کچھ تو مجھے کرنا چاہیئے تھا۔

رآبی نے بتایا تھا وہ آبدیدہ تھی ـــــ اور میں یہ جان کر اس لیے خوش ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں کی یہ نمی۔ اس کی پلکوں کا یہ بھیگا پن اسی دوستی کے ضمن میں تھا جو وہ مجھ سے اور علیم سے بیک وقت نبھا رہی تھی ـــــ اُسی دوستی کے ضمن میں تھا جو کبھی کبھی میرے ذہن میں اپنا روپ بدل کر اُبھرنے لگی تھی ـــــ لیکن میں قطعی طور پر تصفیہ نہ کر پائی تھی کہ ساحی کی دوستی اور دشمنی میں کتنا فصل ہے ـــــ اب جو وہ چپ چاپ اپنے کھلنے پر جھکی ہوئی تھی تو اس کی اس بے بسی پر نہ جانے کیوں مجھے سکون سا مل رہا تھا۔

میں ایسے جذبے اپنے دل و دماغ میں ساحی کے لیے پرورش کرنے لگی تھی جو بیک وقت ہمدردی اور نفرت کے پروردہ تو ہوتے ہیں لیکن محبت کے پیدا کردہ کبھی نہیں ہوتے۔

اور یہ سارا انقلاب مجھ میں آج ہی پیدا ہوا تھا۔

اسی قدوائی کالج میں جس کے گیٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پارکنگ کے حصے سے نشیب چمن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیڑھیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے جو بلندی سے دو شاخوں میں بیضوی شکل میں بٹ گئی ہیں اور نشیب چمن میں بھر مل گئی ہیں ـــــ اسی قدوائی کالج میں جہاں سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے میں اپنی مرضی سے سب سے پیچھے رہ گئی تھی اور بلندیوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے اُجلے اُجلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا تھا جو ان بیضوی سیڑھیوں پر موتیوں کی مالا بن گیا تھا ـــــ اور یہ مالا نشیب میں پہنچ کر ٹوٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر بکھر رہے تھے۔

اور اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ بکھرے ہوئے موتی اگر مالا کا روپ دھار لیں بھی تو وہ موتی اس میں نہ پروئے جا سکیں گے جو میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ تاب دار تھے۔ سب سے زیادہ آب دار تھے۔

اور وہ موتی تھے علیم میں اور ساحی۔

ساحی کھانا کھا چکی اور میز سے اٹھی تو میں بھی اس کی اداسی سے سکون پا کر خیالات کی دنیا میں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھی۔ قدوائی کالج میں اس طرح لوٹ آئی جیسے مجھے وہیں لمحے میں اپنے محبوب کی باہوں میں واں پایا نہیں ہے بلکہ کسی چھپے ہوئے دشمن کے مضبوط بازوؤں کے بھرپور وار سے بچ نکلتا ہے۔

اور میں اپنے انہی تصورات کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ساحی کے مقابل ہو گئی۔

لنچ کے بعد بڑے بوڑھوں نے سستانے کا پروگرام بنایا۔ اس سستانے میں نیم دراز ہو کر قیلولہ کرنے سے لے کر پاندان کھول کر گلوریاں بنانے پھر گلوریاں منہ میں رکھے جگالی کرنے تک کے سارے شمائل شامل تھے ـــــ میلوں ٹھیلوں میں، اَنْفرکویں میں یا پکنکوں میں جبکہ زندگی قدرے تیز گام ہو جاتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سایوں میں ذرا دیر کو دل بھر کر سستا لینا، منچلے نوجوانوں کے لیے لمحۂ فکر بھی ہوتا ہے اور لمحۂ نشاط جاں بھی۔

ایک تو ایسا لگتا ہے جیسے بزرگوں نے جن کی عقابی آنکھیں چمن میں جھومتے ہوئے پھولوں پر نظر رکھتی ہیں، ان کی اڑتی ہوئی خوشبو پر نظر رکھتی ہیں، تھک ہار کر کہیں بیٹھ رہی ہیں تاکہ "آگے چلیں گے دم لے کر" ـــــ اور ان لمحات فرصت میں پھول زیادہ ہی جھوم لیتے ہیں۔ خوشبو ہر نفس کے لیے شمیم جاں بن جاتی ہے۔

لنچ کے بعد یہی سب کچھ ہو رہا تھا ـــــ لنچ کے بعد قدوائی کالج میں ایک دنیا اونگھ رہی تھی۔ ایک دنیا اپنی ترنگوں کے ساتھ کسمسا کر بیدار ہو رہی تھی ـــــ بیدار ہوتی ہوئی دنیا نے اپنے پر تولے ـــــ چلو چلتے ہیں ـــــ ذرا ادھر اُدھر گھوم آئیں۔ شام ہوتے ہوتے تو واپسی ہو گی ـــــ گھومنے پھرنے کا اب یہی تو ایک موقع ہے۔

بات دبی زبان سے نکلی تھی جو نعرہ بن کر زباں زد ہو گئی ـــــ اور جیسے اس نعرہ بازی سے بوڑھے چونک اُٹھے ـــــ

"نہیں ابھی لنچ کے بعد یہ گھومنا پھرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ لنچ کے بعد تو سستانا چاہیئے —— کچھ تاش واش چلنے دو بیٹھے بیٹھے یہیں پر"

"ہم نے ایسا کونسا تگڑا لنچ کیا ہے —— یہی جتنا آپ لوگ ناشتہ کرتے ہیں"

سب ہنس پڑے بزرگ بھی نوجوان بھی —— سبھوں نے پلٹ کر دیکھا —— ساحی یہ جملہ کہہ کر ایسی چپ چاپ کھڑی تھی جیسے صرف زنا بھی مسکرانا بھول گئی ہو۔

ہم گھومنے پھرنے کے لیے نکل پڑے —— تدوائی کالج کے احاطے سے باہر نکلتے وقت گیٹ کی اوٹ سے کسی نے میری بانہہ پکڑلی —— میں ذرا رک گئی تو علیم نے تڑپ کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے زندگی بھر ایک لمحے کی مجھ سے جدائی بھی وہ سہہ نہ سکیں گے —— میں نے آنکھوں آنکھوں میں انہیں تسلی دی کہ بس ابھی ان تک پہنچتی ہوں —— لیکن گیٹ کی اوٹ میں چھپی ہوئی ساحی پر نظر پڑتے ہی علیم بگٹٹ ہمارے پاس بھاگ آئے۔ ایسے جیسے ہم دونوں کی یکجائی سے ڈرتے ہوں —— ہم دونوں کا سر ایک دوسرے سے جوڑ کر آہستہ سے ٹکرایا —— پھر بڑے چاؤ سے ساحی کے دونوں ہاتھ علیم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیے —— انہیں بڑی نرمی سے دبایا —— پھر گال سہلانے —— پگلی کہیں کی —— اس قدر بُرا مان جاتی ہے ——

ساحی میرا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تو علیم پیچھے رہ گئے —— لیکن اس منٹ بھر میں میرا یہ حال ہو گیا تھا جیسے سرِ بازار اس آدمی نے میرے منہ پر تھوک دیا ہو جس کو میں چاہت کی نظروں سے تک رہی تھی ——

میں بھلا ساحی پر ترس کھانے چلی تھی —— اُس ساحی پر جس نے مجھے اپنے برابر کھڑے رہنے کے قابل ہی نہ رکھا۔

علیم کی اس حرکت نے مجھے جیسے بلندی سے گرا دیا تھا۔ ایسی بلندی سے جس پر علیم خود میرا ہاتھ تھام کر لے گئے تھے۔

ساحی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی —— بڑی سماجت سے۔ اتنی لجاجت سے کہ شاید وہ میرے پیر بھی تھام لیتی —— شاید —— شاید وہ علیم کو مجھ سے مانگ لینا چاہتی تھی —— لیکن علیم جب خود دوڑ کر اُس کے آگے جھک گئے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ساحی نے میری غلط فہمیوں کے منہ پر ایک طمانچہ مارا ہے۔

منٹ بھر میں پھر ایک بار ساری بساط الٹ چکی تھی —— میں سوچ رہی تھی کہ علیم میرے ہیں یا ساحی کے —— دستِ سوال مجھے دراز کرنا پڑے گا یا ساحی کو —— میں تو جب ساحی آبدیدہ ہو کر اس انجمن سے فرار ہوئی تھی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں ساحی پر جب چاہے مسکرا سکتی ہوں۔ جب چاہے ترس کھا سکتی ہوں۔

لیکن اب خود میرا یہ حال ہو گیا تھا کہ ساحی تو کیا ہر شخص مجھ پر ترس کھا سکتا تھا۔

ساحی نے اپنے قدم تیز کر لئے تھے۔

میں پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ شاید سبھوں میں جا ملی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

علیم اس طرح گم سم تھے۔ جیسے ہار جیت کا نقشہ جما رہے ہوں —— میں نے بھی اُن کو نظر انداز کر دیا —— میرے اندر کی عورت پھر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ عورت جو مرد کے قدموں تک جھکنا گوارا کر لے بھی تو عورت کے آگے سر خم کرنا کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی اور پھر ایسی صورت میں جبکہ اس کی محبت چھینی جا رہی ہو۔

میرا پندار اب اس عورت کا پندار تھا جس کو دوسری عورت نے محبت چھین کر ہی زخمی نہیں کیا تھا بلکہ جس کا محبوب خود بڑی اہانت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اس عورت کی طرف بڑھ گیا تھا جس نے محبت چھینی تھی۔

رو حی ٹھہر جاؤ ——

پیچھے سے علیم نے مجھے اس طرح پکارا جیسے اُن کی آواز میں دنیا بھر کا دکھ درد سمٹ آیا ہو۔

ساتھی مجھے اور علیم کو پیچھے چھوڑ کر شاید سبھوں میں جا ملی تھی۔

میں بھی چاہتی تھی کہ علیم کو پیچھے چھوڑ دوں ———

لیکن ساتھی سے آگے نکل جاؤں ایسی کوئی بات میرے بس میں نہ تھی ———

پھر بھی میں نے اپنے قدم اور تیز کر لیے۔

علیم نے بالکل اس طرح پکارا جیسے پپیہا 'پی کہاں' پکارتا ہے۔

میں نے بارہا پپیہے کی آواز کو اس طرح بھی محسوس کیا ہے جیسے یہ آواز میرے اپنے دل سے پیدا ہو رہی ہو، میری اپنی زبان سے نکل رہی ہو اور میرے اپنے ہی کانوں میں درد ہی درد ٹپکا رہی ہو ———

لیکن آج میں نے علیم کی اس آواز کو سنی اَن سنی کر دیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے اس آواز کے درد کی لذتوں سے میں آشنا ہی نہیں ہوں۔

ساتھیوں کی ٹولی مسلسل نشیب و فراز سے ہو کر گزر رہی تھی۔ بیری کے گھنے درختوں کا ایک سلسلہ سا دور تک شروع ہو رہا تھا اور یہ ٹولی اس سلسلے کے بیچوں بیچ پہنچ چکی تھی جبکہ بیری کے یہ سائے میرے قدموں کے نیچے ابھی ابھی جھکے تھے ——— علیم ابھی دھوپ ہی میں تھے اور سایوں تک پہنچ نہ پائے تھے۔

یکایک دو پرندے پاس ہی کے ایک پودے سے اُڑے اور بیری کی ایک ٹہنی پر بیٹھ کر پھر محوِ اختلاط ہو گئے۔

میری نظریں اُن پر جم گئیں تو پیچھے سے کسی نے ہاتھ بڑھا کر میری آنکھیں ڈھانپ لیں ——— میں نے تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہا تو باہوں کے حلقۂ زنجیر میں جکڑ کر رہ گئی ——— علیم پیر دبا کر پتہ نہیں کب مجھ تک آ پہنچے تھے ——— اُن کے قدموں کی چاپ یا تو میں نے سنی نہیں یا پھر اس چاپ پر مجھے میرے اپنے دل کی دھڑکن کا گمان گزرا ہوگا جو میں نے اس کو نہیں پہچانا۔

بیری کے ان درختوں سے دور ذرا سے نشیب میں ایک جھاڑی کے پیچھے سے ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی ——— میں اور علیم جدا ہوئے تو یہ چیخ کراہ میں بدل گئی —

لیکن میں ابھی تک اپنی ہی آگ میں جل رہی تھی ——— میرا سارا وجود خود ہی ایک چیخ بن کر رہ گیا تھا۔ میری ہستی خود ہی مجھے ایک کراہ معلوم ہو رہی تھی۔

اور مجھ میں بیدار ہوتا ہُوا عورت کا پندار اس مٹھاس میں تلخیاں گھول رہا تھا۔

اور پاس ہی کوئی کراہ رہا تھا۔

بالکل اس طرح جیسے میرا وجود کراہ تھا ——— میری ہستی کراہ رہی تھی ——— میری زخمی روح کراہ رہی تھی۔ میری مجروح محبت کراہ رہی تھی۔

علیم سے جدا ہو کر میں بڑی بے دلی اور سرد مہری سے آگے بڑھنے لگی تو اس کراہ نے دامنِ دل کو پھر سے تھاما۔

واقعی کوئی قریب ہی تھا۔

میں نے پلٹ کر علیم کو صرف اس لیے دیکھا کہ ان سے کہہ سکوں کہ وہ اس کراہ کی تہہ تک پہنچیں۔

وہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے۔ تم بھی چلو۔ دیکھتے ہیں۔

میں زندگی بھر کے لیے علیم کا قرب چاہتے ہوئے بھی کم از کم اس وقت اُن سے دور رہنا چاہتی تھی تاکہ وہ میری برہمی سے پوری طرح متاثر ہوں۔ کیونکہ ان کا قرب میرے غم و غصہ کے اظہار کے لیے مشکل تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
کچھ دیر توقف کرکے انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے التجا کر رہے ہوں لیکن جب میں نے نظریں پھیر لیں تو وہ آگے بڑھ گئے۔

جھاڑی کے قریب پہنچے تو نشیب میں انہوں نے جھانک کر دیکھا اور ٹھٹک گئے ——

میں نے دور ہی سے پوچھا کیا بات ہے۔ انہوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا ——

پہلے تو میں نے پس و پیش کیا۔ پھر کراہنے کی آواز سنی تو قدم خود بخود اٹھ گئے ——

قریب پہنچی تو علیم نے مجھے سہارا دے کر نشیب میں جھکایا۔

وہاں تو ساحی کانٹوں میں الجھی ہوئی پڑی تھی ——

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی —— میں نے علیم سے کہا —— کود پڑیئے نا آپ بھی —— اٹھا لائیے بے چاری کو اب تو وہ چلنے کے لائق بھی نہ

ہوگی۔ آپ ذرا سا اٹھالیں تب ہی بیڑا پار ہو۔

طنز کے یہ نشتر علیم نے سہہ لیے اور چپکے سے نشیب میں سنبھل سنبھل کر اترنے لگے —— مجھے ان کی یہ حرکت اور بھی بری لگی کہ انہوں نے میری دل کی لگی

کو سمجھ کر بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی —— جھوٹے منہ تو کہہ دیتے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

علیم نے جھک کر ساحی کو سہارا دیا تو اپنی دونوں باہیں ان کی گردن میں حمائل کرکے وہ جھول گئی —— اور اتنی سفاکی سے ——

کہ میں جل گئی۔

یہ معاندانہ رویہ اس طرح کھلے بندوں ساحی نے کبھی اختیار نہیں کیا تھا —— میرا عالم یہ تھا جیسے میری اپنی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے

میں نے ہی اپنا کفن سرکایا ہو اور میں ابھی اپنے مردہ چہرے پر حسرتوں کی ریکھائیں پڑھ رہی تھی کہ جیسے ساحی نے نفرت سے چہرہ ڈھانک دیا۔

علیم سہارا دے کر اسے اوپر لے آئے تو وہ بدقت تمام علیم کے سہارے لنگڑاتی ہوئی مجھ تک پہنچی —— اور میرے قریب آکر یکایک اچھل پڑی۔

پھر اچھی بھلی تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگی۔

میری حالت دیدنی تھی۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ ساحی مجھے طمانچہ لگا دیتی بلکہ برچھی سے میرا سارا سینہ چھلنی کر دیتی۔ میرے دل میں ایک نہیں کئی پستول کی گولیاں

اتار دیتی —— مجھے یہ احساس تو ہوتا کہ میں اس کے برابر کی کوئی ہستی ہوں —— لیکن ساحی نے ایسا کچھ بھی تو نہیں کیا —— میرے پندار کو، میری زندگی کو، میری محبت

کو اس نے اپنے قدموں پر جھکایا اور کی تذلیل کی پھر ٹھوکر لگا کر جیسے مجھے کھیلنے کے سے انداز میں تالیاں بجا کر ہنسنے لگی۔

مجھ سے رہا نہ گیا —— کسی اندرونی جذبے نے میرا ہاتھ اٹھوا دیا۔ قریب تھا کہ اس کے گالوں پر میں طمانچہ جڑ دیتی کہ علیم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

علیم کی اس طرف داری نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور میں کانپ کانپ گئی پھر ضبط کے سارے بند توڑ کر آنسو اس طرح میری آنکھوں میں امڈ آئے کہ میں نے بھی ان طلاطموں

میں بہہ جانے ہی کو اپنی عافیت جانا —— میں اتنا روئی کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

ساحی نے مجھے اس طرح بے حال دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔

پھر یکایک اس نے سر میرے سینے پر ٹیک دیا۔

رندھے ہوئے گلے سے وہ کہنے لگی —— روحی میں اس وقت بہت خوش ہوں پگلی۔ اس لیے کہ آج میں اس قابل ہوگئی ہوں کہ تجھے تیری وہ خوشیاں بھی لوٹا دوں

جو میں نے اپنے لیے اٹھا رکھی تھیں لیکن تو نے مجھے بالکل غلط سمجھ لیا ہے۔

کچھ پتہ ہے تجھے ——— میں نے آج تک دوسروں میں صرف خوشیاں ہی تقسیم کی ہیں اور سارے غم اپنے ہی پلو میں باندھ رکھے ہیں
خالد نے ایک دن چنبیلی کی کچی کلیاں میرے دامن میں ڈال کر کہا تھا یہ ذکیہ کو بھجوا دے آنا۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ یہ کلیاں میں کیوں نہیں رکھ سکتی۔
عید کے بھرے گھر میں عرفان نے میرا ہاتھ پکڑ کر بڑے چاؤ سے مجھے گھسیٹا۔ میں ہاتھ چھڑا کر لمبی لمبی سانسیں لیتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ——— دل نے اس مختصر سے حادثے کو کیسے کیسے رنگ دیئے۔ میں نے کیسی کیسی خیالوں کی دنیا آباد کی — اسے بائیں باغ کے کنج میں کسی کا منتظر پایا تو اس طرح چلی گئی جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ وہاں کسی کا منتظر ہے۔ وہ لپک کر مجھ تک پہنچا۔ بڑے چاؤ سے اس نے خود سے کہا ——— "یہ عید کارڈ رابی کو دے آنا ساحی ——— میں تیرے لیے ———"
اور میں عید کارڈ لے کر چلی گئی ——— رابی کے ہاتھ میں جھٹکے سے تھما دیا تو اس نے کہا یہ پانی کے قطرے کہاں سے ٹپکا لائی ——— میں رابی کو کیسے بتاتی کہ وہ پانی کے قطرے نہیں تھے —— میرے آنسو تھے جو عرفان کی لکھی ہوئی تحریر کو دھندلا رہے تھے۔

پھر ——— پھر علیم نے میرے سہارے تم تک پہنچنے میں بہت ہی دیر لگائی۔ اتنی دیر کہ خود میں ان کے سہارے کچھ دور چل پڑی تھی۔
اپنے پلو کی گرہ سے گلاب کی پنکھڑیاں نکال کر اس نے میری بند مٹھی کو کھولا اور نہایت احتیاط سے رکھ کر پھر مٹھی بند کر دی۔
میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت عمیق، بہت گہرا جس کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔
وہ جانے کے لیے پلٹی تو میں نے دیکھا اس کی ناگنوں جیسی بل کھاتی لمبی لمبی زلفوں میں دو بڑے بڑے گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔
میری نظروں میں علیم کی وہ تحریر پھر گئی جو ساحی کے ہاتھوں مجھ تک پہنچی تھی کہ "میں نے تمہارے لیے یہ پھول کسی کونسی ایک شاخ سے جدا کیا تھا کہ اسے تمہاری زلفوں کی لمبی سیاہ رات کا چمکدار ننھا سا ستارہ بنا دوں"
لیکن ان پھولوں کا اس سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے
پھر بھی میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ان دونوں سیاہ ناگنوں کو پکڑ لیا تو اس نے بہت تیزی سے ان پھولوں کو اسے بالوں میں ٹھیک کر لیا جو اس کی دانست میں اس کی گھنی زلفوں کے ایک بال کو چھونے سے بھی گر سکتے تھے ——— اور اس نے خود ناگن کی طرح بل کھا کر تڑپ کر مجھے دیکھا۔
"اتنے پیارے ہیں تجھے یہ پھول؟"
"ہاں ——— انہی پھولوں نے تو مجھے اتنا پاگل بنا دیا تھا ساحی کہ میں تجھے ہنسانے کی بجائے رُلا بیٹھی۔"
میں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں ——— "مجھے نہیں بتائے گی؟"
اس نے قریب قریب اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیئے ——— اور بہت آہستہ سے کہا۔
"وہ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اسی جھاڑی کے پاس میرے منتظر تھے ——— میں قریب پہنچی تو انہوں نے بڑھ کر جب یہ پھول پیش کیے اور نظریں جھکا لیں تو میں نے پوچھا ———
"یہ پھول میں کسے دے آؤں" ——— جلدی سے بتا دیجئے۔
وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر کہا ——— "بتا دیجئے نا کہ آخر یہ پھول میں کسے دے آؤں؟"
انہوں نے کتنی بے بسی سے کہا "کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ یہ پھول تمہاری نذر کر سکوں" ——— اور ان کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسو انہی پھولوں کے سینے میں کہیں چھپ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پھول اُن کے ہاتھ سے لے لیے اور خود ہی انہیں اپنے بالوں میں سجا لیا۔
ساحی اتنا کہہ کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میں نے بھی اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ——— آنسوؤں کا سمندر ساحی کی آنکھوں ہی میں کہیں گم ہو گیا تھا اور اب وہاں سکون اور شانتی کے ملبے سامنے تھے۔

"کون تھا وہ" ——— میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ادب سے نام لے پگلی" ——— اس نے پھر اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیئے۔

"تیرا بھائی جان" ——— میں تڑپ کر رہ گئی —— نہ خوش ہو سکی، نہ ساحی کو گدگدا سکی۔

"تو، تو میری بھابی ———

ہاں ——— ساحی نے بات کاٹ دی اور اپنے بالوں میں سجے ہوئے پھولوں کو سوجن سے چھوتی ہوئی اور ہرنوں کی طرح چھلانگیں لگاتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ———

بھائی جان ——— میرے ہونٹوں تک آ آ کر یہ لفظ جیسے بکھر رہے تھے۔

میری پہلی بھابی کو مرے کوئی چار برس ہوئے تھے، اس وقت بھائی جان کے تین لڑکیاں تھیں۔ ان کی سب سے بڑی لڑکی، ساحی سے دو ایک برس چھوٹی ہو گی ———

میں بھول گئی کہ میری ایک بند مٹھی میں گلاب کی پنکھڑیاں بھی ہیں ——— کچھ پنکھڑیاں گر کر بکھر گئیں تو علیم نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا —— پھر کہنے لگے۔

"کچھ بتاؤ بھی روحی آخر کیا بات ہے"؟

میں نے کہا ——— چلئے آگے چلیں ——— ہم ساحی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

(اقبال)

یونس جاوید

اُس رات کا درد

رات کی مانند زرد روشنیوں کا سینہ دور دور تک بجھ گیا تھا۔ بھیگی ہوئی اس رات کی ہوا مرطوب اور فضا یخ بستہ تھی۔ اور بلاشبہ اس رات کے پچھلے پہر کا درد تھا۔

کہ دور تک سنسان سڑک پر روشنی کھمبوں کی قطاریں زندگی کا احساس ... مزدوروں کی تھیں۔ وہ زندگی جسے ختم کیا جا رہا تھا وہ زندگی جس کی رگوں میں سرطان کے جراثیم ورثہ اور پنے کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ اور ایسی بھی کتنی زندگیاں تھیں جو سرطان کے جراثیم کے بغیر سرطان زدہ کر دی گئی تھیں۔ ان زندگیوں نے سب سرخ و سپید خطوط و آویزے اور چہرے کرب ناک تھے۔ ان جسموں میں دوڑنے والا لہو چند لمحوں میں منجمد کر دیا گیا تھا۔ اور وہ درد جس نے صدیوں سے آج تک اجسام میں پرورش پا کر رشتوں کو توڑا اور ناطوں کو ترتیب دیا تھا —— کسی کٹے ہوئے پروں والے پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

... روح —— بے شمار روحیں!

وہ ابھی تک دیوار کی اوٹ سے نہ نکلا تھا۔ صرف دو گز کے فاصلے سے کانٹوں والی تار کی باڑھ شروع ہو جاتی تھی۔ اور جس جگہ وہ کھڑا تھا اسی جگہ اینٹوں کی پکی دیوار کا سایہ تھا جسے مزدور شام کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کے آس پاس بڑے بڑے پتھر، سیمنٹ کی بوریاں اینٹیں اور اینٹیں جوڑنے کا مسالہ بھاری مقدار میں بکھرا ہوا تھا۔ اور اینٹوں کے بے ترتیب ٹکڑوں کے درمیان وہ دیوار کے سامنے زمین سے چپکا پنجوں پر ... دیر سے کھڑا تھا۔

بیٹھے بیٹھے وہ پنجوں کے بل اس وقت کھڑا ہوا تھا جب باڑھ کی دوسری طرف کے سپاہی مطمئن ہو کر اس سے پچاس گز دور لگے ہوئے کیمپ میں جا گھسے ہوئے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا کانٹوں کی باڑھ کے قریب آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ وہ یہ دیوار —— یہ باڑھ آسانی سے پھلانگ سکتا ہے۔ مگر دیوار پھلانگ جانے کے بعد زندگی کی حفاظت مشکوک تھی۔ وہ زندگی جس کی ضرورت اس سے زیادہ اس کی ماں کو تھی۔

کل رات بھی وہ اسی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کل یہ دیوار دو فرلانگ پیچھے تھی۔ دن بھر میں یہ دو فرلانگ بڑھتی گئی پھر آنے والا دن دیوار کی زندگی تھا۔

پھر آنے والا دن دونوں کی موت تھا۔

ایک دن یہ دیوار اتنی دور تک پھیل جائے گی —— وہ سوچنے لگا —— کہ میں جو کانٹوں کی باڑھ سے جھانک کر دوسری سمت اپنے

گھر کے اُداس دریچے دیکھ لیا کرتا ہوں —— نہیں دیکھ سکوں گا۔ اور میرے گھر کے نیچے روشن دان ہر روز دیوار کے بڑھ جانے سے دور ہوتے جائیں گے۔

گھر کی تمام بتیاں روشن کر کے بھی میری ماں مجھے اپنا گھر نہ دکھا سکے گی۔ اور تمام روشندانوں میں روشنی بھر کے بھی وہ مجھے اپنے انتظار کی شدت کا احساس نہ دلا سکے گی —— یہ نیلے روشندان اور ان کے پیچھے جگمگاتی جاگتی روشنیاں مجھ سے اتنی دور کی جا رہی ہیں، کہ نظر دھندلا جائے گی۔

روشنی کو اندھیرا جذب کرے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے، کہ مجھے تیسری [illegible] دیوار کے پاس آنے کا موقع ہی نہ ملے ——"

اس کے کان سردی سے نیلے ہو رہے تھے۔ جسم سرد [illegible] تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو جاگ رہی تھیں۔ ذہن تھا جو اُبل رہا تھا۔ اس نے ہولے سے ٹٹول کر چیسٹر کی جیب سے برانڈی کی بوتل نکالی ایک گھونٹ بھرا۔ اور اپنے آپ میں حرارت اور جولانی محسوس کرنے لگا۔

اور پھر احساس کے جنگلوں میں اس کی گہری سوچ کا دیا بھی روشن تھا۔

برانڈی کی بوتل کو جیب میں اُڑسنے کے بعد وہ پھر دیوار کے پاس رینگ آیا۔ مشرقی برلن کے کچھ سپاہی ٹھٹھرتے ہوئے کیمپوں کی طرف جا رہے تھے۔

کل بھی وہ اسی وقت گشت سے لوٹے تھے۔ اسے یاد تھا۔

سپاہی گزر گئے۔ تو اُسے ماریانہ سے کیا ہوا یہ عہد [illegible] یاد آیا۔ کہ وہ آج رات ضرور مشرقی برلن چلا جائے گا۔ اور اگر آج نہ جا سکا تو پھر کبھی جانے کی کوشش نہ کرے گا۔ یہ اس نے آج دوپہر سے پہلے فیصلہ کر لیا تھا۔ ماریانہ کو فلیٹ پر تنہا چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا تھا۔ اس وقت اس پر وحشت سوار تھی۔ اور شاید اس وحشت۔ اس اضطراب کا پس منظر۔ اس کا فیصلہ تھا۔ آخر اس کی ماں اس کی شادی میں شریک نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ماں جس نے ماریانہ جیسی باوقار لڑکی اس کے لئے تلاش کی تھی۔ جس نے سدا دکھوں میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ نہ صرف دکھوں میں بلکہ سکھ میں بھی وہ اس کی بہترین رفیق تھی۔ کہ اُسے باپ کی کمی محسوس نہ ہو سکی تھی ——

بس وہ اسی ماں کے وجود کو مغربی برلن ماریانہ کے فلیٹ میں لانا چاہتا تھا۔ اس وقت دن کا ایک بجنے والا تھا۔ وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پاگلوں کی طرح بازاروں میں چکر لگانے لگا۔

گوئٹے کے مجسمے سے چند گز دور کھڑے ہو کر اس نے بڑی بے بسی سے اُسے دیکھا۔ اس نے یہ بات بھی بڑی شدت سے محسوس کی۔ کہ بیس فٹ اونچے چبوترے پر یہ پتھر کا مجسمہ نہیں۔ بلکہ یہ عظیم شاعر، ایک زندہ غم ہے۔ اور گہری سنجیدگی اور متانت سے اپنے جرمنی، اپنے برلن کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم ہوتے دیکھ رہا ہے۔ اس کے نزدیک اس سارے اتار چڑھاؤ کی اہمیت ایک ایسے ڈرامے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی —— جس کا انجام تماشائی پہلے سے جانتا ہو۔ پھر اس نے محسوس کیا۔ کہ عظیم گوئٹے چبوترے سے نیچے اتر کر اسے کچھ کہنے لگا ہے۔ اگر اس کے محسوسات غلط تھے۔ گوئٹے کا مجسمہ جوں کا توں کھڑا تھا۔ وہ ۱۸۸۲ء سے اسی طرح کھڑا تھا۔ اور جب تک آخری عالمگیر جنگ [illegible] پھر تک اسی طرح کھڑا رہے گا۔ اس نے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ہلکی سنہری دھوپ [illegible] دھندلا [illegible] نئی سرحد کے اس پار —— اس پار بہت سے فوجی آ جا رہے تھے۔ اور بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک [illegible] تھے۔

اُس نے اپنے قریب [illegible] بیٹھا انسان نظر آئے [illegible] کہانی [illegible]

مگر ان سب کے کھڑے ہونے کا انداز کچھ عجیب تھا۔ جیسے عالمی جنگ چھڑنے میں انہیں کے اشارے کی ضرورت ہو۔ سب فوجیوں کے چہرے جذبات سے عاری تھے۔

جنگ ان کی زندگی تھی۔!

جنگ ان کی موت تھی۔!

انہیں اس بات سے ذرہ بھر ہمدردی نہیں تھی۔ کہ ولہلم مشرقی برلن سے ایک حادثے کے ساتھ مغربی برلن جا پہنچا ہے۔ یا اس کی منگیتر مغربی برلن میں ہے۔ اور ماں مشرقی برلن میں۔

انہیں ان باتوں کی پروا تھی —— نہ ہونی چاہیئے تھی۔

ولہلم نے دکھ بھری آہ بھری! اگر اس کی ماں ضدی نہ ہوتی۔ تو وہ سب لوگ کب کے ماریانہ کے فلیٹ میں منتقل ہو چکے ہوتے مگر جانے کیوں اس کی ماں مرتے دم تک اپنا آبائی مکان چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے پاس تو بس ایک دلیل کافی تھی کہ ماریانہ کے فلیٹ اور ان کے مکان میں فاصلہ ہی کتنا ہے جو وہ اپنا مکان چھوڑ دیں —— یہ فاصلہ —— چند گزوں کا فاصلہ اب مشرق و مغرب کے فاصلے میں بدل چکا تھا۔ ولہلم بارہ اگست کو ماریانہ سے ملنے آیا اور یہیں رہ گیا دوسرے دن وہ لوٹنا ماں کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

اس کی آدھی کائنات اس سے چھین لی گئی تھی۔ اس کے دردناک دوستوں کے خطوط اس کی الماریوں میں مقفل وہیں رہ گئے تھے۔ اس کی بے شمار وہ کتابیں وہیں تھیں جنہیں اس نے بڑے احترام سے پڑھا تھا۔ اس کی پینٹ کی ہوئی سینریاں جنہیں اس نے دن رات کی محنت سے بنایا تھا۔ پھر اس سے مرکر بچھڑ جانے والے بہن بھائیوں کی تصاویر —— وہ سب کچھ چھوڑ سکتا تھا —— مگر اس کی ماں —— وہ ماں کو وہاں نہیں چھوڑ سکتا —— نہیں چھوڑ سکتا —— !

یہ بات اس نے تیرہ اگست ہی کو طے کر لی تھی۔ کہ وہ اپنی ماں کے بغیر کسی صورت بھی یہاں نہیں رہے گا۔ اور پھر ماریانہ اگست کو ان کی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے پہلے وہ اپنی ماں کو یہاں لانا چاہتا تھا۔ سرحد پار کر کے ماں کا مغربی برلن لے آنے کا حوصلہ سچی بات ہے۔ اس نے آٹھ سالہ جرمی سے لیا تھا جو اسے سولہ اگست کی شام کو سرحد کے پاس ملا تھا۔ اس شام ولہلم برینڈن برگ گیٹ سے ڈیڑھ میل سرحد کے ساتھ ساتھ اوپر چلا گیا تھا۔

پہلی بار نادانستہ طور پر جب ولہلم کی نظر جرمی پر پڑی تو اس نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا۔ مگر دوبارہ جانے کیوں دانستہ طور پر اس نے جرمی پر نگاہ ڈالی۔ اور فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ تقریباً گھنٹے بھر سے یہاں کھڑا ہے۔ جرمی جس جگہ کھڑا تھا۔ اس کے سامنے تاروں کی اونچی باڑھ تھی۔ اور پاؤں میں دو فٹ گہرا گڑھا تھا۔ جس میں کھڑے ہو کر وہ ہر ایک کو آسانی سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ ولہلم کے لبوں پر غیر ارادی طور پر وہ مسکراہٹ لوٹ آئی۔ جو اسے آٹھ روز پہلے ماریانہ کی ایک شرارت پر نصیب ہوئی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے یہ سب سرحدی جھگڑے بھول گیا۔ اور شاید اسی لمحے اسے سرحد کے قریب پہنچ کر بیٹھنے اور پھلانگ جانے کا حوصلہ، احساس اور شعور بھی نصیب ہوا تھا۔!

لاشعوری طور پر اس کے قدم گڑھے میں اتر گئے جس میں جرمی کھڑا تھا۔

ولہلم کے بھاری بھرکم جوتوں کی آواز اور لمبے نیلے چہرے کو دیکھ کر جرمی نے سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹایا اور تیز تیز پلکیں جھپک کر ولہلم سے کہا۔ "میں اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔ جناب ——"

ولیم نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا "تمہارا نام ؟"

"جی جونی جناب" بچے نے معصومیت سے کہا۔

"تمہارا دوست نہیں آیا ــــ ؟" ولیم نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں جناب ــــ" جونی اداس لہجہ میں بولا۔ "دراصل جناب اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں بُری طرح کچلی گئی ہیں ــــ وہ بڑی مشکل سے ــــ وہ چل ہی نہیں سکتا جناب ــــ" "پچھلی ٹانگیں ــــ" ولیم نے بات کاٹی۔

"ہاں جناب ــــ وہ ایک فوجی جیپ کے نیچے آ گیا تھا۔ اس کا نام جونز ہے جی ــــ اور اس کی گردن پہ سفید لمبے بال ہیں ــــ" جونی نے ایک پل رک کر جیب سے جام لگے بسکٹ نکالے اور بسکٹ ولیم کے سامنے پھیلا کر بولا "میں اس کے لئے کھانا لایا ہوں جی ــــ کل صرف اس نے دو بسکٹ بڑی مشکل سے کھائے تھے۔ کل میرے پاس چائے نہیں تھی ــــ یہ دیکھئے" اس نے تھرموس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں آج اس کے لئے چائے بھی لایا ہوں۔ بسکٹ بھی میری جیب میں ہیں۔ وہ بہت کمزور ہو چکا ہے جناب ــــ بات یہ ہے میں ضرور اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتا۔ مگر جناب اس کاٹنے والی تار [illegible] میں الجھ کر اس کا زخم چھل گیا تھا۔ اور وہ رو پڑا تھا۔ اس لئے میں مجبوراً اسے چھوڑ آیا تھا ــــ لیکن جانے وہ آج کیوں نہیں آیا۔ میں اس کا دیر سے انتظار کر رہا ہوں اور میری ممی دیر سے میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اور فکرمند رہی ہوں گی ــــ اور میں خود بہت فکرمند ہوں جناب۔ کہیں وہ پھر کسی جیپ کے نیچے نہ آ گیا ہو۔ یہ فوجی جیپ بہت لاپرواہی سے چلاتے ہیں ــــ" جونی کچھ کھسیانہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے یوں نگاہیں جھکا لیں جیسے اسے سزا ملنے والی ہو۔ ایک لمحہ تک وہ یونہی کھڑا رہا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ نگاہیں اوپر اٹھا کر کہا ــــ "آپ فوجی تو نہیں ہیں جناب ؟"

ولیم نے مسکراہٹ کو نمایاں کرتے ہوئے جونی کا ڈر دور کر دیا۔ اور بولا۔ "تم یہ چائے واپس لے جاؤ۔ اور کھانا مجھے دے جاؤ۔ میں دیر تک اسے تلاش کروں گا۔"

جونی نے تقریباً چہک کر کہا "آپ بڑے اچھے ہیں جناب۔ اور جونز بھی بڑا اچھا ساتھی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے ــــ خدا کرے وہ ٹھیک ہو۔ دیکھئے اس کے گلے میں سیاہ رنگ کا پٹہ ہے۔ نرم کٹی ہوئی دُم ہے۔ اور گردن پر لمبے لمبے سفید بال ہیں۔ آپ اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگیں اسے پہچاننے میں آپ کو مدد دیں گی۔" جونی ایک پل رک کر کچھ سوچتا رہا۔ اس ایک پل میں وہ بہت مضطرب دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ماتھے پہ آئے ہوئے بالوں کو دو تین بار ایک طرف جھٹکا دے کر کہا ــــ "شاید وہ آپ کے ہاتھ سے بسکٹ نہ کھائے۔ مگر جناب جب آپ اسے تین بار بغیر رکے جونز جونز جونز کہہ کر پکاریں گے تو وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آپ کے قریب آ جائے گا۔ آپ بسکٹ کھلاتے ہوئے اس کے سر پر ضرور ہاتھ پھیریئے گا۔ میں اکثر ایسا ہی کرتا ہوں ــــ اور جناب ــــ" جونی نے سرگوشی کے سے انداز میں [illegible] سے کہا ــــ "اگر وہ آپ کو کسی ایسی جگہ ملے، جہاں سے وہ تاروں میں سے اس طرف آ سکتا ہو۔ تو جناب آپ اسے اٹھا لیں ــــ پھر تو میں آپ کا بہت گہرا دوست بن جاؤں گا۔ میں اس کا علاج کروانا چاہتا ہوں نا ــــ جونز میرے چھوٹے بھائی کا بھی دوست ہے۔ چھوٹا بھائی رات کو اٹھ کر بہت روتا ہے۔ اور جونز کو یاد کرتا ہے۔ اور بہت ضد کرتا ہے۔ ہیں جناب ــــ"

جونی ــــ ننھا جونی جذبات میں آ کر ولیم کا چہرہ جھنجھوڑنے لگا ــــ شاید وہ ایک لمحے میں جوان ہو جانا چاہتا تھا۔ یا ایک لمحے میں اپنے جونز کو پا لینا چاہتا تھا ــــ یا شاید شرقی اور مغربی حصوں کو تقسیم کرنے والی ان تاروں کو ہٹا دینا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ولیم [illegible]

کو پاکر رو دینا چاہتا ہے۔ مگر وہ رویا نہیں۔ بلکہ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ چمکنے لگیں۔ اور پھر جوجی نے اپنے باریک سنہری بالوں کو اپنی انگلی کے گرد پیٹتے ہوئے ولہیلم کی طرف بڑے ہی پیار سے دیکھا۔ ولہیلم مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

بلاشبہ یہ مسکراہٹ دنوں بعد اس کے ہونٹوں تک آسکی تھی۔ لیکن وہ اس بچے کے لئے مسکرانا چاہتا تھا۔ اس کی خوشی کے لئے اس کے چھوٹے بھائی کی خاطر کے لئے —— اور اس لئے کہ اس بچے کا درد اس کے درد سے کسی نہ کسی طرح مشترک ضرور تھا۔ یہ درد کیا تھا۔ یہ دکھ کیا تھا۔ جو سکون بھی دے رہا تھا۔ اور ننھے جوجی کی باتوں سے اس کے اندر لاوا بھی بھڑکا رہا تھا —— وہ نہ جان سکا۔

ولہیلم نے چپ چاپ جوجی سے بسکٹ لے کر پتلون کی جیبوں میں رکھ لئے۔ دونوں خاموشی سے مشرقی برلن میں بھاگنے دوڑنے والی موٹروں اور آنے جانے والے فوجیوں کو دیکھتے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد جوجی نے چونک کر گردن گھمائی۔ اور تشکر آمیز نگاہوں کو ولہیلم کے چہرے تک لے جاکر کہا۔ "شکریہ جناب میں کل پھر آپ کا شکریہ ادا کرنے اور اپنے جوزف کو دیکھنے آؤں گا۔"

ولہیلم چپ چاپ تاروں کی دوسری سمت تکنے لگا تو جوجی کا سارا تشکر، حیرت اور دکھ میں بدل گیا۔ اس نے ولہیلم کے کوٹ کو ایک بار پھر کھینچ کر کہا۔ "جناب آپ اس طرف کیا دیکھ رہے ہیں۔؟

"ہوں —— ولہیلم نے پلٹ کر کہا —— اس طرف ہمارا مکان ہے۔ اس طرف میرا اندھا چچا رہتا ہے۔ اس طرف میری ماں رہتی ہے۔ اس طرف میں رہتا ہوں ——

"آپ اس طرف رہتے ہیں —— جوجی اور بھی حیران ہوا —— مگر آپ تو اس طرف کھڑے ہیں ——"

"ہاں —— میرا جسم اس طرف ہے، اور روح اس طرف —— روح جسم کے بغیر —— اور جسم روح کے بغیر نامکمل ہے ——"

ننھا جوجی کچھ نہ سمجھا —— وہ کچھ دیر حیران چپ چاپ ولہیلم کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ آپ ان تاروں والی دیوار کو پسند نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے۔ میں اب سمجھا ہوں۔ میرے پاپا بھی اس دیوار کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ بلکہ میرا جی بھی چاہتا ہے۔ کہ میں اس دیوار کو توڑ پھوڑ دوں —— اگر میں بڑا ہوتا تو ضرور ایسا کرتا۔ یا پھر میں خدا سے دعا مانگتا ہوں۔ کہ مجھے اتنا بڑا بنا دے۔ کہ میں اس طرف کے شہر کو اٹھا کر یہاں لے آؤں۔" ولہیلم اس بار کھل کر ہنس پڑا اور بولا۔ "تم اب گھر جاؤ۔ سردی بڑھ رہی ہے۔"

جوجی چلا گیا۔ تو ولہیلم کتنی دیر اسی جگہ کھڑا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کی باتوں میں کتنی مٹھاس، بھولپن اور محبت تھی۔ دوستی اور مروت تھی۔ زندگی اور شعور تھا۔ انسانیت اور خلوص تھا —— یہ بچہ کل کیا ہوگا۔ وہ دیر تک جوجی کے مستقبل پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے جوزف کی تلاش شروع کی۔ وہ سرحد کے ساتھ ساتھ ایک میل تک گھوما۔ مگر جوزف اسے نظر نہ آیا

مایوس ہوکر وہ ماریانہ کے پاس لوٹ آیا۔

ماریانہ اسی وقت کہیں سے لوٹی ہی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ دونوں جب چائے پینے لگے تو ماریانہ نے کہا۔

"شونبرگ ہال کے سامنے جو مظاہرہ ہوا ہے —— تم اس میں نہیں تھے! ——"

"نہیں تو —— وہ حیران ہوکر بولا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مظاہرہ آج ہے۔"

"مظاہرین کی تعداد پانچ لاکھ تھی۔ ماریانہ پھر بولی۔ ڈاکٹر برانٹ نے کہا ہے ہم سب ایک ہیں۔"

"ہونہہ —— وہ طنز سے ہنسا۔ "ہم سب ایک ہیں۔"

دونوں چائے کے آخری گھونٹ تک خاموش رہے۔ پھر ماریانہ نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھو تم اگر اپنے مکان تک پہنچ بھی جاتے ہو۔ اور وہاں جا کر تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ ماں تو اب بھی اپنے آبائی مکان کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ پھر؟ — تمہارا کیا ہوگا۔ تم کیسے واپس آسکو گے؟"

"یہ مسئلہ تو بعد کا ہے — ماں کو مکان چھوڑنے پر میں مناؤں گا۔ غصے سے۔ عاجزی انکساری سے — میں اسے مناؤں گا۔ آخر وہ میری ماں ہے — میں اسے سمجھاؤں گا۔ انسان کا کوئی گھر نہیں ہے۔ وہ جنگلوں اور غاروں میں رہا ہے۔ اس نے پہاڑوں کی کوکھ اور گہری گھاٹیوں میں پناہ لی ہے۔

بانس کی جھونپڑیاں اس کی پناہ گاہیں رہی ہیں۔ پھر وہ تنکوں کے چھپروں تلے پروان چڑھا ہے۔ کچے مکان میں اس نے سانس لیا ہے۔ لکڑی کے گھروندے اس کا مسکن رہے ہیں۔ پکے مکان تو بیاں محل — اور اب شاید وہ چاند نگر بسانے کی سوچ رہا ہے — اس کا آبائی مکان تو ایک پڑاؤ تھا — میں اپنی ماں کو سمجھا لوں گا — مگر سوال تو اس دیوار کو پھلانگ کر ایک بار گھر تک چلے جانے کا ہے —" وہ کچھ دیر ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھے چپ بیٹھا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"مشرقی برلن سے ماسکو تک ایک طاقت ہے۔ اور مغربی برلن سے واشنگٹن — بلکہ ٹیکساس تک جو بھی طاقت ہے۔ وہ پہلی طاقت کی ضد ہے۔ مگر ہمارے لئے ان میں سے کوئی طاقت بھی سودمند نہیں۔ کوئی بھی انسان کی خیر خواہ نہیں — وہ ایک لمحہ رک کر بولا — بظاہر یہ دو طاقتیں ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر ان کا انجام ایک ہے — ڈاکٹر لیوبکے کی تقریر میں نے تو نہیں سنی۔ مگر اس کے یہ الفاظ مجھ تک پہنچے ہیں — کہ برلن کے مسئلے سے تمام جرمنوں کی آزادی وابستہ ہے۔ ہم ایک ہیں۔ اور ایک رہیں گے۔ — کچھ اس وقت مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں — ٹھیک ہے ہم سب ایک ہیں۔ مگر ایک رہیں گے کیسے؟ جب ماں بیٹے سے الگ ہے۔ اور زخمی بونز اپنے دوست سے — جب جوزی کے بے شمار دوست اس سے بچھڑ گئے ہیں۔ پھر یہ ایک ہونے کا نعرہ ڈھونگ ہی تو ہے۔ اب میں اس کو کسی؟ مثال کے طور پر یہاں لے بھی آتا ہوں۔ تو میرے اس اندھے چچا کا کیا بنے گا۔ جو سرحد کے بالکل ساتھ والی جین سلاٹرنگ کی تیسری منزل کے فلیٹ میں رہ رہا ہے۔ اس کے فلیٹ کی ساری کھڑکیاں مغربی برلن میں کھلتی ہیں۔ مگر وہ اندھا ہونے کے سبب مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ماں کو بلوا سکتا ہے۔ نہ خود آسکتا ہے۔ اس کے لئے تو مشرقی اور مغربی برلن کا سوال اسی دن پیدا ہوگا۔ جس دن ماں بھی ادھر آجائے گی۔ اور وہ مشرقی برلن سے ماسکو تک تنہا رہ جائے گا۔ اسی دن اسے اپنے فلیٹ کی دیواریں ڈسیں گی۔ جن سے وہ ستر سال سے مانوس رہے۔ پھر ہم ایک کیسے ہیں —؟ ڈاکٹر لیوبکے نے پانچ لاکھ مظاہرین کو ٹالنے کی خاطر یہ سب کچھ کہا ہے — اور پھر میئر ولی برانڈٹ نے بھی صبر و تحمل کی تلقین کی تھی۔ ولی برانڈٹ اور لیوبکے اپنی اپنی ماں سے جدا ہیں؟ کیا ان کے دوست بھی ان سے بچھڑ گئے ہیں؟ کیا وہ میری طرح اپنی کسی ماریانہ کے لئے اپنا آبائی مکان چھوڑ سکتے ہیں؟ کیا یہ دیواریں کھڑی کرنے والے بھی انسانی دل رکھتے ہیں —؟ کیا ان تاروں کی باڑھ کو پتھریلی دیوار میں بدل دینے سے جرمن قوم دو حصوں میں بٹ سکے گی؟ یہ سب سوالات میرے ذہن میں اس تقریر کے ساتھ ہی چپک آئے تھے۔ جو میں نے اپنے ایک دوست سے سنی ہے۔"

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت ان باتوں کو دہرانے کی بجائے تمہیں آرام کرنا چاہیئے اور کل مشرقی برلن جانے کے لئے عملی طور پر کچھ کرنا چاہیئے —" ماریانہ دیر بعد بولی۔

"ہاں — ٹھیک ہے۔" وہ چپ ہو کر لیٹ گیا۔ اس وقت یوں بھی اس کا ذہن پریشان تھا۔

دوسرے دن وہ پھر سرحد کے ساتھ دور تک اوپر چلا گیا۔ اسے وقفے وقفے سے فوجی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک ملتے رہے۔ امن تو گم

کے لئے دنیا کی دو بڑی طاقتیں جنگ کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ چلتے چلتے اس کے ذہن میں ایک جملہ اُبھرا دنیا کے سکون کو لوٹ لینے کی آخری کوشش۔ ایک جنگ ہوگی تو دوسری خود بخود ختم ہو جائے گی۔ جو ختم ہوگی وہ سرد جنگ ہے ـــ اور دوسری جنگ دنیا کی عظیم الشان جنگ ہے ـــ پھر یہ قومیں رہیں گی نہ ملک۔ یہ سرحد رہے گی نہ جوی کا زخمی جوزا اور میری ماں! درا ندھا چچا تو دھماکوں سے ہی مر جائیں گے اور جنگ ہوتی رہے گی۔ اور اس کے بعد ہر وہ شئے ختم ہو جائے گی جس میں زندگی ہے۔ زندگی کے آثار ہیں ـــ صرف ایک سلے نیچے ـــ گی اور وہ ہوگا ـــ امن ـــ!

مگر امن کا وجود تو جنگ کے بعد پیدا ہوگا۔ یا امن ہر ترقی یافتہ ملک اور ہر ترقی یافتہ قوم کی تباہی کے بعد پیدا ہو سکتا ہے۔ پسماندہ قومیں اور ملک تو ہمیشہ ہی بچ جایا کرتے ہیں۔ اور اب بھی بچ جائیں گی۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی ترقی کریں۔ اور پھر امن کو وجود میں لانے کے لئے جنگ!"

ولیم اپنی سوچ سے اس طرح چونک گیا جیسے اس نے سوئیل لمبی اس دیوار کو گرتے دیکھ لیا ہو۔ وہ چلتے چلتے رک کھڑا گیا۔ پھر اس نے اپنی چال میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور سنبھل کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ سامنے کی ادھوری دیوار کے آس پاس بکھرے ہوئے پتھروں میں ایک کتا سو رہا تھا۔ اس کی گردن پر سفید بال تھے۔ اس کے گلے میں سیاہ پٹہ تھا۔ اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں زخمی تھیں ـــ وہ جوزہ تھا۔ جوزہ پچھلی رات کی سردی میں مر چکا تھا۔ صرف اس کا جسم تھا برف کی طرح ٹھنڈا۔

ولیم ایک بار پھر اگلی پچھلی تمام باتیں بھول گیا۔ اس نے جوزے کے مردہ جسم کو اٹھایا۔ اور دور تک لے گیا۔ وہ اسے جوی کی ہوشیار نگاہوں سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ اس معصوم بچے کی زندگی کی ایک اہم خواہش کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں اگر جنگ ایک نسل تک ٹل گئی، تو یہ بچہ کل کی ایک اہم شخصیت تھا۔ قوم کا سرمایہ۔ اس کی تقدیر۔ تقدیر کا مستقبل۔ مستقبل کی روشنی۔ آئندہ کی ذہین، جنگ سے نفرت کرنے والی نسل ـــ جس کی نمائندگی جوی نے کی تھی۔

ولیم نے جوزہ کی لاش کو ایک دور کے گڑھے میں چھپا دیا۔ اسے یقین تھا کہ جوی کے قدم یہاں تک نہ آ سکیں گے۔ لیکن مطمئن ہونے کی بجائے لوٹتے ہوئے اسے احساسِ ندامت ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔

اریانہ سے آخری بار ملنے کے بعد وہ آج دوپہر کے فوراً بعد ہی اس ارادے سے نکل آیا تھا کہ وہ بہرطور آج ضرور مشرقی برلن چلا جائے گا۔ وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ شونیبے برگ ہال کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ ایک کونے میں رکھے بنچ پر بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا۔ کہ اسے سامنے سے جوی آتا دکھائی دیا۔

اس کے کندھے پر تھرموس لٹکی تھی۔

جوی ـــ؟ اس نے پکارا

جوی جواب دینے کی بجائے بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ اس نے جوی کے گال تھپتھپائے اور تھرموس اس کے کندھے سے اتار کر کہا ـــ"

تو پھر آج اتنی ساری چیزیں لے آئے ہو ـــ جوی نے شاید پہلی بار اس کی بات کاٹی اور کہا "میں کل بھی آیا تھا جناب ـــ"

تم زیادہ جناب نہ کہا کرو ـــ ولیم بولا ـــ میں بڑا آدمی ہوں ـــ نہ بڑی عمر والا ـ تم مجھے انکل ولیم کہہ سکتے ہو۔ اچھا!"

جوی خاموش رہا۔

ولیم پھر بولا "تمہارا جوزہ ڈوگ ہوسپٹل میں زیرِ علاج ہے۔ تم فکر مت کرو۔ صحت یاب ہونے پر میں اسے تمہارے گھر لاؤں گا

اسے بلاشک اس کی تلاش کے لئے باہر نہ آیا کرو"

جوآخم کی پیشانی پر تیوریاں دیکھ کر ولہیلم اس کے ذہن میں ابھرنے والے سوال کو سمجھ گیا ۔۔۔ وہ فوراً کھانس کر بولا "جانے ڈرگ ہوسپٹل میں بچوں کا داخلہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ خیر میں اسے خود دیکھ آیا کروں گا ۔۔۔"

جوآخم جاتے ہوئے خوش تھا۔ جاتے جاتے اس نے کہا ۔۔۔ "ہمارا مکان تو بہتر ہی ایک ڈرگ روڈ پر ہے۔"

ولہیلم نے الوداع کے طور پر ہاتھ ہلایا۔ کہ جوآخم کو فوراً جانا پڑا۔ جوآخم چلا گیا تو ولہیلم کچھ اور بھی اداس ہو گیا۔ جو بز کے متعلق جھوٹ بولتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی ۔۔۔ اس بیچارگی اداسی کو رفع کرنے کے لئے یکبارگی وہ ہنس پڑا۔ اور پھر کافی دیر گہری رات کا انتظار کرنے کے بعد سنگین سناٹوں کا لبادہ اوڑھے وہ سرحد کی پتھریلی دیوار کے سائے میں سورج کے روشن چراغوں کو تھامے کب سے جاگ رہا تھا۔ اتنا عرصہ سناٹے اور سردی میں دفن رہنے کے بعد اس کا جسم منجمد سا ہو گیا تھا۔ پتھروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان اکڑوں بیٹھے یوں بھی اس کے اعصاب اکڑ چکے تھے۔ اس کا دل اس وقت بے حد گداز ہو گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر یوں بھی دل موم ہو جاتے ہیں۔ اس نے آنے والے دن کی قسم کھا کر دل کو یقین دلایا۔ کہ وہ زندہ رہے گا ۔۔۔ مگر رات کی ان گھڑیوں میں درد پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے گداز اور سہمے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے پتھروں سے نکلا۔ اور دیوار پر آ چڑھا۔ اور ایک منٹ تک دیوار پر کھڑا رہا۔ اور سمجھنے لگا کہ اس کے یہاں کھڑے رہنے سے مشرق و مغرب کی تفاوت مٹ گئی ہے۔ برلن کے دونوں حصے مل گئے ہیں۔ ماں اور ماریانہ کے درمیان ایک کڑی بن گئی ہے ۔۔۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ امن چاہتا ہے۔ سکھ چاہتا ہے۔ ملاپ چاہتا ہے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اپنے لئے نہیں ۔۔۔ دوسروں کے لئے۔ اپنوں کے لئے۔ آئندہ نسل کے لئے بنی نوع انسان کے لئے ۔۔۔ عزت، آبرو، آن، ایمان ۔۔۔ سب چیزیں زندگی کے بعد کی ہیں۔ مجھے زندگی دو۔ بڑھیا کو بیٹا دو۔ ماریانہ کو ولہیلم دو۔ جوآخم کو اس کا دوست دو ۔۔۔ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ یہی آدمیت کا نشان ہے۔ یہی انسان کی اعلیٰ ترقی ہے۔ یہی فاتح کی پہچان ہے۔ ۔۔۔ اگر تم یہ کر سکو ۔۔۔

تو میں ۔۔۔ ہر انسان یہ سمجھے گا۔ کہ تم نے دلوں کو فتح کرنے والا بم بنا لیا ہے ۔۔۔"

ولہیلم دیوار پھاند گیا ۔

دوسری صبح مشرقی اور مغربی برلن کے اخباروں میں دو الگ الگ خبریں چھپیں ۔

مشرقی برلن کے اخبار میں لکھا تھا ۔

رات کے اندھیرے میں مغربی برلن کا ایک جاسوس گرفتار! ملزم کے قبضے سے اسلحہ و دستاویزات برآمد ہوئیں ۔

مغربی برلن کے اخبار میں یہ خبر چھپی !

ایک بڑھیا نے اپنے اندھے دیور کے فلیٹ کی کھڑکی سے مغربی برلن میں چھلانگ لگا کر آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں اہم بیان ادا کیا ہے ۔

ماریانہ نے دونوں خبریں پڑھیں۔ اس کے لبوں سے دکھ بھری آہ نکلی۔ اس نے میز پر رکھے ننھے کیلنڈر کو ہاتھ میں اٹھایا۔ اور اس پر اس کی انگلیاں ۱۳۔ اگست کی تاریخ کو مٹانے لگیں ۔

سلیم اختر

سویٹ ہارٹ

وہ یکایک ہی سامنے آئی۔ میری کار کی ہیڈ لائٹیں پڑتے ہی دوسری کار والوں نے اپنی لائٹیں آن کر دیں۔ ایک لمحے کے لئے تو میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں اور ہاتھ جیسے سٹیرنگ پر سے ہٹ گیا۔ لیکن دوسری کار کے ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے موڑ کاٹا۔ اور جب میں نے مڑ کے پیچھے دیکھا تو ایک ثانیہ کو کار کی پچھلی سرخ بتی ایک جھلک دکھا کر گم ہو گئی جیسے اندھیرے میں سگریٹ کا آخری کش!

میں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا!

جلتے سگریٹ کو باہر پھینک کر میں نے کار کی رفتار کم کر دی۔ دراصل مجھے آج کل کچھ زیادہ ہی سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی اور سوچتے وقت انجانے میں کار کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ نہ سوچوں لیکن ذہن جیسے ایک بے بس ناؤ کی مانند پریشان خیالات کے بھنور میں گھرا ہوا ہے۔ کچھ عجیب سی حالت ہو گئی ہے۔ سگریٹ پیتا ہوں تو اس کا نیلگوں دھواں جیسے چند خطوط کی صورت اختیار کر کے ایک جانے پہچانے چہرے کے نقوش کی یاد دلاتا۔ چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ کسی کی گرم سانسوں کی یاد دلاتی، اور سوچ ـــــ کم بخت سوچ گھڑی بھر کو تو سب کچھ بھلا دیتی لیکن اس کے بعد پھر وہی خیالات ـــــ اور وہی چہرہ ـــــ جسے میں اب بھلانا چاہتا ہوں

سامنے کلب کی عمارت تھی۔ یوکلپٹس کے درختوں میں گھرا ہوا کلب آج رنگین بلبوں اور نیون سائنز سے جگمگا رہا تھا۔ میری کرسمس کے روشن حروف کسی طرحدار حسینہ کی مسکراہٹ لئے نظر نواز تھے۔ دروازہ پورا کھلا تھا۔ کھڑکیوں کے رنگین پردے اور آرکسٹرا کی دھن واقعی دل کو کھینچ رہی تھی۔

میں جب کار کی چابی احتیاط سے جیب میں رکھ کر باہر نکلا تو سرد ہوا نے گویا گالوں پر طمانچہ مارا۔ مگر یہ طمانچہ برا نہ لگا۔ دراصل میرا سارا جسم جیسے ایک آگ میں جل رہا تھا مجھے خود سے شعلے سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسے میں ٹھنڈی ہوا نے گویا میرے جلتے گالوں اور تپتی پیشانی پر کسی نرس کی طرح اپنا شفیق ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں نے چاہا کہ ٹائی اتار کر قمیص کا گریبان کھول دوں اور سرد ہوا سے بھی اپنے سینے کو ذرا سہلا لوں لیکن ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے دو تین لمبے لمبے سانس لے کر پھیپھڑوں سے سگریٹ کے دھوئیں کی کثافت کو دور کرنے کی کوشش کی۔

پہلے میں اس کلب میں بڑے شوق سے جایا کرتا تھا اب وہاں جانے کو دل نہ مان رہا تھا مگر جاؤں تو جاؤں کہاں کیوں کہ یہ کلب ہی میری ہمدرد اور غمخوار رہی تھی جب میں بہت خوش ہوتا تو خوشی کا جشن منانے یہاں بھاگا آتا اور جب میں اداس، افسردہ اور ملول ہوتا تو غم غلط کرنے یہاں آجاتا ـــــ اور آج تو میں واقعی اداس تھا۔

نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے گیٹ کراس ہی کیا تھا کہ سامنے سے دلدار آتا دکھائی دیا۔ حسب معمول اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی اور اصول کے مطابق کوئی نیا ہی چہرہ تھا۔ وہ میرے گلے سے لپٹ گیا۔

"ظالم! تم کہاں رہے اتنے عرصہ تک؟"

"وہی بزنس کا چکر!"

"لعنت ہو تمہارے بزنس پر۔"

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ جلدی سے بولا۔ "ان سے ملو، لوسی! یہ وہ میرا نامعقول دوست ہے جس کا میں نے بارہا ذکر کیا

تھا ـــــ اور یہ ہے مس لوسی :

میں نے بڑے تپاک سے مس لوسی سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ نرم بھی تھا اور گرم بھی۔ اس نے ہیوی میک اپ کر رکھا تھا۔ سیاہ بال، بھوری آنکھیں گہری سُرخ لپ اسٹک، بلیو سکرٹ اور پیلے جوتے۔ وہ دُور سے کسی دکان کا سائن بورڈ معلوم ہوتی ہوئی مگر نزدیک سے ابسٹرکٹ پینٹنگ کے سلجھے ہوئے رنگوں کا تاثر دے رہی تھی۔

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے ایک مرتبہ ایسے دیکھا جیسے انشورنس ایجنٹ کسی متوقع گاہک کو جانچتا ہے۔

ہم تینوں باتیں کرتے ہوئے چل دیئے۔ وقار نے اپنے لئے ایک میز مخصوص کروا رکھی تھی۔ راستے میں اور بھی کئی لوگ ملے۔ میز پر بیٹھ کر وقار نے پوچھا۔

"تم اکیلے ہو؟"

"ہوں"

"کیوں"

"ویسے ہی ......"

"وہ یاد آتی ہے؟"

مس لوسی ننھے سے آئینہ میں اپنی ناک پر پف پھیر رہی تھی اس نے آئینہ کو سامنے سے ہٹا کر میری طرف بڑی دلچسپ سے دیکھا۔ میں نے جواب نہ دینے ہی میں عافیت سمجھتے ہوئے مس لوسی سے پوچھا۔

"میری وجہ سے آپ ڈسٹرب تو نہ ہوں گے؟"

"بالکل نہیں"۔ اور لپ اسٹک لگے سُرخ ہونٹوں کے عقب میں سے اس کے سفید دانتوں نے ایک جھلک دکھائی۔ دانت اچھے تھے مگر اتنے نہیں کہ ان سے بازو پر کٹوانے کو دل چاہے۔

آرکسٹرا نے ایک تیز جھنکار کے ساتھ ٹیون ختم کی اور رقصاں جوڑے جیسے عالم مدہوشی میں ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھک گئے پھر وہ سب تالیاں بجاتے اپنی اپنی میزوں کی طرف بڑھ گئے۔ تمام میزیں بھری تھیں بیرے ادھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے تھے یونہی بے مقصد سب پر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ آرکسٹرا خاموش تھا صرف ایک آدمی وائلن بجا رہا تھا وہ بہت اچھی اور پیاری سی دُھن تھی کیونکہ عورتیں بھی سانس بند کئے سُن رہی تھیں۔ وقار خاموشی سے اپنے گلاس کے کناروں سے کھیل رہا تھا اور مس لوسی کی بھوری آنکھیں گویا چاکلیٹ بن گئی تھیں مگر مجھے یہ دھن نہ بھائی۔ یہ دھن ہوا کی طرح ماضی کی راکھ میں سے یادوں کی چنگاریاں کرید رہی تھیں۔ شریر انگلیوں کی مانند ایک ایسے پردے کو سرسرا رہی تھی جس کے دروازے کو مقفل کر کے اس کی چابی گنوا دی گئی ہو۔

میں نے بے اختیار ہو کر سکاچ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

وائلن خاموش ہو گئی، سب خاموش تھے اور اس کے بعد پورا آرکسٹرا ایک دم سے بجنے لگا۔ وقار نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے انکار کے طور پر سگریٹ سلگا لیا۔ اس نے مس لوسی کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں فلور پر پہنچ گئے۔ میں سگریٹ کے دھوئیں میں سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ اچھا ناچتی تھی اس کی کمر کے گرد وقار کے بازو کا گھیرا کافی تنگ تھا اس کی کمر وقار کے کوٹ کے دوسرے بٹن تک آتی تھی۔ اونچی ایڑی کے سینڈلوں میں ... کے ٹخنے کی ہڈی کا ابھار دلکش تھا۔ سلک سٹاکنگ میں اس کی پنڈلیوں کی مچھلیاں گویا موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ابھر اور ڈوب رہی تھیں۔ اور کمر کے نیچے کا ابھار ... کی پلیٹوں میں سے ... جاتا تھا۔

میں نے وقار کے گلاس کو بھی خالی کر دیا اور گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کر لیا کہ میں آج واقعی اداس ہوں۔ آج رات بارہ بجے نیا سال جنم لے گا گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی اس کے جنم لینے میں تقریباً ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن پھر خیال آیا تنہا گھر اور اکیلا بستر بھی تو بور کرے گا میں نے ایک نیا پیگ تیار کیا ہی تھا کہ ڈانس ختم ہو گیا اور وہ دونوں ہنستے ہوئے واپس آ گئے۔ اگلا ڈانس میں نے مس لوسی کے ساتھ کیا وہ واقعی اچھا ڈانس کر لیتی تھی۔ میں نے جب تعریف کی تو وہ خوش ہو کر بولی "میں تو روک اینڈ رول بھی کر لیتی ہوں۔"

"وہ کس سے سیکھا"

"اپنے ڈیڈی سے"

"تم اپنے ڈیڈی کے ساتھ ......"

"نہیں، یہ بات نہیں، وہ ڈانسنگ کلاسز لیتے ہیں، اس لئے میں ہر قسم کے ڈانس کر لیتی ہوں"

"اور پھر لوگوں کو ڈانس کراتی ہوگی"

"یُو ناٹی!" اس نے مسکرا کر میری طرف منہ اٹھا دیا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی نہ لگی کیونکہ اس کے مسوڑھے نظر آتے تھے اس کے باوجود اس کے ہونٹ اچھے تھے۔ خصوصاً نچلا ہونٹ۔ جو قدرے بھاری تھا۔ بے خیالی میں میری ناک اس کے بالوں سے چھو گئی مگر اس نے بُرا نہ مانا۔ میں نے فوراً چور نظروں سے وقار کی طرف دیکھا مگر وہ ہماری طرف نہ دیکھ رہا تھا۔ گو یہ نادانستہ طور پر ہوا تھا مگر پھر بھی میں خود کو بڑا برا سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ نہ صرف میرے عزیز ترین دوست ہی کے ساتھ تھی بلکہ میں خود بھی تو اداس تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"ایک بات پوچھوں"

"ہوں"

"تم کسی کے لئے اداس ہو؟"

"یُو ناٹی" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا میں اداس نظر آتا ہوں"

وہ بولی "میں کہہ نہیں سکتی"

"تو پھر ــــ؟"

"وقار جو کہتا تھا"

"آل رائیٹ ــــ میں اداس ہوں"

"کیسی تھی وہ؟"

"تم سے زیادہ خوبصورت تھی" میں نے اسے جلانا چاہا۔ مگر وہ صرف مسکرا دی ــــ مجھے اب بھی اس کی مسکراہٹ اچھی نہ لگی۔

"تم اسی سے محبت کرتے ہو"

"شاید"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا بھوری آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ صرف عورتوں کے فطری تجسس کے تحت یہ سب کچھ پوچھ رہی تھی۔

"تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"یوں ہی"

"تم جانتی ہو اس وقت میرا دل کیا چاہتا ہے؟"

"کیا؟"

"میں تمہیں چومنا چاہتا ہوں"

"یو ڈرٹی ــــ تم ذرا کوشش تو کرو" وہ خوش ہو کر بولی۔ اتنے میں ڈانس ختم ہو گیا اور ہم واپس آ گئے۔ میز پر آ کر اس نے اپنی شیمپین پی اور پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ وقار بولا۔ "کیا باتیں ہوتی رہیں" میں نے اسے سب کچھ بتا دیا وہ بولا "اسے ساتھ لے جاؤ"

"احمق ہو تم تو"

"تمہیں آج ہوا کیا ہے"

"میں اسے دیکھ کر آ رہا ہوں"

"ویلما کو۔"

"ہاں"

"سینی ٹوریم گئے تھے۔"

"ہاں"

"پھر ــــ؟"

"پھر کیا ــــ بہت بری حالت ہے اس کی۔ شاید نہ بچ سکے"

وہ خاموش ہو گیا اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا۔ اور لائٹر سے سلگا کر ایک دو طویل کش لیئے۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس نے سگریٹ کو احتیاط سے ایش ٹرے کے کنارے پر لگایا اور کہنے لگا" ایسی عورتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے"

"تم بھی یہی کہتے ہو؟" مجھے اس کی یہ بات واقعی بری لگی۔

"سبھی یہی کہتے ہیں" وہ بے زاری سے بولا" تم تو سدا کے احمق ہو، بھلا ایسے معاملات میں کوئی یوں اپنی جان کو روگ لگا لیتا ہے۔ اس کی ٹی بی کے غم میں تم خود کو کیوں ٹی بی لگا لو" میں خاموش رہا وہ پھر کہنے لگا" جو عورت اپنے آپ کو سنبھال کر نہیں رکھتی اس کا انجام کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کتنی پی جاتی تھی، کتنے سگریٹ پھونک دیتی تھی"

"اسے ٹی بی اس وجہ سے نہیں ہوئی"

"تو پھر ــــ؟"

"ایک غم اسے دیمک کی طرح چاٹ گیا" اس نے بیزاری سے کندھے اچکائے۔ "محض میلو ڈراما۔" اتنے میں مس لوسی وائن آگئی اور اگلے ہی لمحے دونوں پھر اکٹھے تھے۔

محض میلو ڈراما ــــ میں نے وقار کے ان الفاظ کو اپنے ذہن سے خارج کر دینا چاہا۔ تو کیا سینی ٹوریم میں خون تھوکنے والے سینے کے تمام دردناک محض میلو ڈراما تھے۔ کیا اس کی موت میلو ڈراما ہو گی اور اس کے لیئے میری اداسی بھی میلو ڈراما ہے؟

میں ویلما سے پہلی مرتبہ اسی کلب میں ملا تھا۔ میں بزنس کے سلسلہ میں کافی مدت باہر رہ کر واپس آیا تھا۔ میں اور وقار باہر لان میں بیٹھے گپوں میں مشغول تھے کہ ویلما آگئی۔

میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

پرم کئے بالوں کی ایک لٹ جان بوجھ کر صندلیں پیشانی سے کھیلنے کے لئے چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی سیاہ آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی اور خوابگوں آنکھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے ابھی کسی نے کچی نیند سے جگا دیا ہو اور وہ حیران حیران سی دیکھ رہی ہو۔ خمیدہ لبوں پر پنک لپ اسٹک تھی اور لمبے ناخن بھی پنک نیل پالش سے پینٹ کئے گئے تھے۔ گردن لمبی اور پتلی تھی ــــ جیسے ایک راج ہنس غرور سے سر اٹھا کر دیکھ رہا ہو ــــ اور لوکٹ گلے کی V کے اختتام پر ایک تل تھا۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور سفید سکرٹ اور سفید جوتوں کے درمیان پنڈلیوں پر نگاہیں پھسلتی جا رہی تھیں۔

وہ ایک دلکش انداز سے گردن کو ایک طرف خم دئے باتیں کر رہی تھی۔ اس خم نے گردن میں ایک بڑا دلکش گڑھا پیدا کر دیا تھا۔ سر کی جنبش کے ساتھ ساتھ ایئر رنگ بھی ہچکولے کھا جاتے تھے۔ اس کی آواز بڑی شیریں تھی بڑی ملائم اور ریشمی سی آواز، کچھ ایسا احساس ہوتا تھا گویا کوئی پیار سے جسم کو سہلا رہا ہو۔

ہم نے اس شام خوب باتیں کیں۔ میں نے اور ویلما نے زیادہ اور وقار نے کم ــــ پھر وہ چلا گیا! وہ سمجھدار تھا اور ــــ کسی لڑکی کو

ورنہ میں مل ہوتی تو گائے نہ سمجھتا تھا وہ میری دلچسپی کو بھانپ گیا تھا اس لئے کوئی بہانہ کر کے اٹھ گیا۔ ہم نے اسے روکنے میں کسی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ بھی نہ کیا

شام کے سائے ڈھل گئے تو ہم اٹھ کر اندر بار میں آگئے۔ آتے ہی اس نے دو تین پیگ اکٹھا چڑھا لئے اس کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا اور کرسی پر پہلو بدل کر میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا کہتی ہو "بتا تیری رضا کیا ہے"۔

میں نے فلم کا ذکر کیا وہ فوراً مان گئی۔

ہال میں تاریکی ہوتے ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ نہ چھڑایا۔ وہ چھوٹا سا ہاتھ بڑا نرم نرم تھا۔ میرے دبانے پر وہ ایک اسپنج کی طرح دب گیا "یونانی بوائے"۔ اس نے خود میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور اس کے بعد ہم نے خاموشی سے فلم دیکھی۔

واپسی پر اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے آنکھیں موند لی تھیں لمبی پلکوں نے قاتل آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا اور نیم وا لبوں سے دو سفید دانت جھلک دکھا رہے تھے —— میری نگاہ تل تک جا پہنچی اور ہاتھ سٹیرنگ پر جیسے کانپنے لگے —— "ڈیلیا"! میں نے اسے آواز دی۔

وہ اسی طرح میرے کندھے پر سر رکھے کسمسائی مگر سر نہ اٹھایا۔

"دیکھو ڈیلیا! ہم یورپ میں نہیں —— مانا اس وقت سڑکیں سنسان ہیں پھر بھی اگر کسی سپاہی نے دیکھ لیا تو دھر لئے جائیں گے"۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولی "مجھے سگریٹ دو"۔

میں نے منہ والا سگریٹ اس کے منہ سے لگا دیا اب وہ ٹھیک ہو بیٹھی تھی اس نے خاموشی سے ایک دو کش لئے۔ پھر سگریٹ اس کے ہونٹوں کے کونے میں دبا رہا اور خاموشی سے ویران سڑک کو گھورنے لگی جو ہیڈ لائیٹس پر ایک سرمئی فیتہ کی طرح کھسکتی جا رہی تھی۔ اس نے سگریٹ باہر پھینکا، اور ایک لمبا سانس لینے کے بعد بولی "ڈارلنگ"۔

"ہوں"۔

ہماری آنکھیں ایک لمحہ کو چار ہوئیں اس کی آنکھوں کو پلکوں نے چھپا لیا وہ انگلی سے سگریٹ کی پلیٹ کو کرید رہی تھی۔ میں خاموش رہا بالآخر وہ بولی "مجھے کچھ پیسے چاہئیں —— ادھار"۔ یہ کہہ کر اس نے سیٹ کی پشت پر ایسے سر لٹکا دیا جیسے اس نے بہت بڑا بوجھ اتار لیا ہو۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالکر بٹوا اس کی گود میں رکھ دیا اس نے کچھ نوٹ نکال کر اپنے پرس میں ڈال لئے اور بٹوا واپس میری جیب میں ڈال دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دو سگریٹ سلگا کر ایک میرے ہونٹوں میں تھما دیا۔ ہماری آنکھیں دوبارہ چار ہوئیں —— وہ مسکرا دی، میں بھی مسکرا دیا اور پھر وہ اچانک بولی

"مجھے یہاں اتار دو"۔

"گھر نہ چلو گی؟"

"کس کے؟" اس نے جیسے بے خیالی میں پوچھا

"اپنے گھر"۔

"نہیں، وہ آگے گلیوں میں ہے —— بس میں یہاں سے چلی جاؤں گی"۔ میں نے بریک لگائی۔ وہ باہر نکل کر ایک لمحہ کو رکی اور بولی

"تم بہت سویٹ ہو"۔

"تھینکس —— سویٹ ہارٹ!"

اس نے مڑ کر نہ دیکھا لیکن میں اسے دیکھتا رہا اور جب اسے ایک گلی کی تاریکی نے نگل لیا اور ایک کتے نے مشکوک انداز سے بھونکنا شروع کیا تو میں نے کار دوبارہ سٹارٹ کر لی۔

گھر آ کر میں اس کے بارہ میں سوچتا رہا اور کافی دیر تک اس کا وہ تل میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا —— اور پھر میں سو گیا۔

"ارے کیا سو گئے ؟"

وہ دونوں ڈانس سے فارغ ہو کر آ چلے تھے "نہیں تو" میں نے چونک کر کہا۔

"تو پھر یہ کیا اونگھ رہے ہو"

مس لوسی بے تحاشا ہنس دی میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اکھڑی اکھڑی لپ اسٹک کے عقب سے پیلے مسوڑھوں نے جھانکا۔ میں نے ایک پیگ اور ختم کیا۔

"میں ذرا باہر جاتا ہوں"

مس لوسی نے بازو پکڑا —— "ڈانس نہیں کرنا"

"ابھی نہیں !"

"جانے دو —" وقار بولا "ٹھنڈی ہوا کھا کر موڈ ٹھیک ہو جائے گا —" میں دو قدم چلا تو اس نے آواز دے کر پوچھا۔

"واپس آؤ گے نا"

"ہاں"

میں کلب سے باہر نکلا تو سڑک پر بلبوں کی زرد روشنی میں خاموشی تھی۔ ٹھنڈی ہوا بڑا سکون دے رہی تھی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے میں چلتا گیا۔

—— مجھے ریلیا کی دوسری ملاقات یاد آ رہی تھی۔

تین چار دن کے بعد جب میں کلب آیا تو میں نے وقار سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"اس دن کے بعد سے میں نے تو اسے نہیں دیکھا"

"بیمار نہ ہو گئی ہو"

"توقع تو نہیں —— وہ تو خود اچھی خاصی بیماری ہے —— تم اسے گھر لے گئے تھے ؟"

"نہیں تو"

"پھر ؟"

"ہم نے سینما دیکھا"

"اس کے بعد ؟"

"میں نے اسے اس کے گھر چھوڑ دیا"

"اس نے پیسے مانگے تھے ؟"

میں نے جھوٹ بولا —— "نہیں !"

وہ سگریٹ جلانے لگا تھا۔ ایک دم اس نے ہاتھ روک دیا۔ جلتی ہوئی تیلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ "تم جھوٹ کہتے ہو"

"بہت اچھا۔ میں جھوٹ کہتا ہوں"

"اگر یہ سچ ہے تو مجھے سخت تعجب ہے"

"وقار ! وہ اتنی بُری تو نہیں ہے جتنی تم اسے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہو"

اس نے سگریٹ سلگا لیا اور ایک کش لینے کے بعد اس نے میری طرف غور سے دیکھا "شاید تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے پھر ایک کش لیا اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہنے لگا "غالباً وہ بُری نہیں! سنو! اس کا باپ پاگل خانے میں ہے، ماں بیمار ہے۔ بیمار اس لحاظ سے کہ اگر

اسے روز شراب نہ ملے تو وہ پاگل پن کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ ایک بھائی ہے جو پڑھتا کم ہے لیکن سکول کے نام پر پیسے زیادہ بٹورتا ہے ایک چھوٹی بہن ہے جو اب جوان ہے ــــ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ــــ" اس نے دوبارہ سگریٹ اٹھا کر ایک طویل کش لیا اور ناک میں سے دھوئیں کی دھاریں چھوڑتا ہوا وہ دوبارہ بولا ــــ" غالباً وہ بری نہیں۔"

ــــ ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے

"میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا کرو گے؟"

"شاید وہ بیمار ہو"

"تمہیں وہ گھر نہیں لے گئی تھی؟"

"نہیں: میں نے اسے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔"

"ہوں! ــــ اس نے مجھے پتہ سمجھا دیا اور میں نے فوراً اس کے گھر کا رخ کیا۔

وہ ایک عام سا فلیٹ تھا۔ بیل کے جواب میں ایک لڑکی نے آ کر دروازہ کھولا۔ پتلے دبلے جسم پر ایک میلا سا فراک جھول رہا تھا۔ رنگ سفید تھا۔ بیضوی چہرے پر سیاہ بھوؤں کے نیچے اس کی لمبی آنکھیں مجھے تجسس سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور پنڈلیوں پر بالوں کا سرمئی غبار تھا۔ میں نے ڈیلیا کا پوچھا۔ اس نے جواب دئے بغیر دروازہ پورا کھول دیا۔ یہ اندر آنے کی دعوت تھی جسے میں نے قبول کر لیا وہ مڑی اور میرے آگے آگے اس کی پونی ٹیل جھول رہی تھی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا کھڑکیوں پر میلے سے پردے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کی تصویریں تھیں اور نیچے مینٹل پیس پر ایک پرانا ٹائم پیس تھا۔ ادھر اُدھر کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ دو پلنگ تھے جن پر بستروں کا ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پر ایک بوڑھیا بیٹھی تھی کھچڑی بال اور کئی طرح کے داغ تھے۔ اس نے اپنی سرخ اور گول آنکھوں سے مجھے ایک مرتبہ دیکھا اور اس کے بعد وہ ٹانگ ہلانے کے کام میں مشغول ہو گئی سوتی جو اس کی گھٹنوں تک جاتی تھیں شوخ رنگ کا میلا سا فراک ڈیلیا کا ہو گا۔ اس کمرے کی سب سے صاف ستھری اور معقول چیز ایک ریڈیو تھا۔ جو فل والیوم پر چل رہا تھا۔ کوئی انگریزی گیت تھا۔

اگلے کمرے میں ڈیلیا بستر پر لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران سی کھڑی ہو گئی۔ "تم؟" اسے جیسے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ تھا کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔"

"اوہ" وہ شرمندہ سی ہو کر بولی "دراصل مجھے اتنا تعجب ہوا ہے کہ ــــ" میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا وہ میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی اس نے مردانہ سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ گہری نیلی اور سرخ دھاریوں والی بش شرٹ میں اس کا سانولا چہرہ دمک رہا تھا۔ میک اپ نہ ہونے کی وجہ سے چہرہ کا نمک جیسے اور بھی نکھر گیا تھا۔ بش شرٹ کے دو بٹن کھلے تھے جنہیں اس نے فوراً بند کر دیا۔

اس کی بہن کھڑی تھی "یہ اسیتھر ہے۔" اس نے ہمارا تعارف کرایا اور وہ پونی ٹیل ہلاتی باہر چلی گئی۔

"میرا خیال تھا تم بیمار نہ ہو"

"میری طبیعت خراب تھی"

ہم دونوں خاموش ہو گئے وہ تھوڑی ہاتھ پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک سگریٹ سلگایا ــــ" چائے پیو گے؟"

"نہیں!"

"کافی!"

"پی لوں گا۔"

اس نے اسیتھر کو آواز دے کر کافی بنانے کے لئے کہا اور خود تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔

"یہ کیا ہے؟"

"اُس رات میں نے تم سے لئے تھے نا؟"

میں نے روپے پکڑنے کو ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ اٹھ کر میری کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی اس کے جسم کی مہک خوشگوار تھی۔

"میں نے ادھار مانگا تھا۔۔۔" میں نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں لوں گا"

"یو سلی! ۔۔۔" اس نے میری جیب میں سے بٹوا نکال لیا اور اس میں نوٹ ڈال کر دوبارہ وہاں رکھ دیا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں!" وہ بولی

"یہ میرے نوٹ ہیں؟"

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی۔ "ہاں"

"تم نے انہیں خرچ کیوں نہ کر لیا۔ اگر واپس کرنے ہی تھے تو بعد میں اپنی سہولت سے واپس کئے جا سکتے تھے"

"میں نہیں جانتی ۔۔۔ لیکن ضرورت کے باوجود بھی میں انہیں خرچ نہ کر سکی" وہ اٹھنے لگی لیکن میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیوں ولیما! آخر کیوں؟"

اس نے ایک لمبا سانس لیا ۔۔۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتی"

اس نے میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگریٹ لے کر ایک کش لگایا اور پھر اسے فرش پر پھینک دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بڑھا۔ اور اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

"ویل ۔۔" مگر اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے انگلیوں کو چوم لیا۔ اس نے ہاتھ وہاں سے ہٹا لیا

"تم خاموش رہو!" اس کی آواز میں ایک نیا بوجھل پن پیدا ہو گیا تھا اس میں لرزش تھی جیسے ہوا سے دیپک کی لو تھرتھرا رہی ہو۔ "میری طبیعت خراب نہ تھی میں پریشان تھی۔ اس عرصہ میں میں نے پہلی بار اپنے بارے میں سوچا ۔۔۔ نہایت دکھ اور سنجیدگی کے ساتھ ۔۔۔" اس نے میرے سر کو اپنی گود میں اور بھی دبا لیا اور بالوں سے کھیلنے والے ہاتھ نے اب گالوں کو تھپتھپانا شروع کر دیا۔ وہ ایک لمحہ کو خاموش رہی ۔۔۔ "مجھے تم سے محبت ہے۔" اس نے اچانک ہی کہہ دیا "رحمت ۔۔۔ اور کچھ نہ بولو ۔۔۔ پلیز!" اس نے میرے سر کو اور بھی دبا لیا تھا۔ اب وہ پھر بالوں سے کھیل رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ وقار نے تمہیں میرے بارہ میں بہت کچھ بتا دیا ہوگا ۔۔۔ میں واقعی بہت بری ہوں ۔۔۔ کیا میں تم سے محبت کر سکتی ہوں؟" اس نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر میرے منہ کو اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں چہرے [illegible] کو ایک اندھے کی انگلیوں کی طرح ٹٹول رہی تھیں۔ سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وادیوں میں گھٹاؤں نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اچانک اٹھی اور سامنے پلنگ پر تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا

"ولیما!" میں نے اس کے لرزتے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسے چپ کراؤں۔ "ولیما پلیز!" میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ اور آہستہ آہستہ وہ خاموش ہوتی گئی۔ مگر اس نے تکیہ سے سر نہ ہٹایا۔

الیسھتر کافی لائی اور میز پر رکھ دی۔ اس نے اپنی بہن کی طرف نہ دیکھا بس میری طرف خالی نظروں سے دیکھا۔ اور خاموشی سے چلی گئی۔ ساتھ کے کمرہ کا ریڈیو بند ہو گیا تھا اور کمرہ بڑا خاموش تھا۔ میں نے کافی بنائی اور اسے اٹھایا۔ اس نے کافی پینے سے انکار کر دیا اور میری گود میں اپنا سر ڈال دیا۔ میں اس کے بالوں سے کھیلتا رہا اس نے چہرہ اونچا کر کے بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے لب کپکپائے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا۔ میں نے اسے چومنے کو منہ جھکایا مگر اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "نو!" اور اٹھ کر کافی کا کپ اٹھا لیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ ساتھ کے کمرے میں اس کی ماں الیسھتر سے تیز لہجہ میں کچھ کہہ رہی تھی جس کے جواب میں الیسھتر نے چپ سادھ رکھی تھی۔ ولیما نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپ کے کنارے پر ٹکے تھے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے سامنے کافی کے دھوئیں کی باریک لکیروں نے آڑے

ترچھے جال سے بن رکھے تھے۔

—— یہ تھی ہماری دوسری ملاقات!

اس کے بعد تو جیسے وہ میرے ذہن پر سوار ہو گئی۔ ہم عموماً اکٹھے ہی گھومتے مگر اس نے نہ تو کبھی مجھے کس کرنے دیا اور نہ ہی مجھے کوئی پیسہ خرچ کرنے دیا جب ایک مرتبہ میں نے احتجاج کیا تو وہ کہنے لگی: "ساری دنیا مجھ پر پیسہ صرف کرتی ہے اگر میں نے تم پر کچھ خرچ کر دیا تو تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے۔"

"مگر ——"

اگر مگر کچھ نہیں! میں تمہیں چاہتی ہوں اور تم پر کچھ خرچ کرنے سے اگر مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے تو تم اسے کیوں مجھ سے چھینتے ہو"

اور میں خاموش ہو رہا وہ مجھے اپنی گھریلو باتیں، بچپن کے واقعات اور سہیلیوں کے رومانس سب کچھ بتایا کرتی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں"۔

اس نے بڑی بڑی آنکھوں کو جھپکا کر میری طرف دیکھا اور خاموش رہی "تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"شی! —— ایسے سوالات نہیں پوچھا کرتے"۔

"پھر بھی!"

"تمہارا اندازہ کیا ہے"

"میرے خیال میں بیس اور پچیس کے درمیان"۔

وہ ہنس دی —— پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی —— مجھ سے کون شادی کرے گا۔

"میں!"

"یو سلی!" اس نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا "تم بعض اوقات بالکل بچوں ایسی بات کرتے ہو"

مجھے بہت برا لگا —— "اب موڈ آف مت کرو نا —— " وہ بولی۔ "اگر میں شادی کر لوں تو ان سب کا کیا بنے گا؟"

"دیکھو! میں تمہیں سمجھتا ہوں، تمہارا کنبہ میرا کنبہ ہو گا۔ میرے پاس کافی پیسہ ہے اور ہم سب اطمینان سے گزارہ کر سکتے ہیں"

"نہیں!"

"مگر کیوں ——"

اس نے پھر بچوں کی طرح میرے گال کو تھپتھپانا شروع کر دیا: "بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں تم ابھی نہیں سمجھ سکتے لیکن ایک وقت آئے گا جب تم میرا ذکر محبت اور عزت سے کرو گے"۔ وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ میرے گالوں پر اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ "مجھے زندگی میں دو چیزوں کی تمنا ہے۔ محبت، وہ مجھے تم سے مل گئی اور عزت —— جو مجھے کبھی نہ مل سکے گی"۔

"مگر میں تو ——"

"میں جانتی ہوں —— میں جانتی ہوں"۔ وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا "تم کہتی ہو تمہیں عزت کبھی نہ مل سکی لیکن تم یہ بھولتی ہو کہ عزت ایک داخلی چیز ہے۔ اگر تم اپنی عزت کر سکتی ہو تو تمہیں دنیا والوں کی زبان کا خیال نہ کرنا چاہیئے —— تم نے جو کچھ کیا ہے کیا اس میں تمہاری اپنی مرضی کو دخل تھا تم اپنی آرزوں اور تمناؤں کو عزت کی دکان پر بیچ رہی ہو۔ یہ دوسروں کے نزدیک تو بے عزتی کی بات ہو سکتی ہے مگر میرے نزدیک ایسا نہیں —— اور اسی لئے میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو! کیا تمہارے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ تمہارا اپنا گھر ہو جس میں ہر چیز تمہاری پسند اور ذوق کی آئینہ دار ہو۔ تمہارے اپنے بچے ہوں، پیارے پیارے —— شور مچاتے —— اور تمہارے پیچھے امی امی کرتے بھاگتے ہوئے بچے —— کیا تم ——"

وہ ایک دم چیخ پڑی "اوہ! فار کرائسٹ!! چپ ہو جاؤ! —— چپ ہو جاؤ —— !!" اس کی آواز آنسوؤں کی دھار میں ڈوب گئی اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے پیار سے اس کے گالوں کو سہلایا "دیکھا! مجھے تمہارے احساسات کا اندازہ

ہے اور میں ان کی قدر کرتا ہوں میرا مقصد تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہ تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں اپنی محبت کا عملی ثبوت دینا چاہتا ہوں"

مگر وہ کچھ نہ بولی، آنسوؤں کی لڑیاں اس کے گالوں پر آ آکر ٹوٹ رہی تھیں۔ میں نے اسے چپ نہ کرایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموش ہوگئی اور پھر کہنے لگی" تم سے شادی نہ کرنے کی دو وجوہات ہیں ایک تو میں یہ نہیں چاہتی کہ تم میرے تمام کنبہ کا بوجھ سنبھالو ــــ بات نہ کاٹو ــــ اور دوسری

دوسری وجہ یہ ــــ کہ مجھے ٹی بی ہے۔

"مگر ٹی بی کا تو علاج کرایا جا سکتا ہے"

"نہیں! میں علاج نہیں چاہتی ــــ میں مرجانا چاہتی ہوں"

"ولیا!"

"ہاں!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر اس نے نظریں جھکا لیں۔ گالوں پر آنسوؤں کی خشک لکیر کے نشانات موجود تھے میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ "کیوں؟ ــ ولیا کیوں؟؟" وہ خاموش رہی

ــــ دور سے کسی کار کی تیز روشنی نے مجھے اپنے گردوپیش کا احساس کرایا۔ میں سڑک پر کافی آگے نکل آیا تھا سوچا واپس جاؤں لیکن پھر کلب کا گرم ماحول یاد آ گیا۔ باہر سڑک پر پُرسکون تھا۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور نالے کے چھوٹے سے پل پر چڑھ بیٹھا۔ سگریٹ نے اس وقت بڑا سکون دیا، دماغ میں جو بحرانی کیفیت تھی وہ ٹھنڈی ہوا سے ایک حد تک کم ہوگئی تھی۔

مجھے اور باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ وہ ایستھر کا ذکر بڑے پیار سے کرتی تھی اس نے بتایا کہ جب ایستھر چھوٹی سی تھی تو امی سخت بیمار ہوگئی چنانچہ اس وقت ایستھر راتوں کو میرے ساتھ سوتی تھی اور کئی ماہ تک میں اس کے لئے بیک وقت ماں، آیا اور نرس کا کام کرتی رہی۔

مگر ایستھر کو ولیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ میرے خیال میں اسے ولیا سے اچھی خاصی نفرت تھی! اس نے ولیا کے ملاقاتیوں میں سے کبھی بھی کسی کے ساتھ ہنس کر بات نہ کی تھی وہ بڑی خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ شروع شروع میں اس نے میرے ساتھ بھی دیگر ملاقاتیوں ایسا سلوک روا رکھا لیکن جب اسے احساس ہوگیا کہ مجھ میں اور دیگر ملاقاتیوں میں فرق ہے تو اس کے رویہ میں تبدیلی آگئی۔ اسے مطالعہ کا بڑا شوق اور مذہب کا جنون تھا جب وہ کسی نئی کتاب کا ذکر کرتی تو اس کی آنکھوں میں فورِ شوق سے ایک نئی چمک پیدا ہو جاتی وہ مجھ سے بھی ادھر اُدھر کے سوالات پوچھتی رہتی۔ ایک دفعہ کہنے لگی" نیبولا سے سورج کیسے بن جاتا ہے"

میں چکرا کر رہ گیا "مگر یہ نیبولا کیا ہے؟" میں نے پوچھا وہ ہنس دی" واہ! اتنے بڑے ہوگئے اور ابھی تک اس کا پتہ نہیں"

ایک دن بیٹھے بیٹھے پوچھ بیٹھی" نیدم کتنے فٹ کا ہوتا ہے؟"

ایستھر کی میز پر کتابوں کا ڈھیر پڑا رہتا تھا۔ پلنگ کے سرہانے کنواری مریم کی تصویر تھی اور اس کے گلے پر مقدس صلیب جھولتی تھی وہ ہر رات کو دعا مانگ کر سوتی تھی۔ سارے کنبہ میں صرف وہی باقاعدگی سے چرچ جاتی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا" تم کیا دعا مانگا کرتی ہو" پہلے تو وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی" میں ولیا کے لئے دعا مانگتی ہوں ــــ کاش مقدس ماں اسے صحیح روشنی دکھائے"

"تو تمہارے خیال میں وہ ــــ"

"ہاں! وہ ٹھیک راستہ پر نہیں جا رہی۔ وہ خود کو تو خراب کر رہی ہے لیکن تم لوگوں کے حق میں بھی کانٹے بو رہی ہے"

"کانٹے بو رہی ہے ــــ؟"

"اور کیا! ہماری یہاں تھوڑی بدنامی ہو چکی ہے، ولیا کا نام لے لے کر میرا مذاق اڑایا جاتا ہے"

"تم جانتی ہو اسے تم سے کتنی محبت ہے"

"وہ کسی سے محبت نہیں کرتی ــــ وہ خود پرست اور خود سر ہے، وہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتی ــ" وہ خاموش ہوگئی پھر کہنے لگی" وہ میری بہن ہے! کسی وقت وہ میرا آئیڈیل تھی مگر اب ــــ اب میں اس کے چہرے کو نظر بھر کے بھی نہیں دیکھ سکتی ــــ میں صرف

اس کے لئے دعا کر سکتی ہوں۔ خداوند یسوع مسیح اسے سچائی کے راستہ پر چلنے کی توفیق دیں۔ ایک دفعہ وہ بڑی پریشان تھی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ دعا مانگے اس سے بڑا سکون ملے گا اور پتہ ہے اس نے کیا کہا ___ کہنے لگی مجھے دعا پر اعتماد نہیں ___ ہنہ! اگر دعا پر اعتماد نہیں، خدا پر اعتماد نہیں، ___ تو پھر کس پر اعتماد ہے۔ کیا صرف پیسہ اور وسکی کی بوتل ہی اعتماد کے قابل ہیں؟

ڈلیا سے ایستھر کی نفرت پوشیدہ نہ تھی وہ جانتی تھی لیکن اس کے باوجود چاہتی تھی کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے تاکہ وہ خود مختار ہو سکے اور شاید اسی لئے وہ اب تک ٹی بی سے جنگ کر رہی تھی اس کی بیماری کا گھر میں کسی کو پتہ نہ تھا ___

مجھے کچھ مدت کے لئے باہر جانا پڑا۔ میں نے ڈلیا کو کئی خطوط لکھے مگر اس نے جواب نہ دیا مجھے جواب کی توقع بھی نہ تھی کیونکہ بوقتِ رخصت جب میں نے خط لکھنے کے کہا تو وہ بولی "کوئی فائدہ نہیں! تمہارے آنے تک میں سینی ٹوریم میں پہنچ چکی ہوں گی اور ہو سکتا ہے میں ختم ہی ہو جاؤں اس لئے میری حالت پڑھ کر بیکار پریشان ہونے کا کیا فائدہ ہوگا"۔ اس نے اپنی ایک تصویر دی جس کی پشت پر اس نے یہ شعر لکھا:

TO BE BELOVED, ALL I NEED

TO WHEOME I LOVE, I LOVE IN DEED

جب اس نے اپنے کہنے کے مطابق کئی خطوں کا جواب نہ دیا تو میں نے بھی خط لکھنے بند کر دیئے۔ کبھی کبھی دل جب اداس ہوتا تو اس کی تصویر نکال کر دیکھ لیتا۔ مسکراتے لب اور مسکراتی آنکھیں ___ کاش! اس کا دل بھی اسی طرح مسکرا سکتا ___ کاش!! میں اس کی جھولی مسرتوں سے بھر سکتا۔ لے کاش!! اس کے ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں سدا رقص کناں رہتیں۔

مجھے اندازہ سے زیادہ دیر ہوئی اور کئی ماہ کے بعد جب میں واپس آیا تو پہلی فرصت ہی میں ان کے گھر کا رخ کیا۔ میرے اندیشے درست نکلے وہ سینی ٹوریم جا چکی تھی۔ کمرہ پہلے سے بھی زیادہ سوگوار تھا۔ کھونٹی پر اس کی شائننگ کا ایک جوڑا گرد کھا رہا تھا۔ پردے پہلے سے بھی زیادہ میلے تھے۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ صرف ایستھر تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کی ایک خندق تھی جسے پھلانگتے ڈر سا لگتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایک لمبا سانس لے کر میری طرف ویران سی نظروں سے دیکھتی اور پھر سر جھکا لیتی۔ میری نگاہوں کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر اب بھی روژ کی ایک ڈبیہ پڑی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر دماغ بالکل خالی تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہ آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ وہ اچانک بولی "ان کی بیماری کے بعد ان کے ملنے والوں میں سے ایک نے بھی آکر نہیں جھانکا جو لوگ ہر وقت انہیں گھیرے رہتے تھے اب ان میں سے اگر کوئی بازار میں ملتا ہے تو ایسی اجنبی اجنبی نظروں سے دیکھتا ہے کہ بس جان ہی تو جل کر رہ جاتی ہے ___ میں نے ادھر اُدھر ملازمت تلاش کی مگر کہیں کچھ بات نہ بن سکی ___ حالت بہت خراب ہے"۔

میں نے جب اسے کچھ نوٹ نکال کر دئے تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو! اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبا لیا ___ اتنا دبایا کہ اس میں سے خون نکل آیا ___ مگر وہ آنسو نہ روک سکی۔

مگر مجھے دیکھ کر ڈلیا کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ وہ مسکرائی اس کے خشک ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر گئی تھیں اور ان کے نیچے گڑھے تھے۔ خشک اور روکھے بالوں کے درمیان تکیہ پر اس کا سر سوکھی بیلوں پر ایک مرجھایا ہوا پھول لگ رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک البتہ ایسی ہی تھی۔ سیاہ حلقوں کے درمیان اب بھی ان آنکھوں کے تاروں کی تابانی ویسی ہی تھی۔ اس کے پاس اپنے ماضی کی نشانی کے طور پر صرف یہی چمک ہی تو رہ گئی تھی ___ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر وہ دوبارہ مسکرائی۔ میں اس کے لئے پھول لایا تھا۔ اس نے آج تک مجھے کبھی کوئی تحفہ دینے کی اجازت نہ دی تھی۔ نرگس کے پھولوں کا یہ گلدستہ پہلا تحفہ تھا جو میں اس کی اجازت کے بغیر لے کر آیا تھا اس نے انہیں چوما اور اپنے گالوں کے ساتھ لگا لیا۔

وہ بھی تو ایک پھول ہی تھی ___ نرگسِ بیمار! کبھی وہ چنبیلی کی مانند بے داغ ہوگی لیکن پھر تو وہ کاغذی پھول بن گئی۔ جس میں خوشبو نہیں ___ چمک دمک ہو۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں!

___ میرا سگریٹ ختم ہو گیا تھا ذہن میں تلخ یادوں کا الاؤ بجھ کر اب راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں اٹھا اور واپس کلب چل دیا۔ وہ دونوں ناچ رہے تھے میں ان کی میز پر آکر بے دلی سے بیٹھ گیا۔ ایک پیگ بنا کر پیا اور رقصاں جوڑوں کو دیکھنا شروع کیا اور پھر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

"ایستھر!" میرے منہ سے بے اختیاری میں نکل گیا۔ ہاں وہ ایستھر ہی تھی پونی ٹیل غائب تھی اور پرم کئے ہوئے بالوں نے اس کے بیضوی چہرہ کے نازک خطوط کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس کا پارٹنر دبلا کے خاص ٹنڈ روانوں میں سا تھا۔ وہ بدصورت تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا۔ اس کی بیوی اس سے طلاق لے چکی تھی۔ مگر اس کے پاس نئی شیورلٹ اور بینک بیلنس تھا۔ ایستھر نے بہت احتیاط سے میک اپ کیا تھا۔ پتلی کمر ساتھی کے بازو کے بوجھ سے جیسے کنول کے ڈنٹھل کی مانند دبی جا رہی تھی وہ ہنس رہی تھی، وہ بھی ہنس رہا تھا اور اس کے پیلے پیلے دانتوں میں سونے کا ایک دانت روشنی میں زیادہ نمایاں ہو رہا تھا

میری نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں، بارہ بجنے والے تھے ——— اوہ! زیرو آور! چند ثانیوں میں نیا سال جنم لینے والا تھا۔ تمام جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ آرکسٹرا کی دھن دیوانگیز تھی صرف میں ہی میز پر تنہا بیٹھا تھا ورنہ باقی سب میزیں خالی تھیں۔ شام سے مصروف بیرے بھی اب ڈانس کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔

——— اور پھر ہال میں تاریکی چھا گئی! میں نے گلاس منہ سے لگا لیا۔ ہال میں سیٹیوں اور عورتوں کی دبی دبی ہنسی اور قہقہے گونج رہے تھے۔ پھر ہال جگمگا اٹھا اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے لوگوں کے ہجوم میں جو چند جوڑے ابھی تک ——— ——— ——— ——— ——— مست کھڑے تھے ان میں سے ایستھر اور اس کا ساتھی بھی تھا

"تم نے میرے ہاتھ سے گلدستۂ محبت قبول کر لیا، مگر اُن
کانٹوں کو نہ دیکھا جو میرے پاؤں میں پیوست ہیں ———
تمہیں کیا خبر میں کن راستوں سے گذر کر آئی ہوں!"

ٹیگور

مسعود مفتی

کھیل

اگر انسان جنت سے نہ نکلتا تو سارا دن کیا کرتا ؟؟؟

سوال بڑا پیچیدہ تھا اور جس انداز سے عرفی بھیا اسے حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے اور بھی پیچیدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ خود ٹیڑھے بیٹھے تھے۔ یعنی آرام کرسی میں نیم دراز، سر کندھوں میں دھنسا ہوا، اور ٹانگیں میز پر۔ دو گھنٹے اس انداز میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے ہم سے یہ سوال پوچھا تھا۔ پھر دو گھنٹے بحث کرتے رہے۔ ہم ان کی کج بحثی اور "کج بیٹھی" سے تنگ آکر باہر بھاگ گئے۔ جب دو گھنٹے بعد لوٹے تو ان کے تیور بتا رہے تھے کہ ابھی دو گھنٹے اور اسی طرح بیٹھیں گے۔ خواہ سوال حل ہو یا نہ ہو۔

لیکن شام کو بڑے چچا آن پہنچے۔ انہیں دیکھتے ہی عرفی بھیا فلسفہ وہیں چھوڑ کر قلانچیں بھرتے ہوئے باہر بھاگ گئے۔ کیونکہ چچا ہمیشہ اصرار کیا کرتے تھے۔ کہ جب تک ان کی بات ختم نہ ہو سننے والے اٹھ کر نہ جائیں۔ اور تواریخ بتاتی تھی کہ ساٹھ برس پیشتر چچا نے پیدائش کے بعد جو پہلی بات شروع کی تھی۔ وہ اب تک ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے عرفی بھیا ان کے سلام کی زد میں آنے سے پہلے ہی بھاگ جایا کرتے تھے۔ چاہے انسان جنت میں رہے یا نکلے۔

چونکہ اس ہجرت میں ہم بھی برابر کے شریک تھے۔ اس لئے باہر آکر مشورہ ہونے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔

"پکچر!!!" عرفی بھیا نے نعرہ لگایا۔

"پیسے؟؟؟" ہم نے جوابی نعرہ لگایا۔

اور خالی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ہم زمین زادوں کی طرح کلب میں داخل ہو گئے۔ ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ جس میں دھواں بھرا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ گھٹن سے دم گھٹتا تھا۔ ایک میز کے گرد چار آدمی بیٹھے برج کھیل رہے تھے۔ ہم کمرے میں داخل ہونے لگے تو بیرا بسورتی صورت بنائے ایک ٹرے میں کچھ رکھے کمرہ سے باہر نکل رہا تھا۔ دیکھا تو کافی کے چار خالی ڈبے، کوئی نصف درجن ایش ٹرے راکھ سے لبالب بھرے ہوئے۔ پیالیوں میں سگرٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے، تھری کیسل کی لاتعداد خالی ڈبیاں اور ان گنت جلی ہوئی تیلیاں تھیں۔

ہم نے پوچھا۔ "صاحب کب سے برج کھیل رہے ہیں؟"

کہنے لگا۔ "تیسرا روز ہے جب سے دفتروں میں چھٹیاں ہوئی ہیں"

"اور کب تک ارادہ ہے کھیلنے کا؟"

"کیا پتہ حضور ---- باقی تینوں حضرات تو کل سے بھی فارغ ہیں۔ قریشی صاحب کا دفتر کل کھل رہا ہے۔ انہوں نے ابھی چپراسی بھیجا ہے کہ صاحب سے کہو جا کر کل کی چھٹی منظور کرالائے۔" بیرے نے جمائی لینے کے لئے پورا جبڑا کھول دیا۔

ہم میز کے قریب پہنچے۔

"اسلام علیکم" بھیا نے آدابِ مجلس کا خیال رکھا۔

"ڈبل" حصار میں سے کوئی بولا۔

"ٹو ن نو ن ٹرمپ" کسی کے زکام زدہ نتھنے گونجے۔

"فور کلب" موچھیں غرائیں

"فور سپیڈ"

"نا ئیو ڈائمنڈ"

"فائیو نو ٹرمپ"

"دست دوجی" قریشی صاحب نے پتہ پھینکا۔ اسلم صاحب نے پتے میز پہ بکھیر دیئے۔

"ارررے — مر گئے۔"

"ول ڈن۔ پارٹنر۔"

"میڈ پیک ہینڈ"

میری چال ہے؟؟؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو یہ لیجئے"

سب نے پتہ پھینکا۔ مرزا جی نے مسکراتے ہوئے سمیٹی۔ اور ڈمی سے چال چلی۔ دوسری سر بھی انہوں نے لے لی۔ پھر چلیے اور تیسری بھی جیت لی۔ لیکن چوتھی ہار گئے۔ ذرا بے بسی سے انہوں نے پارٹنر کی طرف دیکھا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے۔

"وعلیکم السلام"

"مزاج اچھے ہیں مرزا صاحب" اتنی لمبی رکھائی کے بعد جب بھیا کو جواب ملا۔ تو زیادہ ہی با اخلاق بن گئے۔

"ستیاناس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستیاناس" مرزا جی چلائے۔ "ستیاناس کر ڈالا۔ بھلا یہ بھی کوئی پتہ تھا کھیلنے والا۔ ڈائمنڈ ہے ہی نہیں"

اور عرفی بھیا دبک کر خاموش ہو گئے۔ ہم نے سکور دیکھنے کی خاطر سکور بک اٹھائی۔ لیکن وہ ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کے آخری پتے پر بھی سکور درج تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی اور سکور بک نظر نہ آئی۔ اتنے میں ایک ہینڈ ختم ہوا تو اسلم صاحب سکور لکھنے کے لئے پنسل سنبھالنے لگے۔ ایک سادے کاغذ پر دو چار سطور لکھی تھیں۔ اور اس کے نیچے خالی جگہ پر انہوں نے سکور لکھا۔ اتنے میں پتے پھر سے بٹنے لگے۔

"کیا سکور ہے" کہتے ہوئے ہم نے کاغذ اٹھایا۔ سکور پڑھا تو اس کے بعد قدرتی طور پر نظر ان سطور پر پڑی۔ اور ہم چونکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مسز اسلم کی طرف سے اسلم صاحب کے نام رقعہ تھا۔

"کل شام در اصل شنو میں سہیلیاں بک کرائی ہوئی تھیں۔ لیکن آپ کلب سے لوٹے ہی نہیں۔ اور وہ ضائع چلی گئیں۔ آج بلقیس کی شادی ہے۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔ آپ بھی لنچ تک ضرور پہنچ جائیں ورنہ وہ لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ تاکید ہے۔"

نیچے اسی روز کی تاریخ درج تھی۔ اسلم صاحب کے بڑھے ہوئے شیو اور الجھے ہوئے بالوں سے صاف عیاں تھا۔ کہ تین روز سے باہر نہیں نکلے اور انہوں نے اُس رقعے سے زیادہ سے زیادہ ہمدردی یہ دکھائی تھی کہ اس پر سکور نوٹ فرما رہے تھے۔ ہم نے وہ کاغذ چپکے سے عرفی بھیا کو تھما دیا۔

ساتھ والے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی پکار پکار کر بجنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اٹھایا۔

"ہیلو . . . . جی کلب ہے . . . . ہاں جی بیٹھے ہیں . . . . . ہولڈ کریں . فون ادھر سے جاتا ہوں"

بیرا دروازہ کھول کر فون اٹھائے تار سنبھالتا اندر داخل ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کا فون ہے"

"لاؤ بھئی لاؤ . . . . . . یہ لیجئے جی کوئین" انہوں نے پتہ پھینکا۔ اور سر پتوں میں جھکائے۔ ہاتھ پھیلا کر فون پکڑنا چاہا۔

"ارے . . . . اف . . . . . ." وہ بے اختیار اچھلے۔ پتے چھوٹ کر دور جا پڑے۔

کیا ہوا؟ سب نے چونک کر دیکھا۔

ہوا وہی جو ہونا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا سر تو پتوں پر ہی جھکا تھا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر ہاتھ بیرے کی طرف پھیلا رہے تھے۔ جو ان کو دیکھنے کی بجائے تار سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بوریت دور کرنے کے لئے چھالیہ بھی چبا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی انگلیاں ٹیلیفون تک پہنچنے کی بجائے اس کے منہ میں گھس چلی گئیں۔ بیرے نے معذرت کے طور پر چھالیہ توڑ کر فوراً منہ بند کیا۔ تو دانتوں نے اپنی عملداری میں ڈاکٹر صاحب کو دست درازی کرتے دیکھ کر فوراً جکڑ لیا۔ چھالیہ کا قبل از وقت توڑنا ویسے بھی منہ کے لئے ہنگامی صورتِ حالات کا اعلان ہوتا ہے۔ اس لئے دانت ہمیشہ سپرنگ کی طرح کھٹ سے بند ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگلی کا ورد ڈاکٹر صاحب کے منہ سے نعرہ بن کر نکلا۔

"اندھے ہو۔ کیا دیکھتے نہیں ؟"

"یہ کیا موقعہ تھا منہ پھاڑنے کا" قریشی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے پارٹنر ہونے کی وجہ سے ڈانٹنا اپنا فرض سمجھا۔ حالانکہ وہ اس وقت صرف ڈمی پارٹنر تھے۔

"ہیلو۔ جی . . . . جی . . . . . . ہاں جی . . . . . تو اب کیا حالت ہے مریضہ کی . . . . . اچھا !! اچھا !!" انہوں نے ڈمی سے چال چلی اور اسلم صاحب کو اشارہ دیا کہ وہ پتہ پھینکیں۔ "اچھا تو کل شام لائے تھے آپ ؟؟ . . . . . . اوہو۔ میں اس وقت گھر پر موجود نہ تھا . . . ایک اور ضروری مریض دیکھنے گیا تھا . . . . . اچھا تو کیا بارش تھی . . . . میرا مطلب ہے۔ بارش تو تھی۔ کیا اس سے کچھ سردی لگ گئی ہے . . . . . . ممکن ہے . . . . . لیکن آپ فکر نہ کریں . . . . . . ہاں۔ ہاں دیکھ لیں گے۔ آپ فی الحال وہی دوائی پلوائیے . . . . ارے نہیں اب نہیں لائیے گا۔ میں ابھی ذرا سیالکوٹ جا رہا ہوں۔ بس نکلنے ہی والا تھا۔ کل شام لوٹوں گا۔ اس وقت مجھے حالت بتائیے گا . . . . . . جی . . . ٹھیک ہے . . . . نہیں بالکل فکر نہ کریں . . . . مرزا جی نے پان کا پتہ پھینکا تو ڈاکٹر صاحب ان کی طرف دیکھ کر بولے "یہ ہارٹ کیسے ہے . . . . . ہیلو! ہیلو! جی . . . . جی نہیں . . . . . نہیں تشویش کی بات نہیں۔ میں نے ہارٹ کے بارہ میں ویسے ہی پوچھ لیا تھا . . . . . "

اور ڈاکٹر صاحب نے جھٹ سے ٹیلیفون پٹخ دیا۔ "میں آپ سے ہارٹ کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ اور وہ مریضہ کے ہارٹ کا قصہ لے بیٹھے ہیں — چلیئے جی چال . . . . . . بہرحال کل شام تک تو بچا ڈسر گیا۔

اور پھر ڈاکٹر صاحب عرفی بھیا سے پوچھنے لگے۔

"کل شام بارش ہوئی تھی کیا ؟" "ہم لوگ تو یہاں بیٹھے برج کھیلتے رہے۔ باہر کا اندازہ ہی نہیں"

"بارش تو ہلکا سا لفظ ہے۔ وہ تو طوفان تھا . . . . . "

"اچھا !!" سب کھیلنے والے چونکے۔

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" مرزا جی نے تشویش سے پوچھا۔

"ہمارے گھروں میں تو کوئی نہیں ہوا۔ آپ گھر جائیں گے تو پتہ چلے گا۔" مرزا جی بے زاری سے بولے۔

"چھوڑو یار پتہ پھینکو۔" اسلم صاحب بولے "کوئی نقصان ہوا ہوتا۔ تو اب تک گھر سے پچاس قاصد آ چکے ہوتے۔ کوئی نہیں آیا۔ تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔ . . . . . اچھا تو بڈ گیا ہے۔"

ہم باہر آ گئے۔ لان میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بھیا کہنے لگے "پتہ چل گیا۔"

"کیا پتہ چل گیا؟" ہم نے پوچھا۔

"جنت میں رہتا تو انسان ہر وقت برج کھیلتا۔"

یہ کوئی پہلا موقعہ نہ تھا کہ ہم نے برج کھیلنے والے دیکھے تھے۔ اس سے پہلے بھی اکثر دیکھے تھے اور اکثر حیران ہوئے تھے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمیوں کو بہ قائمیٔ ہوش و حواس کیا ہو جاتا ہے۔ ہم نے تاش بنانے والوں سے پوچھا۔ تاش کھیلنے والوں سے پوچھا۔ تاش چرانے والوں سے پوچھا۔ سبھی کہتے ہیں کہ یہ کھیل ہے۔ اب ہم مانیں تو کیسے مانیں۔ نہ تو اس کھیل میں پسینہ آتا ہے۔ نہ سانس پھولتا ہے۔ اور نہ اس میں ہار جیت ہوتی ہے۔ کہ کھیلنے والے محض ہمیں بے وقوف بنانے کے لئے کہہ دیتے ہیں۔ کہ اس میں ہار جیت ہوتی ہے۔ اور اگر ہم اپنی فطری بھولے پن سے ان پر اعتبار کر لیں تو اور بات ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کون ہارا۔ اور کون جیتا۔ جب یہ نام نہاد کھیل ختم ہوتا ہے تو یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی سیٹیاں مارے۔ کسی کو کندھوں پر اٹھایا جائے۔ اور اس کا مقابل شرم سے سر جھکا کر چلے۔ اور اپنے ہارنے کے بارہ میں تاویلیں گھڑے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اٹھتے ہی سبھی ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں۔ غصہ آئے تو سب کو اکٹھا آتا ہے۔ خوش ہوں تو بھی اکٹھے۔ ہر ایک اپنے پارٹنر کو اتنا ہی برا بھلا کہتا ہے جتنا کہ اس کا پارٹنر اسے کہہ چکا ہے۔ یا مستقبل قریب میں کہنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور پھر کھیل تو دماغی شگفتگی کے لئے ہوتا ہے۔ تاکہ ذہن کو تھکاوٹ کے بعد ذرا سستانے کا موقع ملے۔ اور یہاں دماغ سوزی کی یہ حالت کہ گویا صبح ایم اے کا امتحان دینا ہے۔ اور پہلی دفعہ کتاب دیکھنے کو ملی ہے۔ یقین جانئے برج کھیلنے والے اگر اس سے آدھی توجہ بھی علم کی طرف کریں تو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں ان کے گھر کی لونڈیاں بن جائیں۔ بچپن میں ہمیں جو شخص گنجا نظر آتا تھا ہم کہتے تھے یقیناً پروفیسر ہے۔ علم کی سیم اور تھور بالوں کا صفایا کر گئی ہے۔ لیکن اب پتہ چلا ہے کہ ان گنجوں میں سے اکثریت برج کھیلنے والوں کی ہوتی ہے ــــ شاید اسی وجہ سے عورتیں برج کھیلنے سے احتراز کرتی ہیں

ویسے برج کھیلنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ این سعادت بزورِ بازو نیست۔ اسے نہ تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ ہر کوئی کھیل سکتا ہے۔ بلکہ کھلاڑی میں چند خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ اور یا پھر یہ کہ پرانے زمانے کی شاگردی کے معیار کے مطابق برج کھیلنے والوں کی چلمیں بھرتے بھرتے ان کا اخذ کرنا از حد ضروری ہے۔ ان کے بغیر وہ کبھی برج کا اچھا کھلاڑی نہیں بن سکتا ــــ اچھا تو خیر دور کی بات ہے۔ دوسرے سے کھلاڑی ہی نہیں بن سکتا۔

سب سے پہلی خصوصیت تو اس کھیل میں یقینِ محکم و عملِ پیہم ہے۔ کھلاڑی کا عقیدہ ہونا چاہئے کہ زیستن برائے برج است نہ کہ برج برائے زیستن اور یہ کہ جو آدمی برج نہیں کھیلتا۔ قطعاً نالائق آدمی ہے۔ جس کی پیدائش محض کسی تکلیف دہ حادثے کا نتیجہ تھی۔ اور اب اس کی اس دنیا میں موجودگی صرف برج کھیلنے والوں کی چشم پوشی کی وجہ سے ہے۔ ویسے تو اس بات کے ثبوت میں ہم آپ کو اتنے واقعات سنا سکتے ہیں۔ کہ اگر ان کی داستان مرتب کی جائے تو قصہ چہار درویش اور الف لیلہ جیسی طویل داستانیں بھی اس کے ایک باب میں سما جائیں۔ لیکن تازہ ترین ثبوت ہماری اس شہر میں تبدیلی تھی۔ پہلے روز ایک صاحب ملے جو اپنی مزے دار باتوں سے شہر کا تعارف کروا رہے تھے۔ اور بار بار زور دے رہے تھے کہ ہم کلب ضرور جایا کریں۔ ہم نے بھی کلب کے معاملے میں اشتیاق ظاہر

کیا تو کہنے لگے کہ شام کو جب دل چاہے میں انہیں فون کروں۔ اور وہ مجھے کلب لے چلیں گے۔ جب وہ اٹھ کر چلنے لگے تو پھر بولے۔ "دیکھئے شام کو بھول نہ جائیے گا۔ ضرور کلب چلیں گے۔ میں اس وقت تک نہ جاؤں گا۔ جب تک آپ کا فون نہ آئے گا۔ کیونکہ مجھے آپ کے بغیر مزہ نہیں آئے گا۔"

"ضرور۔ ضرور" ہم نے یقین دلایا۔ مجھے خود بڑا شوق ہے ...... اچھا خدا حافظ"۔ دروازے سے نکلنے لگے تو پھر مڑ کر پکارے۔

"تو شام ملاقات ہوگی پھر۔"

"انشاءاللہ" ہم نے دل ہی دل میں ان کی مہمان نوازی کے شکرگزار ہوتے ہوئے کہا

شام کو میں نہا چکا تو انہیں فون کیا۔ وہ چہک کر بولے۔

"ہلو۔ ہلو۔ میں تو فون کے انتظار میں ہی تھا۔ بس ابھی گاڑی لے کر آ رہا ہوں۔ ادھر سے ہی نکل چلیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ہم نے پوچھا" لیکن اگر ٹینس کا ارادہ ہے تو دوسرے کپڑے پہن لوں ......"

ان کی خاموشی سے ہم نے پھر پوچھا۔

"وہاں ٹینس ہوتی ہے نا۔"

"ٹینس ؟؟؟؟ ......" وہ بولے" ہاں !!! میرا خیال ہے ہوتی ہے .... ایک طرف نیلے پردے تو لگے ہوتے ہیں۔۔

لیکن میں نے کہا۔ آپ اس کا فکر نہ کریں۔ دوسرے کپڑے پہنیں۔ وہاں تو برج جمے گی۔"

"برج تو میں نے کبھی کھیلی ہی نہیں" ہم نے معذرت چاہی۔

"ارے رر" ٹیلیفون میں پٹاخہ سا چھوٹا۔" برج نہیں کھیلتے آپ ؟ ؟ میرا خیال تھا آپ کھیلتے ہیں۔"

"جی نہیں میں نہیں کھیلتا۔"

"لیکن ..... مجھے .... تو یقین تھا کہ آپ کھیلتے ہیں" ان کی آواز بڑی ڈھیلی تھی

"جی آپ کو غلط فہمی ہوئی تھی۔"

"اور ہوا میں تو سمجھا تھا کہ آپ کھیلتے ہیں" ٹیلیفون کے ریسیور سے ان کی مایوسی ٹپک رہی تھی۔" اچھا ..... تو .... پھر آپ تیار ہیں ... ڈرائیور ذرا گاڑی لے کر ٹھیک کروانے گیا ہے۔ شاید تھوڑی دیر میں آ جائے گا .... مجھے ڈر ہے کوئی زیادہ نقص نہ ہو ..... دیکھئے ... جیسے ہی وہ واپس آئے گا۔ میں آپ کو ٹیلیفون کر دوں گا۔"

گھنٹے بعد ٹیلیفون آیا کہ گاڑی میں نقص زیادہ تھا۔ اس لئے اسی شام کلب نہیں جا سکیں گے۔ اور ساتھ ہی انہوں نے فون رکھ دیا۔ ہمیں کسی چیز کا خیال آیا۔ پوچھنے کے لئے فوراً رنگ کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو گھر سے گھنٹہ پہلے کلب جا چکے ہیں۔

"گاڑی ٹھیک ہو چکی ہے کیا ؟"

"وہ تو ٹھیک ہی تھی۔" غالباً ان کی اہلیہ بول رہی تھیں۔" اس میں تو کوئی خرابی نہ تھی ..... "آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔"

"جی میں ورکشاپ کا مستری بول رہا ہوں۔" کہہ کر ہم نے ٹیلیفون پٹخ دیا۔

وہ شام انتہائی بوریت میں گذری اگلی شام ہم پھر ان کا انتظار کرتے رہے کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ایک شام کا بھولا اگر دوسری شام گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ لیکن ان کا نشان بھی نہ تھا۔ وہ شام بھی بڑی بیزاری سے کٹی۔ اگلی شام ہم خود ہی کلب چل دیئے۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بڑی عمدہ کلب تھی۔ بہترین ٹینس کورٹ، بلیرڈ روم، لاؤنج، بار، تیرنے کا تالاب وغیرہ بھی کچھ تھا۔ ہم اِدھر اُدھر گھومنے لگے کہ شاید کوئی شناسا نظر آجائے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ تو تین آدمیوں پر نظر پڑی جو میز کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے جیسے ہی ہمیں دیکھا "ارے آپ کہاں" کا نعرہ لگا کر بھاگا آیا۔

"جی میرا یہاں تبادلہ ہوگیا ہے" ہم نے انہیں پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"واہ۔ واہ۔ یہ تو بہت عمدہ ہوا" انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہمارے کندھے کی ہڈیاں اکھیڑ ڈالیں۔

"آیئے۔ آیئے۔ ان سے ملئے۔ یہ بخاری صاحب ہیں، اور یہ ملک صاحب ہیں . . . . بیٹھئے . . . . . . بیٹھئے"

"ہاؤڈو یوڈو"

"ہاؤڈو یوڈو"

"بیرا آآآ" ایک صاحب چلائے "چائے لاؤ"

اور پھر گھنٹی پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ ساری کلب گونج اٹھی۔ اور اس ہنگامے میں ہمارا تعارف کرانا بھول ہی گئے۔ حالانکہ ہم اس موقع کی انتظار میں تھے۔ کہ جب وہ ہمارا تعارف کروائیں گے اور اپنی گذشتہ واقفیت کے بارے میں کچھ کہیں گے۔ تو ہم پہچان سکیں گے۔ لیکن جب یہ موقع بھی ہاتھ نکل گیا۔ تو ہم سوچنے لگے کہ یہ کون صاحب ہیں۔ اوپر سے مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کر رہے تھے۔ اور اندر سے دماغ قلابازیاں لگا رہا تھا۔ کہ ان کو کہاں دیکھا ہے ؟ ؟ ؟ کالج میں ؟ یونیورسٹی میں ؟ کبھی ریلوے سفر میں ؟ ؟ ؟ ملازمت کے گذشتہ چند ماہ میں ؟ ؟ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ بہرحال ان پر یہ ظاہر کئے بغیر کہ پہچانا نہیں۔ ہم مخلص مخلص کر باتیں کرتے رہے۔ اور وہ ہم پر نثار ہوتے رہے۔ اتنی دیر میں میز پر کی بناوٹ سے ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کارڈ روم ہے۔ اس لئے تاشوں کی گڈی نظر آنے سے پہلے بھاگنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ صاحب اس طرح بچھے جا رہے ہیں کہ فرار کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کہنے لگے

"اچھا چائے تو آتی رہے گی۔ اتنی دیر میں ہو جائے ایک ربر"

وہ نہ معلوم کہاں سے تاش نکال کر پھینٹنے لگے۔ ان کی ہر پھینٹ کے ساتھ ہماری سٹی گم ہونے لگی۔

"معاف کیجئے گا۔ میں تو برج نہیں جانتا"

"ہی ہی ہی" وہ صاحب خوشامد سے ہنسے "بے فکر رہیئے یہ لوگ اتنے اناڑی نہیں ہیں کہ آپ ان سے کھیلنا پسند نہ کریں"

"استغفراللہ" ہم نے محجوب ہو کر کہا "میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی نہیں کھیلا"

"اجی کیوں بناتے ہیں۔ میں تو اس روز ملتان میں آپ کا کھیل دیکھ کر قائل ہو گیا تھا ——— کیا گیم تھی صاحب ——— مزہ آگیا !!!"

"غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو کبھی عمر میں ملتان نہیں گیا"

"ایں ؟ ؟ تو کیا آپ ڈپٹی ڈائریکٹر انیمل ہزبینڈری نہیں ہیں"

"جی انیمل تو میں کبھی بھی نہ تھا۔ اور نہ بنا ابھی بنا نہیں ہوں"

وہ حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پتے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑے۔

"تو پھر آپ کون ہیں ؟"

"میں بہرحال وہ نہیں ہوں، جو آپ سمجھ رہے ہیں"

انہوں نے سخت مایوسی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اور ڈھیلے ہاتھ سے پتے ملا دیئے۔ پھر بڑے سست انداز میں پھینٹنے لگے۔ ان کے چہرے پر "کس احمق سے پالا پڑ گیا ہے" والی بیزاری تھی۔

اس وقت بیرا چائے لے کر آ گیا۔ اور انہوں نے بڑی بے دلی سے چائے بنانی شروع کی۔ باقی تو سب سے پوچھا کہ کتنا دودھ اور کتنی کھانڈ۔ لیکن ہماری پیالی میں شکر سرے سے ڈالی ہی نہیں۔ اور دودھ جتنا بچا۔ سب انڈیل دیا۔ پھر ایک چسکی لگا کر مجبوری سے بولے۔

"آؤ بھئی پھر ہم تینوں کٹ تھروٹ ہی کھیلتے ہیں"

چنانچہ وہ مجبوراً کٹ تھروٹ کھیلنے لگے۔ اور ہم مجبوراً تماشائی بن گئے۔ دو ایک دفعہ ہم نے کسی چال پر رائے زنی کی۔ تو تینوں نے ہماری طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے کوئی ہائی کلاس ڈینٹسٹ کسی دانت کا منجن بیچنے والے کو دیکھتا ہے۔ ہم نے کوئی اِدھر اُدھر کی بات کی تو انہوں نے ہوں ہاں میں ٹال دیا۔ یا جواب ہی نہ دیا۔ اور پھر جب ہم نے اٹھتے ہوئے معذرت چاہی۔ تو اُن کے کھلے ہوئے چہرے سے پھر کبھی ملنے کا اشتیاق ظاہر کئے بغیر الفاظ تو خدا حافظ کے نکلے لیکن لہجہ نے کم بہاں پاک ڈالا تھا۔

اس دن کے بعد ہم تو کبھی کارڈ روم میں گئے نہیں۔ لیکن اگر کبھی کلب کے دوسرے حصے میں بھی ان سے اتفاقیہ ملاقات ہو جاتی تو وہ آنکھ ملائے بغیر عجب بے زاری سے سلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔

دوسری خصوصیت جس کے بغیر برج کا اچھا کھلاڑی نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ ہے کہ آپ کی یادداشت بہت اچھی ہو۔ آپ بالکل الیکٹرانک برین ہوں یہ شرط اس لئے ضروری نہیں کہ برج کھیلنے کے دوران میں آپ یہ یاد رکھ سکیں کہ کون کون سے پتے نکل گئے ہیں۔ بلکہ اس کے استعمال کی ضرورت اس وقت پڑے گی۔ جب آپ برج نہیں کھیل رہے ہوں گے۔ اور آپ کا ذہن اس وقت جتنا اچھا کام کرے گا۔ اتنے ہی بڑے کھلاڑی آپ سمجھے جائیں گے۔ ممکن ہے۔ ہماری اس بات کو آپ دشمن کی ہوائی پر محمول کریں۔ اس لئے ثبوت میں متعدد واقعات میں سے ایک پیش کرتے ہیں۔

آپ کا مشاہدہ بھی یقیناً یہی ہو گا کہ ہماری ریلوے کی گاڑیاں مین لائن پر تو ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ لیکن برانچ لائن پر بڑی بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ اور چونکہ برانچ لائن پر جب بھی سفر کیا۔ گاڑی لیٹ ہونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اس لئے ہم اس کا بدلہ یوں لیا کرتے ہیں کہ مین لائن پر جب سفر کرنا ہو تو ہم لیٹ ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ اس انتقامی وضعداری کے مارے ہوئے جب لاہور سٹیشن میں داخل ہوئے تو یہ وہ وقت تھا۔ جب ہاتھ ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ قلی آخری دفعہ ایک دو آنے کے لئے جھگڑتے ہیں۔ اور گارڈ سبز جھنڈی کو ٹانگوں تک غوطہ دے کر لپک کر گھسٹتی ہوئی گاڑی میں پھلانگ جاتا ہے۔ ہمارے سامنے سے قریباً آخری ڈبہ گزر رہا تھا۔ ہم اس کے دروازے کا رخ کر کے بھاگے۔ گیٹ میں ایک صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری ہمت بندھائی اور ہم چڑھنے ہی والے تھے کہ ایک صاحب "ہلو اشرف" کہتے ہوئے لپکے اور گیٹ میں کھڑے ہوئے والے صاحب سے باتیں کرتے ہوئے گاڑی کے ساتھ اس طرح چلنے لگے کہ ہمارے بالکل آگے آ گئے اور ہم ڈبے میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔

"ہلو اشرف۔ کب واپس آ رہے ہو؟"

"اگلے ہفتے کی شام کو"

"اچھا تو میں انتظار کروں گا"

گاڑی کی رفتار تیز ہونے پر انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

"میں اتوار کے ساتھ ایک آدھ چھٹی بھی لے لوں گا۔ تم پارٹنر تیار رکھنا۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ برج کا مزہ تبھی آئے گا۔ اس روز دیکھوں گا۔ تمہارے پاس اچھے پتے کیسے جاتے ہیں۔"

اب وہ باقاعدہ دفتر ہے تھے۔ اور ہم بھی بھاگتے ہوئے کبھی ان کی ایک بغل اور کبھی دوسری میں سے راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ارے ہم تو منٹ راؤنڈ زوالے کھلاڑی ہیں۔" اوپر والے صاحب منہ اٹھا کر قہقہہ لگانے لگے۔

بدحواسی میں اچانک ہمیں پتہ چلا کہ پلیٹ فارم ختم ہونے والا ہے۔ اور ہم آخری کوشش کرتے ہوئے انہیں دھکا دے کر لپک کر چڑھ گئے۔ وہ صاحب ٹھٹھک کر گاڑی کے نیچے گرنے کو تھے کہ اوپر والے دوست نے بازو پکڑ کر گاڑی میں کھینچ لیا۔ عین اس وقت پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔

"ارے مجھے تو نہیں جانا۔ . . . . میری بیوی سٹیشن کے باہر کار میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے۔" وہ چلائے۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ بور نہیں ہوں گی۔ آپ کی کار میں برج کھیلنے کا انتظام تو یقیناً ہو گا۔" ہم نے اپنے اکھڑے ہوئے سانس کو درست کرتے ہوئے۔ کہہ ڈالا۔

"بھئی عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ مجھے کیوں گھسیٹ لائے۔"

"دیکھئے صاحب جس طرح آپ میرے ساتھ تھمی ہوئے تھے۔ اس سے یا تو ہم دونوں گاڑی سے رہ جاتے یا دونوں چڑھ جاتے۔ آپ کے لئے تو کوئی بات نہیں۔ کیونکہ آپ کی بیوی انتظار کر رہی ہیں۔ لیکن اگر میں رہ جاتا تو قیامت آ جاتی۔ کیونکہ میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ اور میرا افسر انتظار کر رہا ہے۔"

"کوئی بات کیسے نہیں۔" انہوں نے ایسے جھنجلا کر کہا۔ جیسے بیوی کے عتاب کے مقابلے میں افسر کا عتاب معمولی سی چیز ہے۔ "یہ تیز گام تو اب منٹگمری سے پہلے رکے گی نہیں۔"

"تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ منٹگمری تک دل کھول کر برج کی باتیں کریں۔" کہتے ہوئے موضوع ختم کر کے ہم ٹائلیٹ میں گھس گئے۔

تھوڑی دیر بعد جب باہر نکلے تو وہ واقعی برج کی باتیں کر رہے تھے۔

"میرا ہینڈ بہت سٹرانگ تھا۔ بھلا میں اس میں کیسے پٹ سکتا تھا۔"

"پٹ تو سکتے تھے۔ اگر میرا پارٹنر وہ غلطی نہ کرتا۔"

"کونسی بھلا؟ ہاں وہ۔ تو میاں وہ تو جتنا برج جانتا ہے اس کے مطابق ٹھیک ہی کھیل رہا تھا۔"

"ٹھیک کیسے! اسے اس وقت سپیڈ کی کوئین چلنی چاہیئے تھی۔ اور وہ چل دیا ڈائمنڈ کا ایس۔ ساری گیم کا ہی ستیاناس ہو گیا تھا۔"

"سپیڈ کی کوئین چھوڑ اس کا باپ بھی آ جاتا تو کوئی فرق نہ تھا۔ کیونکہ میں سپیڈ میں کٹ تھا۔"

"کٹ تھے تو کیا ہوا۔ تمہارے پاس ترپ کا ایک ہی تو پتہ تھا۔ اور وہ تم نے ترپ کے بادشاہ کے لئے رکھا تھا۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔ میں اسے رد کر کے رکھتا۔"

"تمہیں روکنا چاہیئے تھا۔ ڈمی میں سپیڈ تھا ہی نہیں۔ وہاں تو اس وقت ڈائمنڈ کے نور۔ سکس اور ٹو تھے۔ کلب کا جیک تھا۔ اور ہارٹ کا تھری نائن اور ٹن تھے۔ اب اس سے تم کیا کھیل سکتے تھے۔"

"اور تمہیں کیا پتہ کہ میرے پاس سپیڈ کے جیک کے علاوہ ہارٹ کا ایس، کوئین، ڈائمنڈ کا کنگ اور کلب کا جیک تھے۔"

"تو پھر بڑے نکمے ہو۔ بھلا اس سے پہلی سر میں رکی چلنے میں کیا تک تھی۔ سیدھی طرح جیک چل جاتے۔ یہ تو تم بڑی غلطی کر گئے۔"

"واہ غلطی کیسے۔ طریقے سے کھیلا جائے تو بھلا برج میں غلطی کیسے ہو سکتی ہے۔ میری دراصل پلان دوسری تھی۔ تم اسے سمجھے ہی نہیں۔"

"تو بھلا وہ برج کیا کھیلے گا۔ جو دوسرے کی پلان نہ سمجھے۔ وہ تمہاری غلطی تھی۔"

"نہیں پارٹنر غلطی نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تو اس سے پہلے والے ربر کی تیسری گیم میں جب میں حکم کی چلا تھا۔ تم اسے بھی غلطی کہتے تھے۔"

"ہاں وہ سراسر غلطی تھی۔ تمہیں اس وقت ایس کھیلنا چاہیئے تھا۔"

"اور آخری ربر کی پہلی گیم میں تم نے جو ایس کھیلا تھا۔ بالکل ویسی ہی حالت میں تو کیوں پٹ گئے تھے۔"

"وہ تو اس لئے کہ میرے پارٹنر نے ٹھیک سپورٹ نہیں کیا۔ میں نے ٹو ہارٹس بڈ کیا۔ تو اس نے فور ڈائمنڈ کہہ ڈالا۔ میں سمجھا۔ ڈائمنڈ میں سٹرانگ ہے تو میں نے فور نو ٹرمپ کہہ ڈالا۔ اور اس وقت وہ میری بڈ ہی نہ سمجھا۔ اور فائیو سپیڈ کہہ ڈالا۔ اب میں کیا کرتا۔"

ہم بیٹھے سنتے رہے آخری ربر کی باتیں۔ اس سے پہلے ربر کی باتیں۔ دوسرے ربر کی تیسری گیم کی باتیں۔ پہلے ربر کی دوسری گیم کے تیسرے ہینڈ کی باتیں اور ہم بیٹھے حیران ہوتے رہے کہ ان لوگوں کی یادداشت کس غضب کی ہے۔ کہ ایک ایک پتہ یاد ہے۔ تاش کے باون پتے ہوتے ہیں۔ اور یہ تو کوئی سو ہینڈز کیسے ہوں گے۔ اس لئے انہیں باون سو پتے اپنی صحیح پوزیشن میں یاد ہیں۔ ہم ششدر تھے۔

منٹگمری آیا تو ہیری والے صاحب مسافر کھلاڑی سے پھر دوبارہ وعدہ لیتے ہوئے اتر گئے۔ اور پھر گاڑی چل دی۔ ہم اپنے ہمسفر سے باتیں کرتے رہے تھوڑی دیر بعد انہوں نے زور سے جمائی لی۔ اور بولے "نیند آرہی ہے۔ کل رات سویا بہت کم ہوں۔"

"ہاں آپ تو برج کھیلتے رہے ہوں گے۔"

"کیا برج !؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں تو۔ وہ تو میں مہینہ بھر سے کھیل ہی نہیں سکا۔"

"اور یہ جو آپ باتیں کر رہے تھے۔ یہ کل رات کی نہیں تھیں" ہم نے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں صاحب یہ تو کافی عرصہ پہلے کی تھی۔ ان صاحب نے دعوت کی تھی۔ وہاں برج کھیلا تھا۔ اب کیا ہے ستمبر ہے نا۔ تو اگست، جولائی جون۔ ہاں ہاں غالباً اپریل کے مہینے میں ان کے ساتھ کھیلا تھا۔"

یہ اور اس قسم کے کئی واقعات ایسے ہیں۔ جن سے برج کھیلنے والوں کی حیرت انگیز یادداشت کے بارے میں انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں برج جاننے والے نہ صرف دو تین سال پرانی چالیں یاد رکھتے ہیں۔ بلکہ ہم نے اکثر لوگوں کو ان کے بچپن کے بارہ میں بات چیت کرتے دیکھا ہے۔ سائیکالوجی کی ماڈرن تھیوری یہ کہتی ہے کہ انسان کی شخصیت پیدائش کے بعد سے بننا شروع نہیں ہوتی۔ بلکہ بچہ جو زمانہ ماں کے پیٹ میں گذارتا ہے۔ اس وقت بھی اس کی شخصیت کے بنیادی خاکے بن رہے ہوتے ہیں۔ اور ارد گرد کے حالات اس کے جنم سے پہلے بھی اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں بالکل تعجب نہ ہوگا۔ اگر کوئی صاحب کسی روز برج کے ان ہینڈز کا تذکرہ شروع کر دیں۔ جب ان کی والدہ محترمہ ان کی پیدائش سے دو چار ماہ قبل یا تو برج کھیل رہی تھیں۔ یا دیکھ رہی تھیں۔ واضح رہے کہ یادداشت کے بارہ میں ہم یہ بات صرف برج کے موضوع کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ برج کھیلنے والوں کی یادداشت کو ہم کسی اور میدان میں پرکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ ابھی تک ہم نے کسی برج کھیلنے والے کو برج کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات چیت کرتے نہ تو سنا ہے اور نہ دیکھا ہے۔

احباب کا اصرار ہے کہ برج ضرور کھیلو۔ بڑی سوشل گیم ہے۔ جو نہیں کھیلتا وہ سوسائٹی میں نکو سمجھا جاتا ہے۔ ہم انہیں بار بار کہتے ہیں کہ بھائی ہم اتنے

سوشل نہیں کہ ہر اچھی یا بری چیز بطور فیشن کے اس لئے اندھا دھند کرنا شروع کر دیں کہ باقی لوگ ایسے کرتے ہیں۔ لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں۔ سوسائٹی کا تقاضا ہے کہ برج ضرور کھیلو۔ اب یہ سوسائٹی کم بخت بھی تو عورت کے مزاج کی طرح ہے لاکھ خوش کرو۔ ہوتی ہی نہیں۔ جیسے سوسائٹی نے ہم سے کہا کہ کھلی پتلونیں پہنو۔ تو ہم نے پائنچے اتنے بڑھا لیے کہ ہماری پتلونوں سے جاٹ دھوتیاں شرمانے لگے۔ پھر سوسائٹی نے کہا کہ اب پتلونیں تنگ پہنو۔ تو ہم نے اتنی تنگ کر دیں کہ کمر کے نیچے کا گداز حصہ جو اگر بڑا ہو تو بیٹھنے میں آسانی رہتی ہے۔ بالکل سکڑ کر رہ گیا۔ پھر سوسائٹی نے تقاضا کیا کہ سویٹر کا گلا اتنا اونچا رکھو کہ کالر اس میں چھپ جائے۔ ہم نے سر تسلیم یہاں تک خم کیا کہ گردن پر ہر وقت مرچیں کاٹتی رہیں۔ پھر سوسائٹی نے کہا کہ تنگ ٹو کے اٹالین جوتے پہنو۔ اب مسلسل استعمال کے بعد حالت یہ ہے کہ جوتا اتارتے ہیں تو اندر سے پاؤں کی بجائے گاجر نکلتی ہے۔ اب سوسائٹی کہتی ہے کہ برج کھیلو۔ یعنی وہ سب کچھ کرو۔ جو ہم اس مضمون کے پہلے حصے میں درج کر چکے ہیں۔ اب سوسائٹی کے باقی تقاضوں کی طرف توجہ دینے کی فرصت کس کافر کو ملے گی۔ خود ہی ذبح بھی کرے اور خود ہی لے الٹا ثواب۔ اکثر جی میں آتا ہے۔ سوسائٹی سے دو دو باتیں کریں بس مناسب گھڑی کا انتظار ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ بشرطیکہ برج کھیلنے والوں نے برج نہ کھیلنے والوں کو زندہ رہنے دیا۔

زاں بادہ دیرینہ دہقاں پرورد
در دہ کہ بساطِ عمر طے خواہم کرد
مستم کن و بے خبر ز احوالِ وطن
تا سرِ جہاں بگویمت اے سرہ مرد

حافظ شیرازی

رضیہ فصیح احمد

بولتے گونگے

کردار

زرینہ

شہاب

انور

اماں

گل زماں

خاں صاحب

بیرا

منظر (ایک کمرہ جس میں معمولی ساز و سامان ہے۔ درمیان میں ایک چارپائی پر بستر بچھا ہوا ہے جس کے نیچے ایک پرانا سوٹ کیس پڑا ہے۔ دائیں طرف ایک میز اور کرسی ہے۔ دیوار پر ایک کیلنڈر ہے۔ بائیں طرف دوسری میز ہے جس پر شیو کا سامان پڑا ہے۔ نزدیک کرسی ہے۔ کمرے کی پچھلی دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ ایک کھونٹی پر چند کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ شہاب بائیں طرف والی میز کے نزدیک کرسی پر بیٹھا شیو بنا رہا ہے۔ اور آئینہ میں دیکھ دیکھ کر گا رہا ہے۔)

تصور مری دل ذرا بہلا نہ سکے گی

تو بات کرے گی تو یہ خاموش رہے گی سینے سے لگائے گی تو یہ کچھ نہ کہے گی

(زرینہ خوب سجی بنی داخل ہوتی ہے۔ نیل پالش کی شیشی ہاتھ میں ہے۔ ایک خوبصورت سا پرس جھلاتی آ رہی ہے)

زرینہ: بھائی جان!

شہاب: (اپنے گانے میں مگن زرینہ کی نہیں سنتا۔ آئنہ کی طرف اشارہ کرکے) یہ آنکھیں ہیں ٹھہری ہوئی۔
(اپنی آنکھیں گھما کر) چنچل یہ نگاہیں۔
(آئنہ کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہاتھ ہیں سہمے ہوئے،
(اپنے بازو کی مچھلیاں پھلا کر) اور مست یہ باہیں۔

زرینہ : بھائی جان!

شہاب : (ترنگ میں آکر) تصویر یہ مری دل ترا .... (اچانک زرینہ کو دیکھتا ہے)

اوہ! کہاں سے مارا یہ زوردار سوٹ ؟

زرینہ : عائشہ نے بھیجا ہے - یہ زیور اور یہ پرس بھی - اور یہ بھی (شیشی دکھاتی ہے) اب آپ بھی تیار ہو جائیے نا - چار بجے ان کا نوکر لینے آجائے گا!

شہاب : تیار کیا خاک ہو جاؤں - (تولیہ سے منہ پونچھتا ہے) عادل کے بچے نے سوٹ ہی نہیں بھیجا ابھی تک - صبح سے تین دفعہ شیو بنا چکا ہوں اور کیا کیا دوں ——

(زرینہ کرسی پر بیٹھ کر ناخنوں پر پالش لگاتی ہے - شہاب اس کے قریب آتا ہے) اچھا یہ تو بتاؤ، آج جنہیں ہم دیکھنے جا رہے ہیں وہ کون سی صاحبزادی ہیں - وہ ... جن کے بال بلبے ہیں اور باپ انڈر سیکرٹری یا وہ ریسیکرٹری میں سے کوئی چیز ہیں ؟

زرینہ : (ہاتھ روک کر) آپ کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا - جس کے بال لمبے اور قد چھوٹا ہے وہ تو پروفیسر کی لڑکی ہے - انڈر سیکرٹری کی لڑکی کے بال تو کٹے ہوئے ہیں -

شہاب : ہاں ، تو اس میں کیا عیب تھا ؟

زرینہ : (کھڑی ہو کر) بتایا تو تھا کہ ذرا (ہاتھ سے اشارہ کرکے) موٹی ہے -

شہاب : اور وہ سیٹھ قیوم کی صاحب زادی ؟

زرینہ : (انگلی سے اشارہ کرکے) وہ بالکل یوں ہے ، اچھدر -

شہاب : اور جن کے ہاں تم کل گئی تھیں ؟

زرینہ : وہ ہے تو بہت خوبصورت ، گھرانا بھی اچھا ہے لیکن ...... ذرا ناک ٹیڑھی ہے -

شہاب : (تعجب سے) کس کی ، گھرانے کی یا لڑکی کی ؟

زرینہ : لڑکی کی بھئی لڑکی کی -

شہاب : (ایک قدم آگے بڑھاکر) یہ آج نئی بات سنی - ٹیڑھی ناک کیسی ہوتی ہے ؟

زرینہ : یہ بھی خوب رہی ٹیڑھی ناک ٹیڑھی ہوتی ہے اور کیسی ہوتی ہے ؟

شہاب : مثلاً ہمارے خاندان میں کسی کی ہے ؟

زرینہ : (نفی میں سر ہلاکر) اوں ہوں

شہاب : ہمارے دوستوں میں سے کسی کی ؟

زرینہ : اوں ہوں!

شہاب : آنے جانے والوں میں ؟

زرینہ : ارے بھئی نہیں - کسی دن دیکھوں گی تو بتا دوں گی -

شہاب : (میز کی طرف جاتا ہے۔ ٹھنڈا سانس لے کر) وہ خوش نصیب دن جانے کب آئے گا جس دن ٹیڑھی ناک کی زیارت نصیب ہو گی۔ وہ بھی اصل ناک کی نہیں اس سے ملتی جلتی ناک کی۔

زرینہ : تو آپ ٹیڑھی ناک دیکھنے کو اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہیں ؟

شہاب : ظاہر ہے بھئی ہر نئی چیز کو دیکھنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کیوں نہ امی لڑکی کے لئے منظوری دے دوں۔ ٹیڑھی ناک تو دیکھنے کو ملے گی۔

زرینہ : توبہ! ٹیڑھی ناک نہ ہوئی قطب مینار ہو گئی جسے دیکھنے کو طبیعت مچل رہی ہے۔

شہاب : (نزدیک جا کر رازداری سے) اچھا، ایک بات تو بتاؤ۔ ٹیڑھی ناک کیا بُری معلوم ہوتی ہے ؟

زرینہ : (چڑ کر) تو کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو ٹیڑھی ناک ایسی نظر آتی ہے جیسے ٹیڑھی لکیر۔

شہاب : مجھے تو ٹیڑھی لکیر میں بھی کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔

زرینہ : آپ کا کیا ہے جناب۔ آپ تو کہہ دیں گے مجھے لنگڑا آدمی بھی بڑا اسمارٹ نظر آتا ہے۔

شہاب : ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کون سی صاحب زادی ہیں جن کو دیکھنے جا رہے ہیں۔

زرینہ : یہ ان میں سے ہیں ہی نہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس لڑکی کے بارے میں ایک سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔ اسی کے ہاتھ میں نے آپ کی تصویر بھجوا دی تھی۔ آج انہوں نے ہمیں بلوایا ہے۔

شہاب : تو پہلے تم دیکھ آؤ ما بدولت بعد میں جائیں گے۔

زرینہ : وہ چاہتے ہیں کہ سب آئیں تاکہ ہم لڑکی کو دیکھ لیں وہ آپ کو دیکھ لیں۔

شہاب : بات معقول ہے۔ ... (پلنگ کے نیچے سوٹ کیس میں سے موزے نکال کر پلنگ پر بیٹھ کر پہنتا ہے) امی تیار ہو گئیں ؟

زرینہ : امی کہہ رہی ہیں میرے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔

شہاب : اچھا ہی ہے وہ نہ جائیں، ورنہ پہلے کی طرح بنی بنائی بات بگاڑ دیں گی۔

زرینہ : یوں تو مشکل ہے۔ امی ذرا بھی تو بات نہیں بنا سکتیں۔ میں نے کہا تھا بھائی جان چوٹی کے وکیلوں میں سے ہیں۔ خوب آمدنی ہو جاتی ہے۔ انہوں نے امی سے پوچھا تو کہنے لگیں۔ وکالت تو ان سے چلتی نہیں۔ دفتر میں کلرک ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے مل جاتے ہیں۔

شہاب : حد کر دی امی نے ...... یہ بھی تو نہیں سوچتیں ڈیڑھ سو روپوں سے سر مارنے کو کون اپنی لڑکی دے گا۔

زرینہ : امی کہتی ہیں اپنے برابر یا کمتر گھرانے میں لڑکی دیکھو تو بہتیرے بیٹی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

شہاب : (جوتے پہنتے ہوئے) امی پرانے زمانے کی ہیں۔ یہ نہیں جانتیں کہ آج کل شادیوں سے بھی زندگیاں بن جاتی ہیں۔ سرفراز کو نہیں دیکھتیں۔ معمولی کلرک تھا۔ سیٹھ صاحب کی لڑکی سے شادی کر کے لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ بھئی ہاتھ مارو تو ایسی جگہ۔ یہ کیا کہ جھونپڑی میں سے لڑکی اٹھا کر گھر میں ڈال لی۔ جیسے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا اور دھیرے دھیرے رو رہے ہیں۔ کیا شعر ہے وہ ؎

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
اے کاش جانانہ تری رہگذر کو میں

زرینہ: (ہنس کر) ٹھیک شعر پڑھنے کی تو آپ نے قسم کھا رکھی ہے —— میں کہتی ہوں آپ فکر نہ کریں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ آج کل TACT کے بغیر ذرا سا کام نہیں ہو سکتا۔ میں تو سب کچھ سنبھال لوں۔ امّی ہی بات بگاڑ دیتی ہیں۔ آج ہی کہہ رہی تھیں اگر بڑا گھرانا ہی چاہتی ہو تو خوبصورتی اور تعلیم پہ نہ جاؤ۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی لکھ پتی اپنی گل فام ایم۔ اے بیٹی تمہارے بھیا کے پلّے باندھ دے۔

شہاب: (سوچتے ہوئے) بات تو امّی کچھ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔

زرینہ: دنیا میں سب کچھ ہو تا ہے بھائی جان۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لکھ پتیوں کی گلفام ایم۔ اے بیٹیاں معمولی گھرانوں میں آئی ہیں۔ وہی سرفراز کی مثال سامنے ہے۔

شہاب: (حسرت سے) مگر بھئی وہ تو LOVE MARRIAGE تھی۔ لڑکی نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں سرفراز کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ ایسی کوئی لڑکی ہمیں نہیں ملتی۔ الٹا دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ (آئینہ اٹھا کر غور سے شکل دیکھتا ہے)

زرینہ: اسے آپ دیکھتے جائیے۔ مگر جب کوئی سونے کی چڑیا پھنس جائے تو اس غریب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر نہ پھینک دیجئے گا۔

شہاب: ارے واہ! پھر تو میں اپنی بہن کی شادی کسی (منہ پھاڑ کر) بہت بڑے افسر سے کر دوں گا۔ اس ٹھاٹھ سے اس ٹھاٹھ سے کہ دنیا دیکھتی رہ جائے۔

زرینہ: (شرما کر) ہٹائیے۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔

(دروازے پہ دستک)

شہاب: لو وہ سوٹ آ گیا (چہک کر) میں تو یوں تیار رہا بس (سوٹ لے کر آتا ہے۔ آئینہ میں دیکھ کر ٹائی باندھتا ہے اور گاتا ہے):

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا   ہم تو آتے تھے مگر سوٹ ہی تیار نہ تھا

(پردہ)

دوسرا منظر

(خاں صاحب کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم۔ خوبصورتی سے آراستہ ہے۔ عمدہ قالین۔ عمدہ سیٹ۔ پردے، تصاویر اور سجاوٹ کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف ریڈیوگرام اور ٹیپ ریکارڈر بھی رکھا ہے۔ پردہ اٹھتا ہے تو اماں اور انور ڈرائنگ روم کی چیزوں کو حیرت سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔ انور مضحکہ خیز انداز میں ہر چیز کو چھو چھو کر دیکھ رہا ہے۔ ریڈیوگرام اور ٹیپ ریکارڈر کے پاس پہنچ کر ان چیزوں کو کبھی اوپر سے اور کبھی اطراف سے دیکھتا ہے۔)

انور: بیرا —— (ایک بیرا وردی میں ملبوس آتا ہے) (کھنکار کر) کیوں میاں اس کو کیا کہتے ہیں؟

بیرا: ریڈیوگرام!

انور: (اشارہ کر کے) اور اس کو؟

بیرا: ٹیپ ریکارڈر۔

انور: اچھا جاؤ چائے کا سامان درست کرو۔ (بیرا دونوں کی نظر بچا کر مسکراتا ہوا جاتا ہے۔ انور اشارہ کر کے یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے)

ٹیپ ریکارڈر، ریڈیوگرام ۔ ٹیپ ریکارڈر، ریڈیوگرام !

امّاں : انور! میں نے کہا، شنّو کو دیکھنے والوں کو تم خاں صاحب کی کوٹھی میں بلا تو رہے ہو ۔ مگر یہ بات کب تک چھپی رہے گی ؟

انور : (صوفہ کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا ہے) جب تک بات بن جائے گی یا کم از کم بن پڑے گا ۔

امّاں : پھر جب یہ بات کھل گئی کہ یہ کوٹھی ہماری نہیں ہے تو ......

انور : تو کیا ــــ ہزاروں باتیں انسان کہہ سکتا ہے ، مثلاً ہم نے کوٹھی بیچ ڈالی ۔

امّاں : لو اور سنو ، کوٹھی بیچ ڈالی اور خود ایک جھونپڑیا میں رہنا شروع کر دیا ۔

انور : (پریشان کر) اگر آپ ایسا نہیں کریں گی تو شنّو کی شادی قیامت تک نہیں ہوگی ۔ یاد ہے پچھلی مرتبہ جو عورتیں آئی تھیں انھوں نے گھر کی چیزوں اور بے رنگی پیالیوں کو دیکھتے ہی جانے کی ٹھان لی تھی ۔ شنّو کو دیکھا بھی نہیں تھا ۔

امّاں : (ڈرتے ڈرتے صوفے پر بیٹھتی ہیں) وہ دونوں نگوڑ ماریاں تو یوں منہ بنائے ، ناک سکیڑے بیٹھی رہیں جیسے کسی اصطبل میں بیٹھی ہوں ۔ نہ کوئی چیز چکھی ، نہ چائے پی ۔

انور : (جوش سے) ــــ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اس اصطبل نما گھر کو اور ساز و سامان کو دیکھ کر کوئی شادی نہیں کرے گا وہ ۔ بس آپ ایک مرتبہ ان کو اس گھر میں آنے تو دیجئے ۔ باقی میں سب ٹھیک کر لوں گا ۔

امّاں : خاں صاحب تو بڑے بد دماغ آدمی ہیں ۔ وہ اپنا گھر کھلا چھوڑنے پر راضی کیسے ہو گئے ؟

انور : گھر تو وہ ہمیشہ نوکروں پر ہی کھلا چھوڑ کر جاتے ہیں ۔ میں نے ان سے بات کی کہ ہم صرف آدھ گھنٹے کے لئے اپنے مہمانوں کو ان کے ہاں بٹھائیں گے ۔ وہ راضی ہو گئے ۔ آدھ گھنٹے ہی کی تو بات ہے ۔ ہم کوئی چیز اٹھا کر بھاگے تو نہیں جا رہے ، ان کے نوکر گھر میں موجود ہیں ۔

امّاں : مگر بعد میں لڑکے والوں کو ہماری حیثیت کا پتہ چل گیا تو ــــ

انور : (بات کاٹ کر) آپ نے پھر وہی بات کی ۔ میں کہتا ہوں آپ انہیں آنے تو دیجئے ۔ کم از کم یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ گھر اور ظاہری ساز و سامان سے کچھ فرق پڑتا ہے یا نہیں ۔

امّاں : تم جانو بھئی ــــ خدا وہ نیک گھڑی لائے کہ شنّو کے ہاتھ پیلے ہوں ــــ اے ہاں ، شنّو کہہ رہی تھی میں ان لوگوں کے سامنے نہیں آؤں گی ۔

انور : (غصّے میں ہیر پٹخ کر) یہ کیا جہالت ہے ۔ میں کہاں تک ایک ایک کو سمجھاتا پھروں ۔ اس سے کہہ دیجئے سب اسی کمرے میں بیٹھیں گے ۔

امّاں : (پریشان ہو کر) تو کیا میں نگوڑ ماری بھی یہیں بیٹھوں گی ۔

انور : اور کیا ؟

امّاں : نہ بھئی مجھ سے نہ بیٹھا جائے گا نامحرموں میں ۔

انور : (ماں کی طرف آ کر) امّاں آپ سمجھتی کیوں نہیں ۔ آج کل لڑکے لڑکی کو دیکھے بغیر شادی پر راضی نہیں ہوتے ۔

امّاں : (پریشان کر) اے بھاڑ میں جائیں ایسے لڑکے ۔

انور: تو شنو کی شادی نہیں ہوگی کہے دیتا ہوں۔

(دروازے دستک ہوتی ہے)۔

بیرا: آپ کے مہمان آئے ہیں۔

انور: بلاؤ ــــــ (انور ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو گرام کا سبق دہراتا ہے۔ اماں اٹھ کر اندر جانے لگتی ہیں۔) وہ آگئے۔ اماں آپ بیٹھ جائیے دیکھئے۔

(اماں تنگ آکر پریشان سی صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ انور دروازے تک جاتا ہے۔ شہاب اور زرینہ داخل ہوتے ہیں) آئیے آئیے۔

شہاب: السلامُ علیکم! مجھے شہاب کہتے ہیں۔ یہ میری بہن زرینہ ہیں۔

(دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ انور زرینہ کو سلام کرتا ہے اور دونوں کو ماں کے پاس لاتا ہے)

انور: آپ میری والدہ ہیں۔ (شہاب اور زرینہ سلام کرتے ہیں۔)

اماں: جیتے رہو، بیٹھو!

انور: تشریف رکھیئے ــ (سب بیٹھ جاتے ہیں۔ خاموشی۔ چاروں بے تکے پن سے کمرے کو دیکھ رہے ہیں۔) آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

شہاب: مجھے بھی ۔۔۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

انور: سگرٹ سے توشوق فرماتے ہوں گے آپ؟

شہاب: جی ہاں! (انور اٹھ کر سگرٹ پیش کرتا ہے)

انور: آج ہی بھائی جان کو کسی ضروری کام سے لاہور جانا پڑا۔ وہ ہی ایک بزرگ ہیں مردوں میں ہمارے ہاں۔ پہلے تو خیال آیا آپ کو کسی اور دن کے لئے کہلوا دوں۔ پھر سوچا ہماری آپ کی ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔

شہاب: آج اچانک ہماری امّی کی طبیعت بھی خراب ہوگئی، اس لئے وہ نہ آسکیں۔

زرینہ: ہماری کار ڈاکٹر کو لینے گئی ہوئی تھی۔ اسی کے انتظار میں اتنی دیر ہوئی۔ آخر جب نہ آئی تو مجبوراً ٹیکسی سے آنا پڑا۔ آپ نے بھی کیا سوچا ہوگا ہمارے بارے میں!

انور: (بیٹھ کر) کوئی بات نہیں۔ دس پندرہ منٹ تو اِدھر اُدھر ہو ہی جاتے ہیں۔ بھائی جان کار نہ لے گئے ہوتے تو میں ملازم کے ساتھ اپنی کار بھیجتا آپ کو لینے کے لئے۔

شہاب: نہیں صاحب۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔

(وقفہ۔ جیسے کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ سب بے چین سے ہیں۔ قالین دیکھ کر) آپ کا قالین بہت عمدہ ہے۔ کتنے کا ہوگا؟

انور: (بے خیالی میں) معلوم نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں خاں صاحب سے۔

شہاب: خاں صاحب!

اماں: (بات بنا کر) اس بے چارے کو کیا پتہ؟ اس کے والد لائے تھے۔ مرحوم کو ایسی چیزوں کا بہت شوق تھا۔

شہاب : ہمارا قالین بھی ہوگا تو کوئی اتنا ہی بڑا، کیوں زرینہ؟

زرینہ : (قالین کی طرف دیکھ کر) اس سے ذرا بڑا ہوگا۔ ویسے بھی اس سے زیادہ ہے۔

شہاب : (بے پروائی سے) ڈیزائن بھی اس سے کچھ بہتر ہے۔

(بیرا چائے کی ٹرالی لئے آتا ہے اور اماں کے سامنے رکھ دیتا ہے)

ارے صاحب، یہ آپ نے کیا تکلف کیا۔ میں تو شام کو صرف ایک پیالی چائے پیا کرتا ہوں۔

انور : (اٹھتا ہے) آج ہماری خاطر کچھ کھا بھی لیجئے۔ (پلیٹیں دیتا ہے۔ پھر سب کو کیک اور مختلف چیزیں دیتا ہے)

شہاب : (کھاتے ہوئے) وہ اس طرف میز پر کیا رکھا ہے۔ (ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کرتا ہے)

انور : وہ ..... وہ (نام بھول رہا ہے) کئی ایک چیزیں رکھی ہیں۔ ادھر ریڈیو اور گرام اور وہ کیا کہتے ہیں ٹیپ اور ریکارڈر .....
میرا مطلب ہے ٹیپ ریکارڈر ——

شہاب : (بے پروائی سے) اچھا اچھا —— اس طرف سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ خوب چیز ہے۔ ہمارا اس سے ذرا مختلف ہے۔

زرینہ : اس سے تھوڑا سا بڑا بھی ہے۔

انور : چیز واقعی عمدہ ہے چاہے گانے ریکارڈ کر لو، چاہے لوگوں کی باتیں۔ ایک مرتبہ سہیل نے مجھے سنایا تھا۔

شہاب : (دل وجان سے مختلف چیزیں کھاتے ہوئے) سہیل کون؟

انور : (بے خیالی میں) جن کا یہ ٹیپ ریکارڈر ہے۔

شہاب : یہ آپ کا نہیں ہے؟

اماں : (جلدی سے) ابھی خریدا کہاں ہے۔ ایک دوست کا ہے، وہ یہاں چھوڑ گیا ہے۔ یہ خریدنے کی ضد کر رہا ہے۔ میں کہتی ہوں اچھی
چیز ہے تو لے لو۔

انور : اچھی چیز —— لاجواب چیز ہے صاحب۔ میں تو روز رات کو اسی سے دل بہلایا کرتا ہوں۔

(اماں زرینہ کو چائے دیتی ہیں۔ ہاتھ کپکپاتا ہے۔ چائے زرینہ کے کپڑوں پر گرتی ہے۔ شہاب گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

اماں : معاف کرنا بیٹی۔ بڑھاپے میں یہ حال ہو گیا ہے۔

زرینہ : کوئی بات نہیں۔

شہاب : (بات ٹالنے کے لئے) سموسے خوب گرم ہیں۔ ہاں، ذرا یہ سنوائیے اپنا ٹیپ ریکارڈر۔

انور : (جیسے شہاب کی بات سنی ہی نہیں) اماں شنو نہیں آئی۔

اماں : ابھی تک تو نہیں آئی۔ (زرینہ کی طرف دیکھ کر) شرماتی ہے نا۔

زرینہ : چلیے میں ہی اندر چلی چلتی ہوں۔

(شہاب غصے سے اسے دیکھتا ہے اور آنکھوں آنکھوں میں اسے گھورنے لگتا ہے)

اماں : چلو بیٹی —— (دونوں اندر چلی جاتی ہیں)

شہاب : (مایوسی سے) میں نے کہا ذرا یہ ٹیپ ریکارڈر سنوایئے انور صاحب۔

انور : (بادلِ نخواستہ اٹھ کر آہستہ آہستہ ٹیپ ریکارڈ تک جاتا ہے) اچھا کوشش کرتا ہوں۔

شہاب : آپ بھی کسرِ نفسی کی حد کرتے ہیں۔ روز رات کو سنتے ہیں اور اس وقت کہہ رہے ہیں کوشش کرتا ہوں۔

انور : (سنبھل کر میرا مطلب ہے کسی ایسی چیز کو بجانے کی کوشش کرتا ہوں جو آپ کو پسند آجائے۔

شہاب : مجھے تو وہ ریکارڈ بہت پسند ہے۔ بھنک رہی ہیں مکھیاں۔۔۔

انور : میں نے یہ ریکارڈ کبھی نہیں سنا۔

شہاب : کچھ یوں طرز ہے اس کی (طرز دہرانے کی کوشش کرتا ہے) بھنک رہی ہیں م م م مکھیاں

انور : (ہنستا ہے) آپ کا مطلب ہے چھلک رہی ہیں مستیاں۔

شہاب : وہی ہوگا۔ مجھے اشعار اور گانوں کے بول کبھی یاد نہیں رہتے۔

(انور ٹیپ ریکارڈر کے مختلف کنٹرولز کو ادھر ادھر کرتا ہے SPOOES گھومنے لگتے ہیں)

یہ چکر سے گھوم تو رہے ہیں مگر آواز نہیں آرہی۔

انور : نہ جانے کیا خرابی ہوگئی ہے کم بخت میں۔ روز اچھا خاصا بجتا تھا۔

(اندر سے چینی کے برتن کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے)

(گھبرا کر) اوہ، جانے کیا توڑ دیا۔ معاف کیجئے میں ابھی حاضر ہوا۔ (بے تحاشا اندر کی طرف بھاگتا ہے)

شہاب : (کھڑے ہوکر) ہو آیئے ...... برفی نہایت لذیذ ہے۔ (جلدی جلدی کھاتا ہے)

(زرینہ آتی ہے اور صوفے پر بیٹھ کر کھانا شروع کرتی ہے)

زرینہ : (جلدی جلدی، بھائی جان! لڑکی غضب کی ہے اور گھر کی ایک ایک چیز۔ ہائے ہائے کچھ نہ پوچھئے۔ اچھا ایک وعدہ کیجئے جلدی سے۔

شہاب : (کھاتے ہوئے) کیسا وعدہ؟

زرینہ : آپ کی شادی یہاں ہوگئی تو بھابی کے کمرے میں رکھے ہوئے تمام DECORATION PIECES مجھے دے دیجئے گا۔

شہاب : ارے پگلی ہوئی ہو۔ ان پر میرا کیا حق ہوگا۔

زرینہ : (بگڑ کر) ہو یا نہ ہو۔ آخر ہم بھی تو آپ کی شادی کی خاطر اتنی جھک مار رہے ہیں کیا۔ آپ اتنا نہیں کر سکتے کہ کسی ترکیب سے وہ حاصل کرلیں۔

شہاب : مگر زرینہ........

زرینہ : اگر مگر کچھ نہیں۔ اگر آپ وعدہ نہیں کرتے تو میں ابھی جا کر کہتی ہوں صاحبزادے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے یوکے وکے کہیں نہیں جا رہے بلکہ کلرک ہیں اور اپنے کسی دوست کا سوٹ پہن کر آئے ہیں۔ اس سوٹ کے لانے میں دیر ہوگئی تھی۔ اسی لئے ہمیں یہاں آنے میں دیر ہوگئی۔

شہاب : آہستہ بولو، کوئی سن لے گا۔

زرینہ : (اسی آواز سے) اور میں یہ بھی کہہ دوں گی کہ امی بالکل ٹھیک تھیں۔ وہ اس وجہ سے نہیں آئیں کہ ان کے پاس ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا

نہیں تھا۔ اور ہماری کار خدا کے فضل سے ابھی بنی ہی نہیں۔۔۔۔

شہاب: (بات کاٹ کر) وعدہ کرتا ہوں بابا۔ میں کسی نہ کسی طرح وہ چیزیں تجھے دلوا دوں گا۔ بس!

زرینہ: شکریہ! ہائے نہ پوچھئے کتنی خوبصورت چیزیں ہیں اور ایک گڑیا تو ایسی پیاری ہے۔ بالکل جیسے ہماری بھابی۔۔۔

(انور آتا ہے)

انور: معاف کیجئے اتنی دیر غائب رہا۔

زرینہ: (گھبرا کر) میں تو بھائی جان سے کہہ رہی تھی۔ ہماری بھابی ایسی پیاری ہیں جیسے گڑیا۔

انور: (ٹیپ ریکارڈر کو دیکھ کر) یہ کم بخت ابھی تک گھوم رہا ہے۔ اسے بند کئے دیتا ہوں۔

(کنڑولز کو ادھر ادھر کرتا ہے)

شہاب: ارے۔۔۔ رے وہ ٹیپ الجھ کر ٹوٹ گیا۔

انور: (بگڑ کر) خاک ڈالئے بہت واہیات چیز معلوم ہوتی ہے۔۔۔۔ ہاں تو زرینہ صاحبہ! آپ کو ہماری بہن پسند آئیں؟

زرینہ: بے حد پسند آئیں۔ میں نے آپ کی امی سے کہہ دیا ہے کہ اب بات پکی کر لیجئے۔

انور: (خوش ہو کر) کر لیجئے کیا معنی۔ بات پکی سمجھئے۔

زرینہ: ہمیں شادی کی جلدی ہے۔ کیونکہ بھائی جان یوکے جانے والے ہیں۔

شہاب: (کھنکار کر) جی ہاں!

انور: ہماری تیاری تو قریب قریب مکمل ہے۔ جس دن سے شنو پیدا ہوئی۔ امی جب بازار گئیں اس کے لئے دو ایک جوڑے یا ایک آدھ زیور خرید کر لے آئیں۔

شہاب: یہی حال ہوتا ہے بڑی بوڑھیوں کا۔ ہماری امی نو دیں کرتی ہیں۔ لاکھ منع کرتا ہوں کہ وقت آنے دیجئے۔ ابھی تو کہیں زرینہ کی بات بھی طے نہیں ہوئی۔ مگر وہ کہاں سنتی ہیں۔

زرینہ: بھائی جان اب چلئے بہت دیر ہو گئی (انور سے) ذرا ٹیکسی منگوا دیجئے۔

انور: میں پہلے ہی فون کر چکا ہوں ٹیکسی کے لئے۔

شہاب: آپ کے ہاں جو یہ سجاوٹ کی چیزیں نظر آ رہی ہیں کس کے حسنِ ذوق کا ثبوت ہیں۔

انور: پسند آئیں آپ کو؟

شہاب: بہت ــــ مجھے خود ان چیزوں کا بہت شوق ہے۔ اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں یہ کس کی پسند ہے۔

انور: ہماری بہن شمیم کی جسے ہم پیار میں شنو کہتے ہیں۔ اس کو تو ایسی چیزیں جمع کرنے کا جنون ہے۔

زرینہ: اتفاق سے آپ دونوں کی طبیعتیں بھی خوب مل ہیں بھائی جان۔۔۔۔ اگر آپ اندر رکھی ہوئی ایک گڑیا دیکھ لیں تو پھر نظر نہ اٹھا سکیں اس پر سے۔

انور: کون سی؟ جو چھتری لئے کھڑی ہے؟

زرینہ : جی ہاں، وہی ــــ

(بیرا آتا ہے، انور کے پاس جاتا ہے۔)

بیرا : آپ کے ہاں لاہور سے کوئی مہمان آئے ہیں۔

انور : (گھبرا کر) ہمارے ہاں ، اچھا، تمہارا مطلب ہے چچا جان کے ہاں۔ (شہاب سے) ان کا مکان یہاں سے نزدیک ہی ہے (بیرے سے)

ان سے کہنا ہمارے ہاں مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابھی جانے والے ہیں۔ ان کے جاتے ہی ہم آتے ہیں۔

بیرا : انہوں نے کہا ہے فوراً آئیے۔ مکان میں تالا لگا ہوا ہے۔

انور : (پریشان ہو کر) تالا لگا ہوا ہے۔ اوہو۔

شہاب : آپ انہیں اپنے ہی گھر میں بلوا بھیجئے۔

انور : اپنے گھر! نہیں نہیں۔ نا معلوم کون ہیں۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالتا ہے) اصل میں چچا جان نے اپنے گھر کی ایک کنجی مجھے دے رکھی ہے۔

(کنجی بیرے کو دیتا ہے) تم چلو میں آتا ہوں۔

شہاب : آپ ہو آئیے، ممکن ہے انہیں کوئی ضروری کام ہو۔ ہم بھی بس جا ہی رہے ہیں۔

انور : دیکھئے کیسے بے وقت مہمان آتے ہیں۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی ضرور ہوں گی۔ اماں کو بھی جانا پڑے گا۔ ورنہ وہ ہی کچھ دیر آپکے پاس بیٹھتیں۔

شہاب : کوئی بات نہیں۔ تاریخ بذریعہ خط وکتابت طے ہو جائے گی۔

انور : اچھا۔ اجازت، خدا حافظ!

شہاب اور زرینہ : خدا حافظ!

(انور اندر جاتا ہے۔ شہاب اور زرینہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہیں کہ یا

موٹی مرغی پھنسی۔ انور ایک گڑیا لئے واپس آتا ہے۔ زرینہ کے پاس جا کر ــــ)

انور : یہ گڑیا آپ کو پسند آئی۔ اسے ہماری طرف سے تحفہ سمجھئے۔

زرینہ : جی نہیں۔ یہ تکلف نہ کیجئے۔

انور : دیکھئے یہ تو آپ کو لینی ہی ہوگی۔ اماں نے بھی بہت اصرار سے کہلوایا ہے۔

شہاب : لے لو زرینہ، کسی کا دل نہیں توڑا کرتے۔

زرینہ : (گڑیا لے کر) شکریہ!

انور : یہی نوکر جو آپ کو لایا تھا، چھوڑ آئے گا۔ خدا حافظ!

(چلا جاتا ہے۔ گل زمان پٹھان نوکر اپنے مخصوص لباس شلوار قمیص، جیکٹ اور کلاہ دار ٹوپی میں آ کر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے)

شہاب : بھئی تم انور صاحب کے پاس کب سے ملازم ہو؟

(گل زمان منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے۔)

(زور سے) میں نے کہا تم ان لوگوں کے ملازم ہو نا؟ (اب گل زمان منہ دیوار کی طرف پھیر لیتا ہے)

زرینہ: بولتا ہی نہیں۔ نہ جانے کس سوچ میں گم ہے!

شہاب: ارے بھائی کیا نام ہے تمہارا۔ کچھ تو بولو کہ خفا ہو ہم سے۔

گل زمان: (بے حد ناراضگی سے) امارا نام اے گل زمان خان۔ یارا ام گونگا اے نا تو کیا بولے گا۔ اتنی بات تم نئیں سمجھتا اے۔

شہاب: (تعجب سے) کیا تم گونگے ہو؟

گل زمان: تو اور کیا اے --- اتنی دیری سے ام نئیں بولتا۔ تم نئیں سمجھتا کیا وجے اے۔ ام کوئی پاگل اے۔

شہاب: غلطی ہوئی بھئی۔ پاگل تو ہم ہیں کہ اتنی ذرا سی بات نہیں سمجھے۔ خیال ہوا شاید تم نے سنا نہیں۔

گل زمان: (راضی ہوتے ہوئے) جو ایک بار نئیں سنے گا دو بار نئیں سنے گا۔ سب دس بار نئیں سنے گا تو صفا بات اے کہ گونگا اے۔

شہاب: بالکل ٹھیک!

زرینہ: مگر آخر گونگا بننے کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟

گل زمان: بس ام اس کی بابت کچھ نئیں بول سکتا۔ ام تو مانی دا۔

زرینہ: بھائی جان! میرا خیال ہے یہ ان کا ملازم والازم نہیں۔ کوئی راہ چلتا انہوں نے پکڑ لیا ہے۔

گل زمان: خو، تم کیا بات بولتا اے۔ ام ان کا ملازم نئیں اے ہم تم سے اس اللہ تعالیٰ ام ان کا بیس سال سے ملازم اے۔ ام نمک حرام نئیں اے۔ چھ ماہ سے ام کو تنخواہ بھی نئیں دیتا اے۔ کام پھر بھی ویسا ہی کرتا ہے۔ وجے اے کہ رزق دینے والا خدا ہے نہ کہ انسان اے۔ خدا ان کا دل پھیرے گا تو ام کو مالا مال کرے گا۔

شہاب: دیکھنا بھئی گل زمان یہ دروازہ تو بند ہے؟

گل زمان: (جا کر دیکھتا ہے) بالکل بند اے ---

ظاہر اٹھاٹھ باٹھ تو خوب ہیں اور نوکروں کو تنخواہ دینے میں یہ کنجوسی۔ شاید اسی لئے تمہیں گونگا بنا دیا کہ یہ بات ہم سے نہ کہہ دو۔

گل زمان: یارا بیگم صاب اے بات نئیں اے۔ ان کو خوب معلوم اے کہ ام نمک حرام نئیں اے۔ تنخواہ منخواہ کی بات ام کسی کو نئیں کہے گا۔ ام کو گونگا اس وجے سے بنایا تھا کہ ام کوئی موٹی کی بات نہ بول دے۔ تو یارا ام کوئی پاگل اے!

شہاب: (خوشامدانہ لہجہ میں) نہیں خاں صاحب۔ بھلا گھر کے پرانے ملازم کہیں گھر کی باتیں بتاتے ہیں۔ یہ تو آج کل کے چھوکروں اٹھائی گیروں کی باتیں ہیں کہ جس گھر میں کام کریں گے۔ اسی کی برائی کریں گے۔

گل زمان: (خوش ہو کر) الحمدللہ! اے بات تم بولا کہ امارا جی خوش کر دیا۔ ام انشاء اللہ تعالیٰ وہ آدمی اے کہ امارے گلے پہ چھری رکھے گا تو ام بولے گا۔ اے کوٹھی ان لوگ کا ہے خاں صاحب کا نئیں اے اور اے نوکر موکر اور ریڈیو میڈیو اور یارا کہ ہر اک چیز انور صاحب یا کہ اختر صاب کا اے اور خاں صاب کا کچھ نئیں اے۔

شہاب: اچھا یہ تو بتاؤ، یہ خاں صاحب کون ہیں؟

گل زمان: خاں صاب کون اے؟ ام لوگ کا پڑوسی اے اور کون اے!

شہاب: آج کل کہیں گئے ہوئے ہیں؟

گل زمان: ہاں، پنڈی گیا اے۔ بچہ بچہ، بیگم بیگم سب گیا اے۔

شہاب: اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں؟

گل زمان: یارا اے مت پوچھ۔ بوت (بہت) رئیس لوگ اے۔ ایک کوٹھی پنڈی میں اے۔ ایک ایبٹ آباد میں۔ ایک کوٹھی پشاور اور ایک کوٹھی (سر کھجا کر سوچتا ہے جلدی سے) یارا یہ اے نا جس میں تم بیٹھا (بیٹھا) اے۔ ہوٹل موٹل بھی ہے۔ ام کو بولتا تھا گل زمان یارا ہوٹل میں کام کرے گا۔ ام بولا ضرور کرے گا۔ مگر جب یہ لوگ امارا حساب کر دے گا۔ چھ ماہ کا پیسہ لے کی گتی تو نہیں ہے مر

شہاب: یہ لوگ تمہارا حساب کیوں نہیں کر دیتے؟

گل زمان: (جھنجھلا کر) پیسہ اسے نہیں تو کدھر سے کرے گا۔ چار ماہ۔ مسٹر مکان کا کرایہ نہیں دے گا تو ام کو کدھر سے دے گا۔ ام تو سخت عاجز آیا ہے۔ نہ ادھر ٹھہر سکتا ہے نہ جا سکتا ہے۔ اور ادھر سے ام کو بولتا ہے یارا تم گونگا بن جاؤ۔ پیچھے اوسے گونگا بن گیا۔ تنخواہ کے واسطے ایک بات نہیں بولا۔ یارا اور ام کو کتنا گونگا بنائے گا۔ کوئی ڈیپارٹمنٹ PERMANENT لونگا بنائے گا۔

(زرینہ اور شہاب ہنستے ہیں)

شہاب: (الٹا کر) تم تو بڑے مزے کے آدمی نکلے۔ ورنہ ہم تو سمجھ رہے تھے۔ (ایک روپیہ کا نوٹ نکال کر) یہ رکھو کام آئے گا۔

گل زمان: (منہ موڑ کر) یارا اے پیسے ویسے کا ام کیا کرے گا۔ (پیچھے سے ہاتھ بڑھا دیتا ہے)

شہاب: (ہاتھ میں دے کر) بھئی ہم سے تکلف کیسا۔

گل زمان: مہربانی۔ آج دس روز سے یارا نسوار بھی ادھار کھاتا تھا۔ خدا تم کو اجر دے گا۔

شہاب: اچھا بھئی تم ذرا باہر ٹھہرو۔ دیکھو ٹیکسی ابھی تک کیوں نہیں آئی۔

گل زمان: بوت اچھا —— (چلا جاتا ہے)

زرینہ: یہ لوگ تو ہم سے بھی تیز نکلے، نہ جانے کس کی کوٹھی اپنی کہہ کر دکھلا دی۔

شہاب: مجھے تو پہلے ہی شک ہوا تھا جب وہ صاحبزادے اس گھر میں یوں ٹہل پھر رہے تھے جیسے زور سے پاؤں رکھ دیا تو زمین چیخ جائے گی۔

زرینہ: ان کی اماں کمرے میں یوں گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھیں جیسے چوہے والی میں پھنسی ہوئی چوہیا ... سے کپڑوں پر چائے گرا دی۔ (اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتی ہے) اب مجھے ڈرائی کلین کرا ... پڑیں گے۔

شہاب: (اشارہ کر کے) اور یہ دھبہ کیسا ہے۔ یہ تو چائے کا معلوم نہیں ہوتا۔

زرینہ: (ہنس کر) یہ تو خیر گلاب جامن کا شیرہ گر گیا تھا۔

شہاب: اور تو خیر جو ہوا سو ہوا۔ چیزیں سب مزے دار تھیں۔ (ایک برفی کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا ہے)

زرینہ: واقعی چیزیں تو مزیدار تھیں۔ لڑکی بھی اچھی تھی، مگر چوٹ کر گئے کم بخت!

شہاب: (ہنس کر) جب اندر سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تو صاحبزادے ایسے بھاگے جیسے بم گر گیا ہو۔

زرینہ: اندر بہت دیر تک توجداری بھی تو ہوتی رہی۔ میرا خیال ہے میں نے کسی کی سسکیوں کی آواز بھی سنی تھی۔

شہاب: وہی ہوں گی تمہاری گڑیا جیسی بھابی جان۔

زرینہ: ان کا بھانڈا تو پھوٹ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری شرم رہ گئی۔

شہاب: واہ! شعر عرض کیا ہے ۔ ہم قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا وہ آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

(دونوں ہنستے ہیں۔ گل زمان آتا ہے)

گل زمان: ٹیکسی آگیا جناب!

شہاب: چلو بھئی زرینہ۔ (دونوں چلتے ہیں۔ گھر کی چیزوں پر حسرت سے نظر ڈالتے ہیں۔ زرینہ باہر نکل جاتی ہے) کیوں بھئی گل زمان ان خان صاحب کے کوئی جوان لڑکی وڑکی بھی ہے۔

گل زمان: (مسکرا کر) لڑکی مڑکی تو کوئی نہیں اے۔ بس تین لڑکا اے۔

(شہاب اور گل زمان جاتے ہیں۔ ساتھ ہی پردہ)

تیسرا منظر

(پردہ اٹھتا ہے تو خاں صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ بھاری بھرکم رعب دار آدمی ہیں۔ ایک خاص طنزیہ لہجے میں بات کرنے کی عادت ہے۔ انور دروازے میں آکر۔)

انور: آ سکتا ہوں جناب؟

خاں صاحب: کیوں نہیں۔ میں نے آپ کو بلوایا ہے تو ظاہر ہے اندر آنے ہی دوں گا۔ تشریف لائیے۔

انور: (اندر آکر) کیسے یاد فرمایا؟

خاں صاحب: (اٹھ کر) اگر آپ ہوا کے گھوڑے پر سوار نہ ہوں تو ذرا تشریف رکھئے۔ ابھی عرض کرتا ہوں۔ (انور بیٹھتا ہے) غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ چند دن پیشتر آپ نے مجھ سے میرا مکان ادھار مانگا تھا۔

انور: جی، وہ میں نے .....

خاں صاحب: تصیح کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ بات پوری سُن لیجئے۔ جی ہاں تو آدھ گھنٹے کے لئے آپ نے ایک خاص غرض سے میرا مکان ادھار مانگا تھا۔ اب ذرا مجھے یہ بتائیے کہ اس دن آپ کی کوشش کہاں تک کامیاب رہی۔

انور: (خوش ہو کر) انہوں نے شفو کو بہت پسند کیا۔ بات قریب قریب طے ہوگئی ہے۔ صرف تاریخ مقرر ہونے کی دیر ہے۔ امی نے ان کی بہن کو بھی بہت پسند کیا ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ (شرما کر) ان کے لئے یعنی میرے لئے کوشش کی جائے۔

خاں صاحب: (طنز سے) ماشا اللہ! یعنی آپ کی خانہ بربادی کے سامان بھی ہو رہے ہیں۔ اچھا اب میں آپ سے ایک اور بات کہنے کی گستاخی کروں گا۔ واپس آکر میں نے محسوس کیا کہ آپ نے یا آپ کے معزز مہمانوں میں سے کسی نے میرے گھر کی کئی چیزوں سے شوق فرمایا۔ جن میں سے ایک یہ بے زبان ٹیپ ریکارڈر ہے جس کا ٹیپ کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا پایا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اسے چھیڑا کس نے؟

انور: (نظریں جھکا کر) میں شرمندہ ہوں۔ یہ غلطی مجھ سے ہوئی۔

خاں صاحب: اچھا۔ تو یہ غلطی آپ ہی سے سرزد ہوئی گو آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔

انور: مجھے افسوس ہے کچھ ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی . . . .

خاں صاحب: وہ میں سمجھتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی مجبوری ہی ہوگی ورنہ آدمی آپ سمجھدار ہیں۔

انور: جی ہاں بس یہی سمجھئے کچھ ایسی مجبوری . . . . . .

خاں صاحب: خیر چھوڑیئے اس ذکر کو، یہ لیجئے بل۔ (بل بڑھاتے ہیں۔)

انور: (کھڑا ہو جاتا ہے) بل، کیسا بل؟

خاں صاحب: پڑھ کر سنا دوں، ایک عدد چائے دان ٹوٹا جو نہایت قیمتی سیٹ کا تھا۔ رعایتاً صرف بیس روپے لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ پورا سیٹ تباہ ہو گیا۔ ایک عدد کوارٹر پلیٹ جس میں بال پایا گیا۔ صرف تین روپیہ۔ ڈرائی کلینگ میز پوش و تالین جن پر متعدد داغ پائے گئے۔ بیس روپے۔ ایک عدد آرائشی گڑیا جو غائب تھی۔ قیمت پچیس روپے۔ امید ہے آپ نیا خرید کر لا دیں گے جس پر یہ ٹیپ آپ کو دے دیا جائے گا۔ بازار میں اس کی قیمت اندازاً ساٹھ روپے ہوگی۔

انور: (پریشان ہو کر) مگر قبلہ سنئے تو . . . .

خاں صاحب: آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ چائے کے دام جو اس دن خرچ ہوئی بالکل نہیں لگائے گئے۔ ملازموں کی سروس کا بھی آپ سے کچھ نہیں لیا گیا۔ ویسے وہ بجا طور پر اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آپ ان کی خدمت کے صلے میں کچھ بخشیش دیں گے۔

(گل زمان آتا ہے اور انور سے مخاطب ہوتا ہے)

گل زمان: انور صاب۔ آپ کا امی بلاتا ہے کہ ان صاب کے گھر سے جو شنوبی بی کو دیکھنے آیا تھا جواب (جواب) آیا ہے۔

انور: اچھا ——— میں پھر حاضر ہوں گا خاں صاحب۔ (جانے لگتا ہے)

خاں صاحب: ٹھہریئے۔ ایک ضروری بات تو رہ ہی جاتی ہے۔ ممکن ہے جس وقت آپ انہیں جواب دیں یہ بات مدِنظر رکھنی پڑے۔

انور: جی وہ کیا بات ہے؟

خاں صاحب: صبر کیجئے ابھی بتاتا ہوں ——— (انور بیٹھ جاتا ہے۔ خاں صاحب اٹھ کر ٹیپ ریکارڈر تک جاتے ہیں اور اسے آن کر دیتے ہیں۔ اس میں سے آوازیں آنی شروع ہوتی ہیں):

شہاب: یہ چکر سے گھوم تو رہے ہیں لیکن آواز نہیں آ رہی۔

انور: نہ جانے کیا خرابی ہو گئی کم بخت میں۔ روز اچھا خاصا بجتا تھا۔

(انور ٹیپ ریکارڈر کی آواز سن کر پریشان ہے۔ دور کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز)

انور: اوہ! جانے کیا توڑ دیا۔ معاف کیجئے میں ابھی حاضر ہوا۔

شہاب: ہوا کیجئے۔ برفی نہایت لذیذ ہے۔

زرینہ: بھائی جان لڑکی غضب کی ہے اور گھر کی ایک ایک چیز، ہائے ہائے کچھ نہ پوچھئے۔ اچھا ایک وعدہ کیجئے جلدی سے۔

شہاب: کیسا وعدہ؟

زرینہ : آپ کی شادی یہاں ہوگئی تو بھابی کے کمرے میں رکھے ہوئے تمام DECORATION PIECES مجھے دے دیجئے گا۔

شہاب : ارے پگلی ہوئی ہو۔ ان پر میرا کیا حق ہوگا۔

زرینہ : ہویا نہ ہو۔ آخر ہم بھی تو آپ کی شادی کی خاطر اتنی جھک مار رہے ہیں۔ کیا آپ اتنا نہیں کر سکتے کہ کسی ترکیب سے وہ حاصل کرلیں۔

شہاب : مگر زرینہ ......

زرینہ : اگر مگر کچھ نہیں۔ اگر آپ وعدہ نہیں کرتے تو میں ابھی جاکر کہتی ہوں صاحبزادے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے یورپ وورپ کہیں نہیں جا رہے بلکہ کلرک ہیں اور اپنے کسی دوست کا سوٹ پہن کر یہاں آئے ہیں۔ اسی سوٹ کے کھل جانے میں دیر ہوگئی تھی اسی لئے ہمیں یہاں آنے میں دیر ہوگئی۔

شہاب : آہستہ بولو کوئی سُن لے گا ——

زرینہ : اور یہ بھی کہہ دوں گی کہ امی بالکل ٹھیک تھیں، وہ اس لئے نہیں آئیں کہ ان کے پاس ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں تھا اور ہماری کار خدا کے فضل سے تھی ہی نہیں ہے۔

(خاں صاحب ٹیپ ریکارڈر بند کر دیتے ہیں۔ انور شرم و ندامت میں غرق بیٹھا ہے)

خاں صاحب : ان آوازوں کو پہچانتے ہیں آپ ؟

انور : (گھبرا کر) جی ... یہ ... وہ

خاں صاحب : گھبرائیے نہیں۔ یہ یقیناً آپ کے معزز مہمانوں کی آوازیں ہیں جنہوں نے جو کچھ کہا اس گونگے باجے نے اسے جوں کا توں ریکارڈ کرلیا۔ لیکن اس بے چارے کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ سہیل نے اس میں مائیکروفون لگا دیا وہ اس کی غلطی۔ آپ نے اسے آن کر دیا جو آپ کی غلطی۔ ان چیزوں کی یہ نہایت اچھی عادت ہے کہ جب تک کوئی مجبور نہ کرے نہ بولتی ہیں نہ سنتی ہیں برعکس ہم انسانوں کے جو ...

انور : معاف کیجئے میں پھر کسی وقت آکر آپ سے بات کروں گا۔

خاں صاحب : اس کی ضرورت نہیں، آپ یہ بل لیتے جائیے۔ روپیہ ملازم کے ہاتھ بھجوا دیجئے (رکتے ہیں) یہ یاد رکھئے کہ بار بار یاد دہانی کروانا مجھے پسند نہیں۔

(انور بے بسی سے بل ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ خاں صاحب اٹھ کر اندر جانے لگتے ہیں۔ پھر انور اور گل زمان کی باتیں سننے ٹھہر جاتے ہیں)

انور : گل زمان کچھ معلوم ہے ان لوگوں نے جواب میں کیا لکھا ہے ؟

گل زمان : (گھبرا کر) ام کو کیا مالوم۔ ام تو گونگا تھا۔ ایک بات ان لوگ کے ساتھ نئیں بولا۔ ام کوئی نمک ارام تھوڑا اے کہ مالک کا کام خراب کرے۔ او پتہ نئیں دل سے جوڑ کے کیا غلط ملط لکھا اے۔ ام آپ کو بولتا اے او ٹھیک لوگ نئیں اے۔ ایک چھوٹا سا گلی ملی میں رہتا اے اور بولتا اے ام فلانا اے، فلانا ملانا کوئی نئیں اے۔ بالکل معمولی لوگ اے۔ ام آپ کو ٹھیک بولتا کہ آپ کا پرانا نمک کھایا اے۔ ام انشاءاللہ تعالیٰ وہ آدمی اے کہ اما سے گلے پہ چھری رکھے گا تو ام بولے گا کہ یارا اے سب چیز انور صاحب یا کہ اختر صاحب کا ہے اور خاں صاحب کا کوئی چیز نئیں اے۔

خاں صاحب : (غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے) کیا کہا ؟

گل زمان : (ایک دم ہاتھ جوڑ کر) خاں صاحب ام کو غصہ مت دکھاؤ۔ یارا ام ایک دم مجبور ہو گیا۔ اگر ایک بات بولتا اے تو ادھر سے پھنستا اے دوسری بات بولتا اے تو اُدھر سے پھنستا اے۔ ام کو اللہ تعالیٰ گونگا بنائے گا تو ام بوت خوش اے۔ ام بولے گا ام گونگا اے۔ ام بالکل نئیں جانتا اے کوٹھی موٹھی کس کا اے۔ نوکر کس کا نئیں اے۔ ام تو بالکل بے زبان اے۔

(پردہ)

نیا ادارہ

آردو کے پہلے عظیم ناول کا اعلان کرتا ھے

اداس نسلیں

عبداللہ حسین

اس ناول کے بارے میں بلاتامل یہ کہا جا سکتا ھے کہ یہ ھر اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کا رتبہ رکھے گا۔

عبداللہ حسین ناول نویسی کے میدان میں نوارد سہی لیکن ان کے کرداروں میں جو زندگی اور گہرائی ھے اور زبان و بیان میں جو تازگی اور معنویت ھے وہ بہت سے پرانے لکھنے والوں کو برسوں کی ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ھوتی۔

بیسویں صدی کی دوسری دھائی ھے تقسیم ھند تک کی جلتی اور دھکتی ھوئی داستان ۔ جس کے کردار اور واقعات آپ کے ذھن پر ثبت ھو جائیں گے۔

زیرِ اشاعت